# مولانا ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی شمسی

## نقوش وتاثرات

محمد صدر عالم ندوی

# مولانا ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی شمسی

## نقوش و تاثرات

محمد صدر عالم ندوی

مرکزی پبلیکیشنز

ISBN : 97881944537519

| | | |
|---|---|---|
| نام کتاب | : | مولانا ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی شمسی نقوش وتاثرات |
| مرتب | : | محمد صدر عالم ندوی |
| سن اشاعت | : | مارچ ۲۰۲۰ء |
| صفحات | : | ۲۷۲ |
| تعداد اشاعت | : | ۵۰۰ |
| قیمت | : | ۳۰۰ |
| ناشر | : | مرکزی پبلی کیشنز نئی دہلی |



| | | |
|---|---|---|
| Book Name | : | Maulana Dr. Abul Kalam Qasmi Shamsi<br>Nuqoosh -o- Taassurat |
| By | : | Md Sadr-e- Alam Nadvi<br>(M) 9661819412 |
| Pages | : | 272 |
| Price | : | 300 |
| First Edition | : | March 2020 |
| First Print | : | 500 Copies |
| Published by | : | Markazi Publications<br>R-373/3, Jogabai Ext. Jamia Nagar, New Delhi-25<br>9811794822 / 9811794821<br>E-mail : markazipublication@gmail.com |

ملنے کے پتے

- بک امپوریم اردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ 4
- اصلاحی لائبریری، اماموری، پاتے پور، ویشالی

# مشمولات



## حیات وتاثرات

## خدمات و تاثرات



## چند مضامین

## پریس ریلیز

# پیش لفظ

میں ہمیشہ ان لوگوں کو الفت ومحبت اور قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں جو اپنی محنت اور لگن کے ذریعہ شہرت وعزت کے مقام پر پہنچ کر دوسرے لوگوں کے لئے کچھ کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں اور ہر کسی کی مدد کے لئے تیار رہتے ہیں۔ ان ہی لوگوں میں ایک اہم نام مخدومی ومکرمی مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی کا ہے۔

مولانا کو سب سے پہلے کب اور کہاں دیکھا؟ اچھی طرح یاد نہیں، البتہ اتنا ضرور یاد آتا ہے کہ آج سے آٹھ دس سال پہلے مولانا مظہرالحق عربی وفارسی یونیورسٹی کی میٹنگ میں اس وقت کے وائس چانسلر پروفیسر شرف عالم کی صدارت میں پٹنہ میں ہو رہی مجلس میں ملاقات ہوئی تھی۔ نام تو بہت پہلے ان کی شہرۂ آفاق کتاب ''تذکرہ علمائے بہار'' کے ذریعہ سن چکا تھا، اس میٹنگ کا مقصد تھا یونیورسیٹی کے دائرہ کار کو وسیع کر کے تمام عالم وفاضل کے مدارس کو اس سے الحاق کرنا اور تعلیمی نظام میں اصلاح۔ بات آئی اور چلی گئی اور یہ کام ان کے دور تک نہیں ہو سکا۔ اسی پروگرام میں ایک سیدھے سادے عالم، سر پر مخملی ٹوپی، بدن پر شیروانی، چہرہ پر داڑھی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ والے شخص کو دیکھا۔ پروگرام کے اختتام کے بعد میں نے والد محترم مولانا عبدالقیوم شمسی کو بڑھ کر مصافحہ کرتے ہوئے دیکھا اور اور انہوں نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ میرے فرزند محمد صدر عالم ہیں جو اس وقت ندوۃ العلماء لکھنؤ میں زیر تعلیم ہیں اور عالمیت کا آخری سال ہے۔ حضرت نے دعائیں دیں اور ایک فائل جو میٹنگ میں تقسیم ہوئی تھی اس کو میری طرف بڑھایا، میں نے خندہ پیشانی سے اسے تبرک سمجھ کر قبول کر لیا۔

میں جب اپنے گاؤں اماموری ویشالی یا لکھنؤ سے پٹنہ آتا تو حضرت سے ضرور ملتا اور دعاء لے

کر جاتا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فراغت کے بعد گھر پر رہنے لگا تو حضرت سے رابطہ میں اضافہ ہوا اور اتنا مضبوط رابطہ ہوا کہ وہ اپنے گھر کا ایک فرد محسوس کرنے لگے اور جب بھی ملتا ہوں تو ایک اپنا پن کا احساس ہوتا ہے۔ اور حضرت بھی اپنی شفقت کے ذریعہ ہر طرح کا تعاون و مدد کرتے ہیں۔

مولانا کی پوری زندگی جہد مسلسل سے عبارت ہے۔ ان کی پیدائش سند کے اعتبار سے ۲۵/اکتوبر ۱۹۵۱ء ہے۔ انہوں نے اپنی تعلیم کا آغاز بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے مدارس سے کیا اور مختلف جامعات اور یونیورسیٹیوں سے استفادہ کرتے ہوئے، عربی و فارسی اور اردو زبان و ادب میں بی اے اور ایم اے کی ڈگری حاصل کی۔ مولانا نے صرف ڈگری کی تحصیل پر اکتفا نہیں کیا بلکہ عربی، اردو، انگلش تینوں زبانوں پر گرفت بھی حاصل کی۔ گرفت کا یہ حال ہے کہ جب بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ میں سوالات کی ترتیب کا کام ہوتا ہے تو سب لوگ مولانا کے منتظر ہوتے اور نگاہیں ان کی طرف اٹھتی ہیں۔ سب لوگ یہ سوچتے ہیں کہ مولانا ہم لوگوں کے ترجمان ہیں۔

مولانا نے اپنے درس و تدریس کا آغاز مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ سے کیا، جونیئر سیکشن میں ۱۹۷۶ء سے ۱۹۸۳ء تک کام کیا۔ پھر سینئر شعبہ میں منتقل ہو کر ۱۹۹۶ء تک درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے اور ۱۹۹۷ء سے آج تک دفتر کے اہتمام کو زینت بخشے ہوئے ہیں۔ مولانا نے کم و بیش ۱۸/کتابیں لکھیں، جس میں سات کتابیں عربی زبان و ادب پر مشتمل ہیں جو مدارس اسلامیہ کے نصاب میں شامل ہیں، اس کے علاوہ تاریخ، سیرت اور سفرنامہ پر مشتمل کتابیں ہیں۔ مرکزی حکومت نے مولانا کی تدریسی و تصنیفی خدمات کو سراہتے ہوئے راشٹر پتی ایوارڈ سے سرفراز کیا۔ مولانا کی کتابوں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا گوناگوں خوبیوں کے مالک ہیں اور ہر فن میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ مولانا کے اندر جو میں نے سب سے بڑی خوبی دیکھی، وہ ہے حق گوئی اور بے باکی۔ عملی ذوق اور دوسروں کے تعاون کا جذبہ، کوئی بھی شخص مولانا کے چوکھٹ سے واپس نہیں جاتا ہے۔ کوئی ویزا کے ترجمہ کے لئے کھڑا ہے، کوئی Attest کرانے کے لیے، کوئی BPSC کے تعاون کیلئے، مولانا کسی کو نامراد نہیں کرتے اور حتی الامکان کچھ دے کر ہی واپس کرتے۔

مولانا کا مدارس ملحقہ کے تعلق سے ان کا ایک اپنا نظریہ ہے، وہ یہ نہیں مانتے کہ مدارس میں

تعلیم نہیں ہوتی ہے اور بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے نصاب تعلیم میں نقص ہے۔ مولانا نصاب کے تعلق سے برملا اور اعلانیہ طور پر کہتے ہیں کہ اس نصاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہاں پڑھنے والے طلبا ڈاکٹر، انجینئر، سیاستداں اور آئی اے ایس افسر بنتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ عالم باعمل بھی بنتے ہیں۔ مولانا اس کو ایک ایک نام لے کر سمجھائیں گے۔ مولانا اصول کے بڑے پابند ہیں، بہار مدرسہ بورڈ کی جب بھی میٹنگ ہوئی، مولانا اپنی رائے سے نوازتے اور تمام ممبران وچیئرمین قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور عمل کرنے کی یقین دہانی کراتے۔ کئی مرتبہ ممبران وچیئرمین نے نصاب میں ترمیم کا ارادہ کیا تو مولانا نے زبردست مخالفت کی اور کہا کہ آپ لوگ نصاب میں تبدیلی نہ کریں بلکہ ریاستی ومرکزی حکومت سے اپنی ڈگریوں کو منوائیں اور طلبا کو واجب حق دلوانے کی کوشش کریں۔ مولانا ان باتوں کو گاہے بگاہے زبان وقلم کے ذریعہ حکومت کے سامنے پیش کرنے میں ذرہ برابر بھی کوتاہی اور غفلت سے کام نہیں لیتے۔ مولانا کا یہ بھی نظریہ رہا کہ مدارس ملحقہ کے نصاب میں سائنس کو داخل کیا جائے، چنانچہ مولوی اور عالم وغیرہ درجات میں سائنس کو بہار مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے نصاب میں شامل کرنا ان ہی کے نظریات سے مستفاد ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک مضمون 'مدارس اسلامیہ میں سائنس کی تعلیم' لکھا تھا۔

میری رائے ہے کہ فوقانیہ کے بعد جس طرح آرٹس کے مضامین نصاب تعلیم میں شامل ہیں، اسی طرح سائنس کے مضامین کو بھی شامل کیا جائے اور فوقانیہ کے بعد نصاب تعلیم کو اس طرح مرتب کیا جائے: مولوی آرٹس، مولوی سائنس، عالم آرٹس، عالم سائنس، فاضل آرٹس اور فاضل سائنس۔ نصاب تعلیم کو مرتب کرتے وقت دینیات وادب کے ضروری مضامین کے ساتھ سائنس کے مختلف مضامین کو اس طرح نصاب تعلیم میں شامل کیا جائے کہ طلبہ اس کو برداشت کر سکیں اور مولوی سائنس، عالم سائنس اور فاضل سائنس ہمارے نصاب تعلیم میں شامل ہو جائے گا۔ (مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ سے مولانا مظہر الحق عربی وفارسی یونیورسٹی تک: صفحہ: ص، ۳۵)

۱۹۹۷ء سے مولانا نے مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے پرنسپل کا عہدہ سنبھال کر مدرسہ کو شہرت کے بام عروج تک پہنچادیا۔ ہندو بیرون ہند میں اس ادارہ کی شہرت بڑھی۔

مولانا کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ اس ذمہ دار پوسٹ پر رہ کر اتنے مضامین اور کتابیں لکھنا سب کو نصیب نہیں ہوتا۔ کبھی دیکھئے بل پر دستخط کر رہے ہیں، کبھی مدارس کے مسائل حل کرنے میں لگے ہوئے ہیں، کبھی مہمانوں کی ضیافت میں ہمہ وقت مشغول ہیں، ایسا لگتا ہے کہ خدا نے ہم لوگوں کے لیے رات ۲۴ ر گھنٹے کا بنایا ہے اور مولانا کے لئے ۴۸ ر گھنٹے کا۔

مولانا نے تذکرہ علمائے بہار لکھ کر بہار کے علماء کو زندہ وجاوید بنا دیا۔ مولانا نے تذکرہ علمائے بہار کی ترتیب وتدوین کو ایک پروجیکٹ قرار دیا ہے، آپ جانتے ہیں کہ پروجیکٹ آسانی سے حل نہیں ہوتا ہے بلکہ اس میں کئی سال لگ جاتے ہیں۔ اس پروجیکٹ کے تحت تذکرہ علمائے بہار کی جلد اول ۱۹۹۵ء میں جامعہ اسلامیہ بالا ساتھ سیتامڑھی کے اشتراک سے چھپ کر خراج تحسین حاصل کر چکی ہے۔ اس میں تقریباً ۵۰۰ ر علمائے کرام کے حالات شامل ہیں، اسی طرح اس کی دوسری جلد بھی ۲۰۰۶ء میں چھپ چکی ہے، جس میں ۲۸۳ علماء کے حالات شامل ہیں، تیسری جلد بھی طباعت کے مرحلہ میں ہے۔

مذکورہ بالا تحریر میں مولانا کے چند نقوش ہیں جو میں نے دل سے نکال کر قلم کے ذریعہ کاغذ کے سپرد کر دیا ہے، بقیہ باتیں دوسرے تیسرے مضامین میں ہوں گی۔

مذکورہ تحریریں آج سے دس سال قبل لکھی گئی تھیں، اس وقت مولانا مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں پرنسپل کے عہدے پر فائز تھے، کئی مضمون نگار بھی زندہ تھے، جیسے ڈاکٹر کلیم عاجز، وہاب اشرفی اور مولانا صغیر احمد رحمانی وغیرہ۔ اب تو یہ لوگ اللہ کے پیارے ہو گئے۔

اس کتاب کی تیاری کا کام ۲۰۰۹ء میں میں نے شروع کیا لیکن ہر کام کے لئے اللہ کے یہاں وقت متعین ہے اور متعین وقت سے پہلے کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ بار بار بڑوں، بزرگوں اور عزیزوں کی طرف سے اس کتاب کی طباعت کے تقاضے آتے رہے لیکن میری مشغولیت کی وجہ سے یہ بروقت نہیں منظر عام پر آ سکی، جس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ اس کتاب کی طباعت میں تقریباً دس سال لگ گئے، یہ کتاب آپ کو ایسے وقت میں مل رہی ہے کہ مولانا نے 'بہار کی اردو شاعری میں علماء کا حصہ' کے عنوان سے نالندہ اوپن یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل

کرلی۔اس دوران انہوں نے قرآن کے ترجمہ کا کام بھی مکمل کرلیااور تفسیر کا کام چل رہا ہے۔ہوسکتا ہے کہ اس کتاب کے ساتھ ساتھ آپ کومولانا کا ترجمہ کیا ہوا'تسہیل القرآن' بھی پڑھنے کو ملے گا۔

اس کتاب میں کل سترہ صاحب قلم نے اپنے خیالات کوتحریر کیا ہے۔اس میں معاصر،عزیز اور استاد بھی ہیں۔ایک منظوم نظم پروفیسر عبدالمنان طرزی کا ہے،جنہوں نے اپنے منفرد انداز میں لکھا ہے۔ مضامین بھی متنوع قسم کے ہیں۔اسی طرح بیس پریس ریلیز بھی ہیں۔مولانا نے اسے مختلف اوقات میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔اس کتاب کو ترتیب دیتے ہوئے مجھے والد محترم مولانا عبدالقیوم شمسی یاد آرہے ہیں۔اس طرح کے کام میں مجھے کبھی بھی والد محترم نے نہ روکا اور نہ خلل ڈالا بلکہ اس بات کی ہمیشہ خواہش رکھتے تھے کہ کچھ کرتے رہو،بڑے بھائی مولانا محمد قمر عالم ندوی،مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی، مولانا سید مظاہر عالم،مولانا نظیر عالم ندوی،ڈاکٹر ممتاز احمد خان،انوارالحسن وسطوی،ماسٹر ذاکر حسین، شاہد محمود پوری،ماسٹر عظیم الدین انصاری وغیرہ کا شکرگزار ہوں کہ جنہوں نے ہمیشہ مجھے دعاؤں سے نوازا۔ان بزرگوں کی دعا ہی کا نتیجہ ہے کہ مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی جیسی عبقری شخصیت پر کتاب ترتیب دے رہا ہوں اس کتاب کے پیش لفظ کی تکمیل سے قبل علم وعمل کے جویا اور معروف قلمکار جناب صفی اختر کا شکریہ ادا کرنا میرا حسین فریضہ ہے کہ ان کی مفید آراء سے اس کتاب کی اشاعت میں بڑی مدد ملی۔ بلاشبہ مولانا کی شخصیت علمی اعتبار سے بہت بڑی ہے،لہٰذا ان کی شخصیت کے مختلف علمی پہلوؤں کے حوالے سے جو کچھ بھی ممکن ہوسکا،انھیں جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔مولانا محترم اگر بہار سے باہر ہوتے تو کچھ اور ہی ہوتے۔اخیر میں مولانا،ان کے اہل خانہ اور شمیم اختر ندوی سب ایڈیٹر روزنامہ انقلاب کا بھی شکرگزار ہوں جن کی توجہ ومحبت سے کتاب آپ تک پہنچ رہی ہے۔

مجھے امید ہے کہ یہ کتاب آپ لوگوں کو پسند آئے گی اور میری اس خدمت کو سراہتے ہوئے مزید کچھ کرنے کی دعا دیں گے اور اگر کمی ہوگی تو اطلاع سے نوازیں گے۔

شکریہ

محمد صدر عالم ندوی

۱۸/اکتوبر ۲۰۱۹ء بروز جمعہ بعد نماز مغرب

# مقدمہ

مولاناابوالکلام قاسمی شمسی سابق پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ کی ہمہ جہت شخصیت اور علمی ودینی خدمات پر بیش قیمت مضامین ومقالات کا یہ حسین گلدستہ عزیز گرامی قدر مولاناصدر عالم ندوی مظاہری نے ترتیب دیا ہے۔مولانا کے مخلصین ،معتقدین اور متوسلین کے مقالات ہیں ،جو عزیز صدر عالم سلمہ کی درخواست پر ان حضرات نے لکھے ہیں۔ان کی یہ کوشش قابل ستائش ہے۔ اس کوشش کے نتیجہ ہی میں ہم مولانا کی شخصیت اور خدمات سے متعلق مختلف لوگوں کے خیالات سے واقف ہورہے ہیں۔کتاب کاایک باب مولانا کے مضامین ومقالات پر مشتمل ہے،اس سے ہم مخصوص مسائل میں مولانا کی فکراوران کے نظریات کوسمجھ سکتے ہیں۔

مولاناابوالکلام قاسمی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔وہ قاسمی اور شمسی دونوں ہیں،اس کا مطلب ہے کہ وہ قدیم صالح اور جدید نافع کے جامع ہیں۔سیر وتواریخ ان کا پسندیدہ موضوع اور مدارس کے احوال وکوائف،اس کے عروج وزوال کی داستان،نصاب تعلیم اور نظام مدارس ان کے فکر کامحور رہا ہے۔سرکاری بندشوں کے باوجودان کاقلم حق کی ترویج میں لگارہاہے۔یہ اپنے میں بڑی بات ہے۔

مولانا ۳۱؍اکتوبر ۲۰۱۱ءکواپنی طویل ملازمت اور خدمات سے سبکدوش ہوگئے ہیں اور کہنا چاہئے کہ چاندی کے وہ طوق وسلاسل جس میں وہ اپنی علمی اور معاشی ضرورت کی وجہ سے قید تھے، اتر گئے ہیں،ایسے میں ہمیں امید ہے کہ ان کی فکر جو پہلے بھی آزاد تھی اوران کاقلم جس پر قیدوبند کے

اثرات پہلے بھی کم پڑتے تھے مزید حریت اور جرأت کے ساتھ ملت کی شیرازبندی، تعلیم کے فروغ اور حکومتی سطح پر غیر منصفانہ اقدام کے خلاف تیز رفتار ہوگا۔ دوریش کا قصہ ہے کہ ایک سرکاری آدمی اپنی ملازمت سے سبکدوش ہوا، لوگ اس کو مبارکباد دے رہے تھے کہ اس نے ملازمت کی پوری مدت صاف ستھرے انداز میں گزاردی اور بڑا کام کیا۔ کہنے لگا، میاں! کام تو اب کرنا ہوگا، ریٹائرڈ ہونے کے بعد، اب تک تو ملازمت ہوتی رہی ہے۔

مولانا نے زندگی کے مختلف ادوار میں ملازمت سے زیادہ کام ہی کیا ہے، ہمیں امید ہے کہ وہ سبکدوشی کے بعد صرف کام خصوصاً تحقیقی اور تصنیفی کام پر اپنی توجہ صرف کریں گے۔ علمائے بہار کے طویل پروجیکٹ کو مکمل کرکے اس علمی خلا کو پر کریں گے جس کا انتظار تشنگان علوم کو برسوں سے ہے۔ صحت وعافیت اور درازی عمر کی دعا اپنے مقالہ میں پہلے بھی کر چکا ہوں اور پھر کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ صحت وعافیت کے ساتھ ان کا سایہ تادیر قائم رکھے تاکہ وہ ملت کی بیش بہا خدمات انجام دے سکیں۔ آمین

مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی

(نائب ناظم امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# حیات
# و
# تاثرات

(۱)

# مولانا ابوالکلام قاسمی- ماضی وحال کے تناظر میں

مولانا صغیر احمد رحمانی

مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی، جدید صالح اور علم نافع کے حسین امتزاج اور مجمع البحرین ہیں۔ مدارس نظامیہ، مدارس ملحقہ اور کالج و یونیورسیٹی کے نصاب تعلیم پر عبور رکھتے ہیں۔ یہ مختلف فنون میں فاضل اور ایم اے بھی ہیں۔ اس وقت بہار کے قدیم مشہور اور بافیض ادارہ ''مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ'' پٹنہ کے پرنسپل ہیں اور خانہ پری والے پرنسپل نہیں ہیں۔ حضرت مولانا مفتی محمد سہول صاحب، حضرت مولانا ریاست علی ندوی صاحب، حضرت مولانا اصغر حسین صاحب علیہم الرحمہ والرضوان کی زینت بخشی ہوئی وراثت کے صحیح اور قدرداں جانشیں ہیں۔ عہدہ سے ان کا کوئی بڑا تعارف نہیں ہوا، لیکن مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ جو عرصہ سے جمود و تعطل کا شکار تھا، درو دیوار سے کہنگی، یتیمی اور بے بسی کا زبان حال سے اظہار کر رہا تھا۔ اس کے عہدہ پرنسپل شپ میں اس کی تعمیر وتزئین کا بڑا کام انجام پایا۔ مہمان خانہ اور کتب خانہ کی عمارت بنی، دارالاقامہ طلبا سے معمور و آباد نظر آرہا ہے۔ علمی زندگی کی رونق اور چمک دمک ماحول کو عطر بیز کرتی ہے اور ان کی شفقت مگر رعب وجلال کے اتصال سے طلبا کو اپنے فریضہ پر متوجہ ہونے پر مجبور کرتی رہتی ہے۔ ان خصوصیات کے ساتھ خاص بات یہ ہے کہ عالمانہ وضع قطع، طور وطریق، سادگی و دینداری کی خاص پہچان ہے، جس سے ہٹنے کے لئے وہ کسی قیمت پر تیار نہیں۔

مولانا قاسمی بہار کے مشہور و معروف عالم دین ہیں اور ہر طبقہ اور مسلک میں فکری توازن اور

اعتدال کی وجہ سے قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ تعلیم وتعلم سے فراغت کے بعد مختلف مدارس میں ممتاز استاد کی حیثیت سے درس وتدریس کی ذمہ داری انجام دیتے رہے، پھر مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں استاذ مقرر ہوئے اور یہاں بھی اپنی سابقہ عادت کے پیش نظر استاذ کی ذمہ داری کو بحسن وخوبی انجام دیا۔ طلبا درس سے مطمئن وفیضیاب ہوتے اور پروانہ واران کے گرد ہالہ بنائے رکھتے اور استفادہ کا باب کھلا ہوا تھا، جس نے استاذ اور شاگرد میں ربط وتعلق کو استوار کیا اور مقبولیت ومحبوبیت ان کی مقدر رہی۔ پھر جب پرنسپل کی جگہ خالی ہوئی تو عہدہ نے آواز دی۔ حق بہ حق دار رسید۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء

مدرسہ اسلامیہ کے پرنسپل کو انتظامی امور کو زیادہ انجام دینا پڑتا ہے اور اسی مناسبت سے سرکاری اور غیر سرکاری مجلسوں میں شرکت کرنی پڑتی ہے۔ ہر کمیٹی میں اپنی ضمیر کی آواز کو پوری مضبوطی سے رکھتے ہیں، کسی کے چشم وار کی پروا نہیں کرتے۔ مدرسہ اسلامیہ کی سرزمین پر جب مولانا مظہر الحق عربی وفارسی یونیورسیٹی قائم کرنے کی حکومت نے تجویز رکھی تو مدرسہ کے دستور اور وقف نامہ کی صراحتوں کی بھرپور وکالت کی اور حکومت نے ان کی اصابت رائے اور فکر کی پختگی کو دیکھ کر اپنا موقف بدلا اور مدرسہ اسلامیہ میں عربی وفارسی یونیورسیٹی قائم نہ ہوسکی، لیکن اب تک اس کو صحیح زمین پر اتارنے کے لئے حکومت اقدام نہیں کرسکی۔

تخلیقات:۔ تحریر وانشاء کا ذوق بھی بہت خوب ہے، اس میں شگفتگی اور ادب کی چاشنی ہوتی ہے۔ آسان زبان میں اپنی بات پیش کرنے کا خاص سلیقہ ہے۔ علمی وادبی رسالوں میں برابر چھپتے رہے۔

درسیات میں: القراۃ الجدیدۃ المبادی تا الجزء الثالث، الترجمۃ العربیۃ، تسہیل النحو، جدید اردو قواعد، حصہ دوم، سوم جو درجہ کے معیار کو سامنے رکھ کر مرتب ہوئی ہے اور نحو وصرف کے ساتھ عربی ادب کو آسان طریقہ پر ذہن نشین کرنے کے خیال سے لکھا گیا ہے۔ ان کے علاوہ دینی معلومات کے لئے تفسیر سورۃ فاتحہ، مکالمہ سنت وبدعت، حضرت اویس قرنی، ہمارا دین حصہ دوم، چہل حدیث تحریر کی جو زیور طبع سے آراستہ ہو کر عوام وخواص میں مقبول ہوئی ہیں۔

تذکرہ علمائے بہار:۔ ''تذکرہ علمائے بہار جلد اول اور جلد دوم لکھ کر قاسمی صاحب نے جید اور

باکمال علماء جوگزشتہ گمنامی میں تھےاور جن سے موجودہ نسل بے خبر تھی، ان کے حالات اور سوانح کا معلوم کرنا جوئے شیر سے کم نہیں۔ اس راہ کی تمام مشکلات کوسر کرتے ہوئے علم وتحقیق کی دنیا میں بہت مفیداوردستاویزی شہادتیں فراہم کردیں۔ اب تک مرحومین علمائے کرام کا تذکرہ ہے۔ ابھی سرزمین بہار کے گل ولالہ کے بہت سے باغات ہیں، ان پرمصنف کی محنت جاری ہے۔ خدا کرے یہ کام بھی ان کے ہاتھوں انجام پائے اور علم وتحقیق کی دنیامیں مشعل راہ ثابت ہو۔

مولانا قاسمی نے تذکرہ علمائے بہار کے ذریعہ بہار کے علماء کی خدمات کومتعارف کرانے کی ایک طرح ڈالی ہے اوراس انداز سے مختلف شعبۂ ہائے حیات سے تعلق رکھنے والی شخصیات پرمواد فراہم کرنے کی نئی راہ ہموار ہوئی ہے۔

تین ہفتے امریکہ میں: تین ہفتے امریکہ میں دراصل قاسمی صاحب کاایک سفرنامہ ہے جس میں امریکہ کی زندگی کی جھلک ہے۔ ایک غیر جانب دار سیاح کی حیثیت سے جن خوبیوں کودیکھااوراس کی تحسین کی ہےاور خامیوں پربھی گہری نظر ہے،اس کی شناعت وقباحت کوذکر کرنے سے اعراض نہیں کیا ہے۔ انداز بیاں اتنادلچسپ ہے کہ پوری کتاب ختم کئے بغیرقاری کواطمینان نہیں ہوتا۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ مولانا قاسمی نے امریکہ کاسفراس زمانہ میں کیاہے، جب اس کے جبروتشدداورظلم وبربریت سے افغانستان تباہ ہوچکاتھااورعراق کے وجودکوختم کرنے کی ہرطرح کی حکمت عملی اختیارکررہاتھااور جونیئر بش پرہرغیر جانبدار، انصاف پسنداورعدل پرورلعن وطعن کررہاتھااورصدام حسین اس کی آہنی زنجیروں میں بندھاہواقیدخانہ میں بندتھا، پھرمقدمہ کی سماعت اورفیصلۂ پھانسی کی ڈھونگ کے بعدوہ پھانسی کے تختے پرچڑھ چکاتھا۔ اس وقت غیرتوغیراپنوں کوبھی یہ سفرناگوارطبع تھا،مگران تمام امورکوذہن میں رکھتے ہوئےمولانا قاسمی نے امریکہ کاسفرکیااورسفرنامہ کی اشاعت نےلوگوں کے ذہنوں سے خلش اوردل کے کسک کودورکردیااورامریکہ کاآئینہ قارئین وناظرین کےسامنےپیش کیا۔

علم وتحقیق اورمختلف علوم وفنون میں مہارت کی وجہ سے نہ صرف بہار کے سمینار اور سمپوزیم میں مدعوکئے جاتے ہیں بلکہ ہندوستان کے اہم شہروں میں بھی علمی سمینارمیں بلائے جاتے ہیں جو موصوف کے لئے فال نیک ہے۔

یہ بات ۱۹۶۳ء کی ہے، مولانا ابوالکلام قاسمی کی زندگی کی وہ شاہراہ ہے جو تعلیم سے فراغت کے بعد کی ہے، لیکن طالب علم کی حیثیت سے ان کی زندگی کیسی رہی، اس پر بھی ایک نظر ڈالنا راہ علم کے مسافر کے لئے بہترین نشان راہ اور عبرت انگیز ہے۔

میں ۱۹۶۳ء میں حضرت امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانی قدس سرہ کے حکم پر مدرسہ قاسم العلوم حسینیہ دوگھرا ضلع دربھنگہ میں استاذ کی حیثیت سے بحال ہوا۔ اس زمانہ میں دربھنگہ سے جوگیارہ ہوتے ہوئے اسٹیشن سے اتر کر ہی دوگھرا جانے کا واحد راستہ تھا۔ جوگیارہ اسٹیشن سے باہر آیا، معلوم ہوا کہ اکلوتا ٹم ٹم ہے، وہی دوگھرا سے آمد و رفت کرتا ہے۔ ملاقات ہوئی اور میں اس پر سوار ہوا، یہ ٹم ٹم کلو کے ٹم ٹم سے کم ثابت نہیں ہوا۔ چلا تو چلا اور اڑا تو اڑا۔ گھوڑے کے اس نخرہ سے دوگھرا پہنچنے میں کافی دقت ہوئی۔ مدرسہ کے احاطہ میں پہنچا تو کافی سناٹا تھا۔ ۱۲ رسال کا ایک لڑکا فوراً آیا، ٹم ٹم سے سامان اتارا، مدرسہ کے دفتر میں رکھا۔ پانی لا کر رکھ دیا اور کچھ منٹ کے لئے غائب ہوگیا۔ اور وہ لڑکا ۵۰۔۵۵ سال کے ایک شخص کے ہمراہ نمودار ہوا۔ علیک سلیک کے بعد وہ بھی غائب ہوگئے، پھر دونوں ایک ساتھ طشت میں کھانا لے کر حاضر ہوئے، کھانے پر تعارف ہوا۔ میزبان محترم نے بتایا کہ میرا نام امیر الدین انصاری ہے اور اسی مدرسہ میں ماسٹر کے پوسٹ پر ہوں اور فرصت کے اوقات میں کیرانہ کی دکان پر رہتا ہوں۔ نوعمر لڑکے نے بتایا کہ اس کا نام ابوالکلام ہے اور دوگھرا ہی مکان ہے اور مدرسہ کے قریب میں ہی گھر ہے۔ تعارف نے قربت بڑھا دی اور گھر کے لوگ ہی ٹھہرے۔ رات میں ناظم مدرسہ محترم مولانا انیس الرحمٰن قاسمی صاحب علیہ الرحمہ سے ملاقات ہوئی، گفتگو ہوئی۔ کل ہو کر یہ ذمہ داروں کے ساتھ تشریف لائے، معاملہ طے پا گیا اور مدرسہ کی تعلیم کے ساتھ کچھ ذمہ داریاں بھی میرے حوالے کیں۔

شرح وقایہ وغیرہ میں چار لڑکے تھے اور فوقانیہ میں چھ لڑکے اور وسطانیہ چہارم میں ۱۲ر لڑکے۔ انہیں درجات کی تدریس میرے سپرد ہوئی۔ دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہو کر آیا تھا، جوان تھا اور حوصلہ بھی بھرپور جوان تھا۔ ۱۲ر گھنٹوں تک پڑھتا اور کل کے اسباق کی تیاری کرتا۔

میری محنت اور تعلیمی یکسوئی، طلبا سے محبت و پیار نے اچانک مدرسہ کا ماحول بدل دیا اور نیچے

درجہ سے عالم درجہ تک کے طلبا مغرب بعد مدرسہ ہی میں مذاکرہ اور یاد کرنے آتے۔جنگل کی آگ کی طرح یہ بات مشتہر ہوئی اور قرب وجوار سے طلبا کشاں کشاں پہنچنے لگے۔ مطبخ بھی جاری کردیا گیا۔ چند محدود طلبا تھے جن کی کفالت مدرسہ کررہا تھا، ورنہ ۵۰۔۶۰ لڑکے خورندہ خویش تھے اور پوری لگن، دلچسپی اور شوق سے پڑھنے میں شب وروز منہمک رہتے۔

میاں ابوالکلام کے شب روز: ابوالکلام سلمہ سے تعارف اور موافقت تو ہو ہی چکی تھی۔قدوری، کافیہ اورآثارالسنن جیسی کتابوں کے اسباق نے اور بھی فاصلہ کو کم کردیا۔

اساتذہ کی عظمت وعقیدت اس کی فطرت ثانیہ، اسباق میں پابندی، عبارت فہمی کے لئے سوال وجواب میں جری، اور باہر بالکل خاموش طبع، وفاداری، اطاعت گذاری اس کی طبعی سرشت، شب وروز مدرسہ میں محدود زندگی گذارنے کا عادی، اساتذہ کی خدمت، ہمیشہ چاق وچوبند، دن میں اسباق میں حاضری کا اہتمام، اور رات میں مذاکرہ اور تکرار کی مواظبت، یہی خوبی ہے میاں ابوالکلام کی، جس نے اسے اساتذہ کا محبوب اور ہردل عزیز بنایا اور تھوڑی دیر کا غائب ہونا بھی ہم لوگوں کو شاق گذرتا۔ تقریباً دوسال میں مدرسہ حسینیہ دوگھرا میں برسرکار رہا۔اس عرصہ میں مجھ کو عزیز موصوف سے کوئی تکلیف تھی ہی نہیں، لیکن کسی مدرس کو بھی ان کے معاملہ میں شکوہ شکایت کرتے نہیں پایا۔جب کہ میں صدرمدرس تھا، اساتذہ اور طلبا کا معاملہ آتا ہی رہتا تھا، لیکن میاں ابوالکلام سلمہ اس سے بالکل مختلف نکلے، بلکہ اساتذہ ان کی قدردانی، محنت اور تعلیمی لگن، خدمت گذاری پر ہمیشہ مداح رہے۔اور یہ سچی حقیقت ہے کہ استاذ کی دعا اکسیر ہے اور اسی نے میاں ابوالکلام کو حضرت مولانا ابوالکلام قاسمی کے مقام ومنصب پر پہنچایا۔ ہرکہ خدمت کرد اومخدوم شد۔بچپن سے ہی نماز پنجگانہ کی پابندی اور بڑوں کا احترام ان کا وصف امتیاز تھا۔گاؤں والے ان کو اب تک صوفی صاحب کہہ کر پکارتے ہیں۔

فن جدوجہد: محنت، شوق اور لگن انسان کو کہاں سے کہاں پہنچادیتے ہیں اور آج کا کام کل پر نہ ٹال کے اصول کو جس شخص نے اپنالیا وہ زندگی میں بامراد اور کامیاب رہا۔مولوی ابوالکلام حفظہ اللہ نے اس گر کو سمجھ لیا تھا۔مجھے یاد نہیں پڑتا ہے کہ صحت مند رہتے ہوئے کبھی اسباق میں غیر حاضری کی ہو اور دن رات کتابوں میں مشغول ومنہمک رہتے ہوئے محنت اور لگن میں کوئی کمی کی ہو۔یہ بھی دیکھنے میں آیا

کہ کافیہ کے لئے تحریر سنبٹ اور قدوری کے لئے الجوہرۃ السیرۃ لے جاتے اور جب سبق میں اس کے سوال کی ضرورت محسوس کرتا تو محسوس ہوتا کہ مطالعہ کیا ہے۔ محض دھونس جمانے کے لئے کتاب نہیں لے گئے، ان کی یہ خوبی بھی قابل ذکر اور لائق تذکرہ ہے کہ روزانہ کے اسباق کو دہرا لیتے، ٹال مٹول اور کسل ان سے بہت دور رہا۔

انہیں خوبیوں نے ان اپنے رفقاء درس میں ممتاز بنایا اور ہر امتحان میں امتیازی نمبرات سے کامیاب ہوتے رہے۔

دوگھرا بڑا قصبہ ہے، میلاد بہت ہوتی تھی۔ ہفتہ میں کم سے کم دو مرتبہ مجلس میلاد منعقد ہوا کرتی۔ عزیز موصوف کو پہلے تقریر کا موقع دیتے۔ الحمدللہ کہ اس میں تقریر کی صلاحیت بھی پیدا ہونے لگی اور مقررین میں جب رعب اور خوف دور ہو جائے تو پھر وہ عمدہ تقریر کر سکتا ہے، موصوف کی صلاحیت کی یہ جہت بھی قابل قدر ہے اور گاؤں میں عیدین کے موقع سے ان کے خطاب کو پوری توجہ اور شوق سے سماعت کرتے ہیں۔ طلبا کی انجمن ''نادیۃ الادب'' کے صدر کی حیثیت سے طلبا پر پوری نگرانی کرتے اور مضمون کی یقین کے ساتھ ہفتہ واری اجتماع میں اسے تمرین کراتے اور جس سے بے توجہی ہوتی، معاملہ میرے پاس لاتے اور اس کو سمجھانے اور سنبھالنے کی کوشش کرتے۔

کامیابی کی کنجی: علم کے مسافر کے لئے عیش وآرام، سہولت پسندی زہر ہلال ہے۔ علماء کی تاریخ بتاتی ہے کہ بہت کم علماء ایسے گذرے ہیں جنھوں نے سہولت اور یُسر میں علم کی پل صراط کو عبور کیا ہے۔ اکثر علماء جن کی علمی دنیا میں شہرت ہے اور جن کی علمی و دینی خدمات کے باب روشن ہیں، یہ نفوس قدسیہ ہیں، جو خوشحالی اور آسودگی سے محروم تھے۔ علمائے سلف کے مصنف نے لکھا ہے کہ طالب علم کے لئے عسرت و تنگ دستی کامیابی کی کنجی ہے۔ مولوی ابوالکلام حفظہ اللہ کے والد جناب عبدالستار صاحب کلکتہ میں جوٹ مل میں کام کرتے تھے، اس سے آمدنی کم تھی اور گھر کے اخراجات کا دارومدار اسی پر تھا۔ عزیز موصوف کی زندگی، رہن سہن پر اس کے اثرات تھے، لیکن اپنے طور طریق، خودداری و استغناء کی وجہ سے کبھی کسی سے کچھ طلب نہیں کیا، یہ شان ہیں اصحاب صفہ کی اور ان کو اس سے نسبت تھی۔

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ

يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ تَعْرِفُهُم بِسِيمَاهُمْ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا۔

عزیز موصوف نہ تو اپنے گھر کی حالت سے پریشان رہے اور نہ ہی غربت سے تنگ آکر میدان علم سے گریز کرنے کا ارادہ کیا، صبر وضبط کا ہمالیہ پہاڑ لے کر ڈٹے رہے۔

آنکہ تر اشناخت جاں راچہ کند
فرزند و عیال وخانماں راچہ کند

اللہ کی فتح ونصرت ان کا مقدر رہی، کل کی صعوبتوں کو جھیلنے والا اور مصائب ومشکلات سے پنجہ آزمائی کرنے والا آج ایک بڑے تعلیمی ادارے کے اہم منصب پر فائز ہے اور ساری سہولت ان کی گرد راہ بنی ہوئی ہے۔

ماضی وحال میں یکسانیت: عیش وعشرت، دنیاوی زیب وزینت، خوشحالی وترفہ نے کل کے ابوالکلام کے پائے استقلال میں لغزش پیدا نہیں ہونے دی۔ مزاج اور رہن سہن میں وہی سادگی، گھر میں دینداری، بچوں میں صالحیت وصلوحیت، نمود وریا سے بہت دور۔ اس امتحان میں کامیاب ہونا ہی اچھے انسان کا کام ہوسکتا ہے کہ اپنے اور پرائے کے درمیان لباس اور ہیئت میں کوئی فرق نظر نہیں آئے، مال ومتاع کے درمیان زندگی گذارنے والا اعتدال اور توازن کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑے، خال خال ہی اس کی مثال ملتی ہے۔

روشن مستقبل: جو زمانہ بعید میں طالب علم تھا اور میں ان کا استاذ، لیکن مبدأ فیاض نے آج ان کو بڑے مقام ومنصب پر پہنچا دیا ہے۔ چمن کے پھولوں کو نفرت وحقارت کی نگاہوں سے نہ دیکھو، نہ جانے کون سا گل سہرا کا پھول اور گلے کا ہار بن جائے۔

بحمد للہ مدرسہ قاسم العلوم حسینیہ دوگھرا کے چمن کا یہ پھول بہار کے ایک بڑے مدرسہ کی ذمہ داری کا تاج اپنے سر پر رکھے ہوا ہے، جو اپنی خوشبو سے دنیا کو معطر کئے ہوا ہے۔ مولانا ابوالکلام کی طالب علمی اور بچپن کی صحیح تصویر سعدی شیرازی کی زبان میں:

بالائے سرش زہوشمندی می تافت ستارۂ بلندی

تازہ نادر مثال: چلتے چلاتے مولانا ابوالکلام قاسمی کی وہ ادا ربط تعلق کی گہرائی تاریخ کے حوالہ کرنے جا رہا ہوں جس سے میرا رواں رواں ممنون ومتاثر ہے اور دعا گو بھی۔ ۱۹/ اگست ۲۰۰۸ء کو بکھیلی ضلع سوپول جو میری جائے پیدائش اور سکونت ہے، میں سیلاب بلاخیز کا پانی تین طرف سے گھسا اور اپنے بہاؤ کا راستہ بنایا تھا اور منٹوں میں پوری آبادی سمندر میں تیرتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ اس طوفان نوح میں اوروں کی طرح میں بھی ذہنی وجسمانی کشاکش میں مبتلا تھا۔ کچھ شاگردوں سے خبر وعافیت معلوم کرنے پر اکتفا کیا اور حق تلمذ ادا کردیا۔ ۴۲ رسال میں ہزاروں شاگرد پیدا ہوئے، جو ہندوستان کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے ہیں۔ انہوں نے ضرورت ہی نہیں سمجھی کہ بات بھی کروں، لیکن دوسال شرف تلمذ حاصل کرنے والا طالب علم (۶۴۔ ۶۳ء) مولانا ابوالکلام قاسمی کا روزانہ ایک مرتبہ فون آتا کہ کیسے ہیں؟ اور کیوں پٹنہ تشریف نہیں لاتے؟ میں موصوف کو ٹالتا رہا۔ اخیر میں ان کا اصرار غالب آیا اور میں پٹنہ پہنچ گیا۔ میرے ساتھ رفیقۂ حیات بھی تھیں۔ پندرہ دنوں رمضان المبارک اور عید، پھر ۶۔ ۷ دن مزید برآں قیام رہا۔ مولانا قاسمی صاحب اور ان کے ابا جان بھائی عبدالستار صاحب کے بارے میں کچھ لکھنا آفتاب کو چراغ دکھانے کے مترادف ہوگا۔ مولانا کی اہلیہ (میری بہو) بھی، نصرت سلمہا (پوتی) صاحب زادہ مولوی کلیم اختر اور گلاب بابو کے درمیان رہ کر سیلاب کی ساری مصیبتوں کو بھول گیا اور اپنے لڑکوں اور بہو سے بڑھ کر دونوں نے خدمت کی۔ یہ بھی ذہن میں محفوظ کرتے جائیے کہ مولانا قاسمی عیدین کی نماز اپنے گاؤں میں پڑھایا کرتے ہیں اور اسی موقع پر اہل خانہ بھی جاتے ہیں کہ گھر پر عید ہوگی اور رشتہ داروں سے یکجا ملاقات بھی، مگر میری موجودگی کی وجہ سے اہلیہ محترمہ اور ابا جان نے فیصلہ کیا کہ ہم لوگ پٹنہ ہی میں رہیں گے اور مولانا اکیلے دو گھر اجائیں گے اور ایسا ہی ہوا۔

ایسی صالحیت وسعادت کی مثال دور اور نزدیک نظر نہیں آتی، زمانہ قیام میں قریب سے دیکھنے، پڑھنے اور سمجھنے کا موقع ملا اور جو کہتا ہوں صحیح کہتا ہوں کہ دیدہ کو شنیدہ سے بڑھ کر پایا۔

ایک استاذ اپنے مطیع وفرماں بردار شاگرد کے ذکر جمیل کو لکھنے بیٹھا تو قلم تھمنے کا نام نہیں لیا اور جو کچھ ذہن میں آتا گیا اسے سپرد قلم کرتا چلا گیا۔ محبت وتعلق کا نام دے لیجئے یا باپ بیٹے کا پیار ودلار۔

☆ سابق استاد جامعہ رحمانی، مونگیر

(۲)

# علم وعمل کے پیکر۔ مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی

مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی

میں اپنے معاصرین میں عملی شغف کی صلاحیت، ہر دم کچھ کرتے رہنے کی دھن، اور ملت کے لئے فکر مندگی کے حوالہ سے جن چند لوگوں کو قدر و منزلت، بلکہ کبھی کبھی رشک کی نظر سے دیکھتا ہوں، ان میں ایک نام مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ کا ہے۔

مولانا سے میری پہلی ملاقات کب ہوئی، مہہ وسال یاد نہیں، شاید بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ میں معدل سوالات اور ذیلی کمیٹی کی مٹینگوں میں، جہاں وہ تشریف لایا کرتے تھے اور مدرسہ احمدیہ ابابکر پور کے خادم تدریس ہونے کی وجہ سے میری بھی حاضری ہوتی تھی۔ ان مٹنگوں میں مولانا کی اصابت رائے اور تعدیل سوالات کے موقع سے عربی وادب پر ان کی قدرت کا پتہ چلتا تھا، بلکہ سچی بات یہ ہے کہ جس کمیٹی میں وہ ہوتے تھے ہم لوگ یک گونہ بے فکر ہو جاتے تھے کہ مولانا سب کچھ کرلیں گے، بلکہ سب کچھ سنبھال لیں گے۔

مولانا کو اللہ تعالی نے سمینار وغیرہ کے انعقاد کی بھی خاص صلاحیت عطا فرمائی ہے۔ ایک بار مولانا نے امام ابوحنیفہؒ پر مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں سمینار کرایا تھا، اچھا مجمع تھا اور مقالہ نگار حضرات بھی بڑی تعداد میں آئے تھے، ان کی محبت کے طفیل میں، میں نے بھی سمینار میں ایک مقالہ

پڑھا تھا، عنوان تھا ''ہندوستان میں فقہ حنفی کا علمی سرمایہ''

میں جن دنوں بہار مدرسہ بورڈ کی تاریخ پر کام کر رہا تھا، اس زمانہ میں اسی موضوع پر ایک سمینار میں نے مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں رکھا تھا، جس میں سابق اسسٹنٹ آف اسلامک ایجوکیشن کے ڈائریکٹر جناب صفات احمد نے بھی شرکت کی تھی، اس سمینار میں بھی مولانا موصوف نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، جس کی وجہ سے سمینار کامیاب ہوا تھا۔

۲۰۰۱ء میں انجمن ترقی اردو ویشالی نے میرے اوپر سمینار کیا اور اس کے مقالات کا مجموعہ ''مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی۔ حیات وخدمات'' کے نام سے پروفیسر مشتاق احمد نے مرتب کیا تو اس تقریب کی صدارت مولانا ہی نے کی تھی، اس موقع سے انہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں فرمایا:

> ''زندگی ہی میں کسی کی خوبیوں اور خدمتوں کا اعتراف کرنا چاہئے، انجمن ترقی اردو ویشالی نے جواں سال عالم دین اور محقق مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی کی علمی وادبی خدمات پر سمینار منعقد کر کے یہ حق ادا کر دیا''

مولانا نے فرمایا:

> ''مرنے کے بعد اعتراف کا جو معاملہ ہے وہ ایک روایت ہو کر رہ گئی ہے، انجمن ترقی اردو ویشالی نے اس روایت سے بغاوت کر کے ایک اچھی مثال قائم کی ہے۔''

اس موقع پر انہوں نے میری ہمہ جہت خدمات کو قابل ستائش قرار دیتے ہوئے نیک خواہشات بھی پیش کیں۔ واقعہ یہ ہے کہ معاصرین کی خدمات کا اعتراف کم کیا جاتا ہے۔ تصوف میں معاصرت کو ''حجاب اکبر'' کہا گیا ہے۔ مولانا نے اس سمینار میں جس فراخ دلی کے ساتھ میرے کاموں کو سراہا، اس سے میرا حوصلہ اور بڑھا اور کام کرنے کے ارادہ کو تقویت ملی، میں ان دنوں مدرسہ احمدیہ ابا بکر پور ویشالی میں ہوا کرتا تھا، امارت شرعیہ میں نہیں، امارت شرعیہ آنے کے بعد کام کا وسیع میدان ملا، مولانا موصوف کو جب میں نے یاد کیا، اپنی مشغولیت کے باوجود امارت شرعیہ تشریف لائے، مبلغین کے سالانہ اجتماع میں ان کے خیالات سے مستفید ہونے کا موقع بھی ملا۔ وہ امارت شرعیہ کے شوریٰ کے رکن ہیں اور تعاون ان کا خاص مزاج ہے، یہ مزاج اللہ تعالیٰ کی ایک

نعمت ہے، جو کم لوگوں کو ملا کرتی ہے۔

مختلف موقعوں سے مولانا کی اصابت رائے بھی سامنے آتی رہتی ہے، ان کے اندر جرأت گفتار بھی ہے اور جرأت کردار بھی، وہ سرکاری ادارے کے ذمہ دار ہیں، لیکن جب بھی طلبا کے مسائل سامنے آتے ہیں یا کوئی ایسا مسئلہ سامنے آتا ہے، جس سے دین وملت پر حرف آتا ہے تو وہ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، وہ بھول جاتے ہیں کہ سرکاری دربار میں اس کے عواقب ونتائج کیا ہوں گے؟ اقبال نے کہا: ع

اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

مولانا کی خدمات کا سرکاری سطح پر بھی اعتراف کیا گیا ہے، سماجی تنظیموں اور سیاسی پارٹیوں کی طرف سے بھی انہیں انعامات واعزازات سے نوازا جاتا رہا ہے۔ بہار اردو اکادمی نے بھی ان کی گراں قدر تالیفات پر انعام دیا ہے۔ شمس الہدیٰ ایوارڈ اس وقت کے وزیر تعلیم جے پرکاش نرائن یادو کے ہاتھ سے ہم دونوں کو ایک ساتھ خدا بخش لائبریری میں دیا گیا تھا۔ اس تقریب کی صدارت مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے فرمائی تھی، مرکزی وزارت تعلیم کے ذریعہ تعلیمی میدان میں قابل قدر خدمات کے لئے اساتذہ کو دیا جانے والا گراں قدر ایوارڈ بھی مجھ سے ایک سال قبل ۲۰۰۰ء میں انہیں مل گیا تھا۔ ایوارڈ کی تقسیم میں اگر جانب داری نہ برتی جاتی تو وہ اب تک پدم شری اور پدم بھوشن بھی ہو گئے ہوتے اور کیا بعید کہ سبکدوشی کی مدت آتے آتے ان کے کلاہ افتخار میں یہ بھی چاند جڑ جائے۔

مولانا کو اللہ رب العزت نے تقریری اور تحریری صلاحیتوں سے نوازا ہے، خوب بولتے ہیں اور بہت اچھا لکھتے ہیں، تحقیق کا خاص ذوق ہے، عربی زبان وادب ان کے پسندیدہ موضوعات میں شامل ہے۔ القراۃ الجدیدۃ المبادی، القراۃ الجدیدۃ جز اول، ثانی، ثالث اور الترجمۃ العربیۃ کئی جگہوں پر داخل نصاب ہیں اور پڑھائی جاتی ہیں۔ ان کتابوں کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کو بچوں کی نفسیات، ان کے ذہنی پیراگراف اور تدریس کے فن پر عبور ہے۔ زبان وادب میں طلبا کی صلاحیت کو کس طرح تدریجاً بڑھایا جاسکتا ہے، اس سے مولانا خوب واقف ہیں، اور اس

واقفیت کا پورا پورا استعمال ان کتابوں میں کیا گیا ہے۔ تسہیل النحو، قواعد عربی پر مولانا کی گرفت کا پتہ دیتی ہے اور تفسیر سورۃ فاتحہ ان کی قرآن فہمی کی بین دلیل ہے، جدید اردو قواعد حصہ دوم، سوم کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ان کا سمجھنا اور برتنا آسان ہو گیا ہے۔ مکالمۂ سنت و بدعت، ہماری نمازیں، حضرت اویس قرنیؓ، چہل حدیث وغیرہ جیسی کتابیں ہمارے سامنے نہ آتیں تو تعجب کی بات ہوتی، اس لئے کہ یہ قاسمیت کا خاص مزاج رہا ہے کہ مذہبی عنصر ان کے یہاں غالب ہوتا ہے اور سنت سے محبت کے ساتھ بدعات سے نفور ان کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ اس لئے ان کتابوں کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ مولانا نے قاسمی ذہن وفکر سے کہیں سمجھوتہ نہیں کیا ہے۔

تذکرہ علمائے بہار جلد اول، دوم اور دیگر کتابوں سے وابستگی اور علماء کی خدمات کو ہر سطح پر متعارف کرانے کے جذبہ کا مظہر ہے، ان کتابوں میں مولانا کی محنت دیدنی ہے، علم وتحقیق کے میدان میں ہر دم آگے بڑھنے والی چیزیں سامنے لانے کا موقع ہوتا ہے۔ مولانا نے ان امکانات سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ تذکرہ علمائے بہار کی دو جلدیں علمی دنیا میں اپنا الگ مقام رکھتی ہیں، حالانکہ کئی جگہ پر تذکرہ میں مہ وسال کے غلط اندارج، شاعروں کے تخلص میں پھیر بدل کی وجہ سے قاری ٹھوکر کھاتا ہے، غالباً شاداں فاروقی مرحوم نے ان اغلاط کی ایک فہرست بھی زبان وادب میں شائع کرائی تھی، لیکن ایسی ضخیم کتاب میں چند جگہ غلطیوں کا رہ جانا امر مستبعد نہیں ہے۔ انسانی کاموں میں ایسی بھول چوک ہوتی رہتی ہے، اس لئے اس سے صرف نظر کرنا چاہئے۔ البتہ غلطیوں کا یہ تسلسل جاری نہ رہے، اس کے لئے آئندہ ایڈیشن میں تصحیح کی تجویز ضرور رکھنی چاہئے۔

مولانا کی ایک کتاب ''تین ہفتے امریکہ میں'' خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ یہ اصلاً سفرنامہ ہے، جس میں مولانا نے اپنے مشاہدہ کی روشنی میں امریکہ کے دروبست کا جائزہ لیا ہے۔ جزئیات پر روشنی ڈالی ہے، امریکہ کی خوبیوں اور خامیوں کا ذکر کیا ہے، قابل تعریف چیزوں کی تعریف کی ہے اور غلط چیزوں پر نگاہ پینی ڈالی ہے۔ یہ سفرنامہ مولانا کے مشاہدہ کی گہرائی اور گیرائی کا غماز ہے اور ''کونوا قوامین بالقسط'' کی عملی تفسیر بھی۔

مولانا کو اللہ تعالیٰ نے کام کا بڑا میدان دیا ہے۔ وہ اکابر کی امانت مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ

کے پرنسپل ہیں۔ جو بڑا پر کشش، گراں بار اور گراں قدر عہدہ ہے۔ مولانا کے وقت میں اس عہدہ کی معنویت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ مولانا نے اپنے عہد میں اس ادارہ کی صوری ومعنوی ترقی کے لئے خلوص سے کام کیا ہے اور اس خلوص کے اثرات تعمیرات پر بہت واضح اور نمایاں ہیں، شعبۂ حفظ کا بھی اپنا ایک وقار قائم ہوا، مولانا ''السعی منی'' کے مکلف ہیں اور ''اتمام'' ''تو'' ''من اللہ'' ہوا کرتا ہے۔ توقع ہے کہ مولانا کی سعی دوسرے محاذ پر بھی مشکور ہوگی اور یہ توقع اس لئے ہے کہ مولانا کو مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ سے عشق ہے۔ بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے نصاب ومدارس ملحقہ کے نظام کار سے محبت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں بھی اس کا ذکر آتا ہے، مولانا کا قلم وجد کرنے لگتا ہے اور کوئی بھی موقع وہ اس کی افادیت واہمیت کے ذکر کا، ضائع نہیں کرتے، اپنی مادر علمی سے محبت صالح ذہن کی علامت ہے۔ اور مولانا کی تحریروں میں یہ علامت جھلکتی ہی نہیں چھلکتی بھی ہے۔

مولانا کا اشہب قلم رواں اور عزم وحوصلہ جواں ہے، اس روانی اور جوانی کی دوامی صحت وسلامتی کی دعا پر اس مضمون کا اختتام کرتا ہوں۔

☆ نائب ناظم امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ

(۳)

# محبت واخلاص کے پیکر...... مولانا ابوالکلام قاسمی

انوارالحسن وسطوی

مولانا ابوالکلام ایک عالم دین، استاذ، مصنف، محقق، مؤرخ، مفکر اور دانشور کی حیثیت سے صوبہ بہار میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ بلاشبہ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں۔ انھوں نے بحیثیت مصنف ومحقق جو شہرت حاصل کی ہے وہ بہت کم لوگوں کو مقدر ہوتا ہے۔ یوں تو ''اردو'' اور ''عربی'' زبان میں مولانا کی تقریباً دو درجن کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں لیکن ان تمام کتابوں میں ''تذکرہ علمائے بہار'' اور ''تحریک آزادی میں علمائے کرام کا حصہ'' بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ اپنی ان تصانیف کے سبب مولانا قاسمی عرصۂ دراز تک یاد رکھیں جائیں گے۔ ان کی تصانیف ''تین ہفتے امریکہ میں'' (سفرنامہ) سفرناموں کی تاریخ میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب امریکہ کے سفر میں حاصل کئے گئے مولانا کے مشاہدات وتجربات پر مبنی ایک دلچسپ دستاویز ہے۔ کتابوں کے علاوہ مولانا کے مضامین ومقالات کی تعداد بھی سیکڑوں میں ہے جو مختلف رسائل واخبارات کی زینت بن چکے ہیں اور جنہیں یکجا کر کے کتابی شکل دینے کی ضرورت ہے۔ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ کے پرنسپل کی حیثیت سے انھوں نے اس تاریخی تعلیمی ادارہ کی جو خدمت کی ہے وہ کم قابل تعریف نہیں ہے۔ مولانا کا شمار صوبۂ بہار کے صاحب الرائے دانشور میں ہوتا ہے۔ مسئلہ مذہبی ہو یا سیاسی، مولانا قاسمی بڑی بے باکی سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ اپنی تعلیمی خدمات کی بنا پر وہ ۱۹۹۹ء

ء میں یوم اساتذہ کے موقع پر صدر جمہوریہ ہند کے ہاتھوں صدارتی ایوارڈ سے سرفراز کئے جاچکے ہیں۔ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کی جانب سے ۱۹۹۷ء میں وہ وزیر تعلیم حکومت بہار کے ہاتھوں بھی ایوارڈ سے سرفراز ہوچکے ہیں۔

مولانا ابوالکلام قاسمی جہاں ایک جید عالم دین، مستند محقق، لائق استاذ اور معروف دانشور کی حیثیت سے اپنی پہچان رکھتے ہیں وہیں اپنی سیرت واخلاق کی بنا پر عوام وخواص کے درمیان بہت مقبول ہیں۔ وہ نرم مزاج، شیریں گفتار، ملنسار اور خوش اخلاق واقع ہوئے ہیں، بلکہ انہیں محبت و اخلاص کا پیکر کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ ۲۰۰۱ء سے قبل تک ان سے کبھی میری بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ میں نے صرف دور دور سے دیکھا اور سنا تھا۔ ۲۰۰۱ء میں انجمن ترقی اردو، ویشالی نے اپنے دھرتی کے لعل مولانا مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی استاذ مدرسہ احمدیہ ابا بکر پور (ویشالی) کی علمی وادبی خدمات پر حاجی پور میں ایک سمینار کرنے کا فیصلہ لیا تھا۔ واضح ہو کہ ۵، ستمبر ۲۰۰۱ء کو مفتی صاحب موصوف اپنی تعلیمی خدمات کی بنا پر صدر جمہوریہ ہند مسٹر کے آر نرائنن کے ہاتھوں صدارتی ایوارڈ سے نوازے گئے تھے۔ یہ نہ صرف مفتی صاحب کے لئے بلکہ تمام باشندگان ویشالی کیلئے خوشی کا موقع تھا جس کا اظہار مختلف صورتوں میں ہورہا تھا۔ کہیں انہیں استقبالیہ دیا جارہا تھا اور کہیں ان کے اعزاز میں نشست منعقد ہورہی تھی۔ انجمن ترقی اردو ویشالی نے باضابطہ ان کی علمی وادبی خدمات پر ایک عمدہ سا سمینار کرنے کا فیصلہ لیا۔ سمینار کے لئے ۲۱ / اکتوبر ۲۰۰۱ء کی تاریخ طے کی گئی۔ سمینار کی اہمیت کے پیش نظر اس کی صدارت کے لئے ایک بڑی علمی شخصیت کو مدعو کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ہم لوگوں کی نظر میں مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی، پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ اس کے لئے موزوں ترین شخصیت نظر آئے۔ راقم السطور اور ڈاکٹر ممتاز احمد خاں صدر انجمن ترقی اردو ویشالی مولانا ابوالکلام قاسمی صاحب سے ملنے اور سمینار کی صدارت کے لئے انہیں مدعو کرنے پٹنہ گئے۔ مولانا قاسمی نے نہایت خوشدلی سے ہماری دعوت قبول فرمائی اور بڑی محبت سے ہمیں چائے پلوائی۔ انہوں نے انجمن ترقی اردو، ویشالی کی سرگرمیوں اور اس کی اردو تحریک کی بھرپور ستائش کی۔ اس پہلی بالمشافہ ملاقات نے ہمیں ان کی شخصیت سے متاثر ہونے کا موقع فراہم کیا۔ ہم لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ واقعی ''نہد شاخ

پر میوہ سر سبز'' والا مقولہ مولانا ابوالکلام قاسمی کی ذات پر بھی یقیناً صادق آتا ہے۔ مولانا قاسمی حسب وعدہ سمینار میں تشریف لائے۔ سمینار کی صدارت فرمائی اور اراکین انجمن ترقی اردو ویشالی کا حوصلہ بڑھایا۔ میں یہاں مولانا موصوف کی صدارتی تقریر کے ان جملوں کو نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس سے مولانا کی حق گوئی اور ان کی وسیع القلبی کا اندازہ ہوتا ہے:

''زندگی میں ہی کسی کی عظمت اور بڑائی کا اعتراف کرنا چاہئے۔ مرنے کے بعد اعتراف کرنا تو ایک روایت ہو کر رہ گئی ہے۔ انجمن ترقی اردو، ویشالی نے مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی کی زندگی میں ان پر سمینار منعقد کر کے روایت سے جو بغاوت کی ہے اس کے لئے انجمن ہذا کے اراکین مبارکباد کے مستحق ہیں۔''

(روزنامہ سنگم، پٹنہ ۲۴/اکتوبر ۲۰۰۱ء)

مولانا ابوالکلام قاسمی کی محبت و اخلاص کا ایک قابل ذکر واقعہ جو میرے ذہن میں نقش ہو کر رہ گیا ہے اور جسے میں بھلائے نہیں بھول سکتا۔ دسمبر ۲۰۰۱ء کی بات ہے، رمضان کا مہینہ تھا۔ غلام سرور کلینک، بھکنا پہاڑی، پٹنہ ۶ میں ڈاکٹر ایم اعجاز علی (سرجن) کے ہاتھوں میری اہلیہ کے پیٹ کا آپریشن ہوا تھا۔ اہلیہ کی دیکھ ریکھ کے لئے مجھے دس دنوں تک کلینک میں رہنا پڑا تھا۔ اس دوران نماز پنجگانہ کی ادائیگی کے لئے نوری مسجد میں جایا کرتا تھا۔ ایک دن عصر کی نماز کے وقت حسب عادت خوش خلقی سے ملے اور حال احوال دریافت کیا۔ میں نے اپنی اہلیہ کے آپریشن ہونے اور غلام سرور کلینک میں ان کا زیر علاج رہنے کا ذکر کیا۔ انہوں نے مریضہ کی صحتیابی کی دعاء کی اور کہا انشاء اللہ پھر ملاقات ہوگی۔ مجھے صحیح یاد نہیں کہ اسی دن یا اس کے دوسرے دن مولانا ابوالکلام قاسمی بعد نماز مغرب کلینک تشریف لائے اور وہ کمرہ تلاش کر کے مجھ ناچیز تک پہنچے، جہاں مریضہ ایڈمٹ تھی۔ انھوں نے خیریت دریافت کی اور کہا ''اگر میری کوئی ضرورت محسوس کریں تو بلا تکلف کہیں''۔ میں نے مولانا کے ہمدردانہ کلمات کے لئے ان کا شکریہ ادا کیا۔ گرچہ کلینک میں مریضہ کی بیمار پرسی کے لئے حاجی پور سے پٹنہ تک میرے کئی رشتہ دار آئے اور احباب تشریف لائے تھے۔ اگر چہ میں تمام لوگوں کا مشکور ہوں لیکن مولانا ابوالکلام قاسمی صاحب کے حسن اخلاق نے مجھ پر گہرا تاثر چھوڑا، کیوں کہ مولانا سے نہ کوئی میری رشتہ داری اور نہ کوئی گہرے روابط ہی ہیں۔ بس چلتی پھرتی مختصر سی ملاقات

ہے۔ایسی ملاقات تو سیکڑوں اور ہزاروں لوگوں سے ہوتی رہتی ہے لیکن انسان ہر کسی کی بیمار پرسی اور مزاج پرسی عموماً نہیں کر پاتا ہے۔میں نے محسوس کیا کہ واقعی مادہ پرستی کے اس دور میں مولانا ابوالکلام قاسمی جیسے لوگ ہیں، نبی کی سنت کو زندہ رکھنے والوں میں شمار کئے جاسکتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام قاسمی کی شخصیت کے تمام پہلوؤں تک گرچہ میری رسائی نہیں ہے، پھر بھی انہیں جس قدر جانتا ہوں اس کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ مولانا ایک مثالی شخصیت کے مالک ہیں۔پرنسپل کے عہدے پر فائز رہنے کے باوجود مولانا نے خود کو ایک عوامی انسان بنا رکھا ہے۔ان کی شخصیت میں نہ کوئی تکلف ہے اور نہ تصنع، نہ اپنے عہدہ، منصب اور اپنے علم کا کوئی فخر اور غرور ہے۔ہر شخص سے خندہ پیشانی سے ملنا ان کی فطرت میں شامل ہے۔وہ پٹنہ کے ہر علمی، ادبی اور مذہبی مجلسوں میں عام سامعین کے درمیان بیٹھے ملیں گے۔مولانا سے اکثر میری ملاقاتیں ان ہی محفلوں میں ہوتی ہیں۔خاص طور پر امارت شرعیہ کی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں تو پابندی سے ان سے ملاقات ہوتی ہے۔ان سے مل کر مجھے یک گونہ خوشی محسوس ہوتی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ مادہ پرستی کے اس دور میں مولانا ابوالکلام قاسمی جیسے مخلص اور بے لوث لوگ کم ہی ملتے ہیں۔دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ مولانا کا سایہ تادیر ہمارے سروں پر قائم رکھے اور وہ مزید علمی، ادبی اور مذہبی خدمات انجام دے کر ملت کے کام آتے رہیں:

ے تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

☆ آشیانہ کالونی حاجی پور، ویشالی (بہار)

(۴)

# پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے؟

صفی اختر، نئی دہلی

حضرت امام شافعیؒ کا قول ہے کہ ''صاحب علم آدمی موت کے بعد بھی زندہ باقی رہتا ہے، اگرچہ ان کی رگیں موت کے بعد مٹی کے پیچھے ریزہ ریزہ ہوجاتی ہیں''۔ علم اور جہل میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یقیناً علم ایک نور ہے اور جہالت، ظلم اور تاریکی ہے، لہٰذا مدرس اور طالب علم جو کچھ پڑھے پڑھائے، اس پر عمل بھی ہو اور ایسے ہی علماء مرجع خلائق بنتے ہیں۔ اب وقت بھی نہیں کہ آپ حجروں میں آرام کریں، خلوتوں میں وقت گزاریں اور اپنی کوششوں کو صرف اپنے نجات تک محدود رکھیں۔ ضرورت ہے کہ میدان میں نکلیں اور مسلمانوں کی سپہ داری رسپہ سالاری کا فریضہ بھی انجام دیں۔

بہرحال میرے سامنے اس وقت برادر عزیز مولانا محمد صدر عالم ندوی، اماموری، ویشالی (بہار) کی مرتب شدہ کتاب ''مولانا ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی شمسی (سابق پرنسپل مدرسہ شمس الہدی پٹنہ): نقوش وتاثرات'' کا مکمل مسودہ سامنے ہے اور مرتب کے ساتھ خود مولانا ابوالکلام قاسمی صاحب کی یہ خواہش ہے کہ خاکسار بھی اپنا تحریری تاثر پیش کرے، یقیناً جس انداز سے انہوں نے مجھ پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا ہے، اس پر میں قطعی کھرا نہیں اترتا، تاہم حکم کی بجا آوری اور پھر یہ خیال

کہ مولانا محترم کی توقعات پر پورا اتر سکوں، میرے لئے ایک امتحان بھی ہے۔

حضرت مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی صاحب ہمارے لئے بے حد محترم ہیں۔ان کی شخصیت کے کن گوشوں پر گفتگو کروں اور کن پہلوؤں کو چھوڑوں، یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے، جن شخصیات نے بھی مولانا محترم کے تعلق سے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے اسے مزید دوہرانے سے کوئی فائدہ بھی نہیں۔ اس وقت نہ تو اس کتاب کے متنی تجزیہ (Textual Analysis) کی ضرورت ہے اور نہ ہی اپنی جانب سے بے جا تبصرہ کی۔ بہار ہی کیا برصغیر کی ایک معتبر شخصیت، ڈاکٹر کلیم عاجز صاحب پٹنہ کے ان جملوں کے حوالے سے کہ؛ ''تبصرہ کا رواج عام ہے، جس پر چاہے رائے دو، جو چاہے دے دے اور جیسی رائے چاہے دے دے، کوئی رائی ہے نہ دہائی ہے'' کے تناظر میں مرتب کتاب سے عرض کروں کہ میں خود کو اس لائق ہی نہیں پاتا کہ ایسی کتاب پر جو ایک صاحبِ علم وفضل پر مرتب کی گئی ہے کچھ بھی تبصرہ کی جسارت کروں۔

حضرت مولانا شمسی صاحب بہار کے ان علماء میں سے ہیں جن کی طویل ترین خدمات ہیں اور اپنی طویل جد وجہد سے بڑے مفید امور سرانجام دیئے ہیں۔تدریسی میدان میں جہاں ان کی لمبی خدمات ہیں وہیں علمی تالیفات بھی ناقابل فراموش ہیں۔اپنی عالمانہ، فاضلانہ وعلمی لیاقتوں کی بنیاد پر اگر کسی شخص کو ''ابوالکلام'' کہا جاسکتا ہے تو مولانا محترم کا نام بھی اس سانچے میں فٹ ہوتا ہے۔ مولانا نے بہار میں متعدد علمی وادبی پرگراموں کو ازخود آرگنائز بھی کیا اور دیگر اداروں کے پرگراموں میں بھی اپنے وجود سے روشنی عطا کی۔تاریخ، لسانیات ودرسیات نیز مذہبی، معاشرتی اور دیگر امور ومسائل پر بہت کچھ لکھا اور جہاں جہاں ضرورت آن پڑی، اپنی جرأتمندانہ آراء سے کبھی پیچھے نہیں ہٹے۔، ان کی اصابت رائے کا کئی حضرات تذکرہ فرما چکے ہیں۔

مولانا موصوف نے عربی میں جو کچھ تالیف فرمایا، ان کے ماخذ سے خاکسار واقف نہیں تاہم اردو کی تصانیف میں 500/ اہم ترین ایسے علمائے دین وادب کا ذکر ''تذکرہ علمائے بہار'' (جلد اول) میں کیا ہے وہ قابل تعریف ہے، یہ کتاب 1994 میں شائع ہوئی۔اس کی دوسری جلد بھی 2006 میں شائع ہوئی اور تیسری جلد زیر طبع ہے۔اس کتاب میں ایسے علمائے دین کا تذکرہ کیا

گیا ہے جن میں بعض اصحاب تو صاحبِ دیوان شعراء میں سے ہیں۔ مجھے سفرناموں کے مطالعے کا بھی ذوق ہے، اچھے سفرناموں کے پڑھنے کا اکثر اشتیاق بھی رہتا ہے۔ مولانا محترم نے مجھے اپنا ایک سفرنامہ ''تین ہفتے امریکہ میں'' (2004) بصد محبت پیش بھی کیا تھا جس کے مطالعے کا شرف حاصل ہوا اور جس سے یہ جاننے میں مدد ملی کہ امریکہ کے مذہبی ادارے، اسلامک سینٹرز و اسلامی تنظیموں کا کیا انداز ہے، مولانا کا اسلوب رواں اور شگفتہ ہے۔ انتہائی جاذبیت اور اختصار سے موضوعات کو سمیٹ لینے میں مہارت تامہ حاصل ہے۔ مولانا کی تقریباً 21 رکتابیں رکتابچے زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں۔ جن میں 7 رکتابیں رکتابچے عربی زبان میں بھی ہیں، علاوہ ازیں مشاہیر بہار کے خطوط، تذکرہ علمائے بہار (جلد سوم) بہار کی اردو شاعری میں علماء کا حصہ اور مقالات قاسمی زیر طبع ہیں، خداوند کریم مولانا محترم کو درازیٔ عمر عطا کرے، آمین!

آج علم کا مذاق کم ہی نہیں مفقود تر ہوتا جا رہا ہے، علمی شغل سے لوگ دور ہوتے جا رہے ہیں۔ دنیا روز افزوں علمی انحطاط کی طرف جا رہی ہے، اب صرف تلاش روزگار اور دنیاوی لہو ولعب کا دور دورہ اور وہاٹس ایپ وسوشل میڈیا کی اہمیت دو چند ہوگئی ہے، پڑھے لکھے لوگوں میں بھی اب اس کی ایسی چاٹ بڑھی ہے کہ علمی اشتغال سے وہ دُور ہوتے جا رہے ہیں، الّا ماشاءاللہ چند گنے چُنے لوگوں کے سوا۔ جو لوگ کبھی سوسائٹی کا نمک ہوتے تھے، ان کی چیزوں سے بھی استفادہ کا وقت نہیں رہا، ہر فرد مشغول ہے اور وقت کا رونا رو رہا ہے۔

علامہ شبلی نعمانیؒ اپنی ایک تصنیف ''سفرنامہ روم ومصر وشام'' میں ایک جگہ یوں رقم طراز ہیں:

> ''یوں بھی دنیائے اسلام میں تعلیم کا طریقہ ایسا ابتر اور ذلیل ہوگیا ہے کہ چند درسی کتابوں کے سوا لوگوں کو کسی قسم کی جدید معلومات کی طرف رغبت ہی نہیں ہوتی، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جدت اور ایجاد کا مادہ قوم سے مسلوب ہوتا جاتا ہے اور جس قدر کہیں کہیں کچھ رہ گیا ہے، آئندہ اس کی بھی امید نہیں''۔

بہرحال مسلمان مغربی علوم میں گو ترقی کے کسی رتبہ تک پہنچ جائیں لیکن جب تک ان میں مشرقی تعلیم کا اثر نہ ہو، ان کی ترقی مسلمانوں کی ترقی نہیں کہی جاسکتی۔ مولانا کی تحریروں میں راستبازی، اور دیانت کا پتہ چلتا ہے، لباس اور وضع عالمانہ اور صورت سے قوی وتنومند نظر آتے ہیں۔

آپ تقدس اور شریفانہ اخلاق کی مجسم تصویر ہیں، آپ کا اخلاق وسیع اور فیاضانہ ہے، نخوت، ترفع اور کم بینی ان میں نام کو نہیں دیکھی۔ کبھی جب دہلی آیا کرتے تو اس حقیر کو بھی ملاقات کا شرف حاصل ہوتا۔ ہر چند کہ میری ملاقات کا یہی ذریعہ رہا، تاہم بعض امور کی نسبت مجھ کو بالکل یقین ہے کہ ان کے متعلق جو میری رائے ہے، دیگر اہل تعلق کی بھی بعینہٖ وہی ہوگی۔ تاہم ہر شخص کو اپنے اپنے انداز سے سوچنے کی آزادی ہے، ہر کسی سے موافقت ضروری بھی نہیں اور دنیا کی یہی ریت بھی ہے۔

مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی زید مجدہ سے علیک سلیک کے مواقع ضرور ملے لیکن بہت نشست و برخاست نہ ہوسکی، تاہم ان کی تحریروں کے حوالے سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے روزمرہ کی زندگی کے واقعات، چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے سیاسی ومعاشرتی امور ومسائل پر اپنی نگاہ ضرور دوڑائی، مزید برآں ان کی تفہیم وتشریح کو اپنی تصانیف کے ذریعہ شگفتہ انداز میں بیان بھی کیا۔ ان کے اندر خود اعتمادی، سیاسی بصیرت اور دانشورانہ دور اندیشی بھی ہے۔ انہوں نے اردو زبان وادب کے سپاہی کی طرح زبان اردو کی بھی غیر معمولی خدمات انجام دی ہیں۔

اسلاف کی عظمت، اکابر سے محبت، اہل علم کی قدر شناسی اور علمائے کرام کا تذکرہ نیز اپنے خردوں کی علمی تگ ودو اور ان کی سرگرمیوں کو بہ نظر تحسین دیکھنا نیز ان کی حوصلہ افزائی کرنا وغیرہ ایسے پاکیزہ اوصاف ہیں جو مولانا موصوف میں بدرجۂ اتم موجود ہیں، جن کا ہمیں اعتراف کرنا چاہئے۔ انہی چیزوں سے معاشرہ کا توازن قائم رہتا ہے اور ان چیزوں پر عامل لوگوں کو رب کائنات رفعت وعزت بھی عطا فرماتا ہے۔

اسی ضمن میں مولانا محمد صدر عالم ندوی (مرتب کتاب) کی تحسین میں گویا ہوتے ہوئے مجھے بجا طور پر یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ یہ ایک مفید، ٹھوس اور گراں بار ذمہ داری انہوں نے قبول کی ہے، لہٰذا بڑی ناسپاسی ہوگی اگر ان کے حوصلہ کی داد نہ دی جائے کہ انہوں نے مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی زید مجدہٗ کی قدر افزائی کے حوالے سے عامۃ الناس اور نسل نو کے لئے ایک عملی دروازہ وا کیا ہے جو مولانا کی تصنیفات سے فائدہ اٹھانے میں ان شاء اللہ مددگار ثابت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ اُن کی اِن کاوشوں کے لئے انھیں اجر جزیل نصیب فرمائے۔ آمین!

پیشِ نظر مسودہ کتاب کے حصوں کے استناد پر کوئی گفتگو کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا، ایسا بھی نہیں ہے کہ ابن رشد نے جس طرح ارسطو کی تصانیف کا مفید اور جامع خلاصہ پیش کیا، کسی کی کیا مجال کہ ایسی کوئی چیز پیش کر سکے۔ اس وقت میرے نوک قلم پر جابجا جو کچھ بھی آ گیا ہے، اسے جگہ دے دی گئی ہے، ورنہ میں کیا اور میری بساط ہی کیا؟ مولانا نے ''تسہیل القرآن'' (آسان ترجمہ قرآن کریم) و''تسہیل النحو'' کے ساتھ ساتھ تفسیر قرآن مجید کے انتہائی نازک امور بھی اپنے ذمہ لے رکھے ہیں، خداوند کریم انہیں صحت مسترہ نصیب فرمائے۔ آمین، ان کے علمی کدوکاوش، تعمق اور گہرائی وگیرائی کا مجھے کسی درجہ ادراک ہے، دعاء گو ہوں صحت مندی وتوانائی اُن کا نصیبہ بنے اور عام لوگوں کی نفع رسانی کے لئے وہ اور بھی بہتر چیزیں منظر عام پر لاسکیں، کاش کہ مولانا محترم کی جملہ تصانیف، اس پُرآشوب دور میں دین وعقبی کے لیے باعث رہنمائی وہدایت بن سکے اور عام انسانوں کو فائدہ پہنچے نیز دربھنگہ ضلع کو مزید عزووقار حاصل ہو، اور اللہ رب العالمین ان کے کاموں کو شرف قبولیت سے بخشے، آمین۔

رانچی (جھارکھنڈ) کے ایک قادر الکلام شاعر، اظہر عنایتی کے اس شعر کا اطلاق، مولانا محترم کی ذات سے وابستہ کرتے ہوئے یہ سعادت حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ؛

مری آواز کو محفوظ کرلو　　　کہ میرے بعد سناٹا بہت ہے!

آخر میں ان چند معروضات کے بعد مرزا غالبؔ کے ایک معرکہ آراء شعر کے ساتھ اپنی غیر مربوط تحریر پر اپنی بات کا اختتام کرتا ہوں کہ؛

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

(مضمون نگار: صحافی وکالم نویس اور آل انڈیا ملی کونسل کے سکریٹری امور انتظامی ہیں)

(۵)

# مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی۔ کتاب زندگی کے چند اوراق

مولانا مفتی مستقیم ندوی

یہ عالم آب وگل ہر زمانہ میں ایسی شخصیتوں سے معمور رہا ہے جن کی زندگی کا مقصد مال ودولت کا حصول، شہرت وناموری کی فکر اور جاہ ومنصب کی خواہش نہیں ہوتی، بلکہ وہ اپنی عمر عزیز کا ہر لمحہ خدا کی عطا کردہ نعمت اور تحفہ تصور کرتے ہوئے بندگان خدا کی خدمت اور خدا ورسول کی رضا وخوشنودی کی طلب وجستجو میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں۔اسی وجہ سے ہر زبان پر ان کا ذکر خیر اور ان کے لئے کلمۂ تحسین ہوتا ہے۔مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی بھی ان ہی خوش قسمت اور باتوفیق ہستیوں میں سے ایک ہیں، جنہوں نے اپنی زندگی خلق خدا کی خدمت کے لئے وقف کررکھی ہے۔

مولانا ابوالکلام صاحب میرے ہم وطن بھی ہیں اور ہم مخدوم ومحسن بھی، اگر چہ باقاعدہ مجھے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا شرف حاصل نہیں ہوا، لیکن پھر بھی انہیں اپنے اساتذہ کی صف میں شمار کرتا ہوں۔آپ کی جائے پیدائش موضع دوگھرا، ضلع دربھنگہ صوبہ بہار ہے جو ایک مشہور اور مردم خیز مسلم آبادی اور دینی مذہبی تعلیم میں امتیازی حیثیت کا حامل خطہ ہے۔اس خاک کے ذروں سے بڑی جلیل القدر اور ناقابل فراموش ہستیاں اٹھی ہیں۔مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی ان ستاروں کی جھرمٹ میں ایک نیر تاباں درخشاں ستارہ کی حیثیت رکھتے ہیں، جو آسمان علم وفضل پر درخشاں ہے اور اپنی تابانی کرنیں بکھیر رہا ہے۔آپ کی پوری زندگی تعلیم وتعلم، درس وتدریس، تصنیف وتالیف اور خدمت خلق سے عبارت ہے اور آپ بھی اسی کوچہ سے وابستہ ہوکر دین وعلم اور ملک وقوم کی خدمت میں

ہمہ تن مشغول ہیں۔ مولانا کی شخصیت بڑی گوناگوں خصوصیات، متنوع اوصاف وکمالات اور مختلف فضائل ومحاسن سے مزین اور آراستہ ہے، وہ ایک سچے سماجی خدمت گار اور رضا کار ہونے کے ساتھ ایک مقبول مدرس، بہترین مربی، عمدہ ماہر تعلیم ہیں، بحث وتحقیق اور علم وفن کے شیدائی اور اس میخانہ کے بادہ کش ہیں۔ ان کی خدمات کی قدردانی اور اعتراف میں حکومت ہند نے انہیں صدر جمہوریہ ایوارڈ سے بھی نوازا ہے۔ وہ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ میں بالتدریج کئی عہدوں پر فائز رہ کر اس کے اعلیٰ عہدہ تک ترقی کی۔ اپنی برابر تگ وتاز اور جہد مسلسل کے نتیجہ میں آج وہ اس ادارہ کی سربراہی کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور ایک پرنسپل کی حیثیت سے اپنی ساری علمی توانائیاں اور انتظامی صلاحیتیں اس کی ترقی میں صرف کررہے ہیں۔ ان کے دور انتظام وانصرام میں اس مدرسہ نے جو بہار بورڈ کا مرکزی، منفرد اور ممتاز ادارہ ہے، قابل ذکر ترقی کی منزلیں طے کی ہیں۔ تعجب اور کمال کی بات یہ ہے کہ ان تمام خدمات اور انتظام کی ساری ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ تصنیف وتحقیق سے مولانا کا بڑا گہرا تعلق اور ربط ہے۔ ان کا قلم متحرک وسیال رہتا ہے اور ہمیشہ کچھ نہ کچھ ان کے زیر تحریر ہوتا ہے۔ اب تک ان کے اثر خامہ سے درجنوں تصنیفات وتالیفات منظر عام اور منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوکر خراج تحسین حاصل کرچکی ہیں۔ ان کی تصنیفات سے ان کے تبحر علمی، دور بینی، علمی گہرائی وگیرائی اور وسعت مطالعہ ودقت نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کی تصنیفات میں ایک قابل قدر اور علمی حلقوں میں زندہ وتابندہ کتاب ''تذکرہ علمائے بہار'' ہے جو انہوں نے بڑی سلیقہ مندی، خوش اسلوبی، ژرف نگاہی اور محنت وکاوش سے مرتب کی ہے، علاوہ ازیں ان کے علمی، دینی وتحقیقی مضامین ہندوستان کے مختلف رسائل وجرائد کی زینت بنتے رہتے ہیں، جن سے ہر طبقہ اور مختلف مکتب فکر کے افراد واشخاص یکساں طور پر مستفید ہوتے رہتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام صاحب قدیم وجدید کا ایسا حسین سنگم ہیں، جہاں دونوں دریاؤں کے دھار آکر آپس میں مل جاتے ہیں، ایک طرف وہ مذہبی علوم ومعارف کے عالم اور رمز شناس ہیں تو دوسری طرف جدید علوم کے بہت سارے آراء وخیالات کے واقف کار بھی ہیں، ساتھ ہی ساتھ صاحب فکر ونظر بھی ہیں اور قوم وملت کے پاسباں بھی۔ بلاشبہ مولانا ''دین ودنیا بہم آمیز کہ اکسیر شہود'' کے

مصداق ہیں، عصر حاضر کے تقاضوں اوراس کی ضرورتوں کو سمجھنے کے لئے انگریزی وہندی زبان سے ضروری واقفیت اور صلاحیت بھی ہے۔ چنانچہ آپ کا شمار مراکز دینیہ کے علمی وتعلیمی حلقہ میں ممتاز شخصیتوں میں ہوتا ہے۔ عصری تعلیم کے ماحول میں قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، اخلاق بڑے کریمانہ اورسیرت وکردار پاکیزہ ہیں، ہر شخص سے حسب مراتب محبت وشفقت اورخندہ پیشانی کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ آپ کا ایک امتیازی وصف اور خاص جوہر اعلیٰ ظرفی اورفراخ دلی ہے، ہر شخص کی عزت نفس کا بھرپور خیال اور آزادی کا پورا لحاظ کرتے ہیں۔ اللہ نے آپ کو سلامت طبع، ذہنی فکری اعتدال وتوازن، تواضع وانکساری، شرف علم اور شرافت نفس کی دولت سے بہرہ ور اوراس کا حظ وافر عطا کیا ہے۔ آپ ہر ایک کے مرتبہ شناس اور قدرداں ہیں۔ رواداری، اخلاق مندی، بلند کرداراور وسیع المشربی کی وجہ سے اہل تعلق اور وابستگاں کا دائرہ وسیع ہے، ہر صنف اور طبقہ کے لوگوں سے خوشگوار تعلقات ہیں، اس لئے کسی بھی حلقہ فکر میں اجنبی معلوم نہیں ہوتے ہیں، بلکہ سب میں مقبول رہتے ہیں، مولانا اگرچہ ہندوستان کی شہرۂ آفاق درسگاہ دارالعلوم دیوبند کے فیض یافتہ ہیں، لیکن بڑے وسیع القلب اور کھلے ذہن کے ہیں، ملنے والا خواہ کسی بھی طبقہ کا ہو، اس سے بڑی بشاشت کے ساتھ ملتے ہیں۔ اس کی خوبیوں کو سراہتے ہیں اوراچھائیوں کی تعریف کرتے ہیں۔ جدید دینی مسائل میں وسعت، رواداری اور شریعت کے حدود میں رہ کر آزادی فکر ونظر کے قائل ہیں، تاکہ نئے پیش آمدہ مسائل کا حل اور مشکلات سے امت کو نکالا جاسکے، مولانا بڑے دل آویز، متحمل مزاج اور بردبار ہیں۔ گفتگو بڑے متحمل اور ٹھہراؤ کے ساتھ کرتے ہیں۔ دوران گفتگو آواز کبھی اونچی نہیں کرتے اور نہ لہجے میں کوئی تلخی وترشی یا ناگواری پائی جاتی، آپ کی بڑی خوبی یہ ہے کہ سب کی ہمدردی وخیرخواہی پر نظر رہتی ہے۔ کسی کی بدخواہی، دل آزاری اور توہین وتنقیص تو دور کی بات، اس کا خیال تک نہیں آتا۔ نہ کسی بات پر ناراض ہوتے ہیں اور نہ کسی کے خلاف نازیبا الفاظ استعمال کرتے ہیں، بڑوں کا ادب اور چھوٹوں پر شفقت فرماتے ہیں، ہر ایک کی دلجوئی اور دل داری کرتے ہیں، نوجوانوں کی ہمت افزائی کرکے انہیں آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتے ہیں، ہمیشہ ان کی ترقی وکامیابی کے لئے فکر منداور آرزومند رہتے ہیں، ان کو مفید اور مخلصانہ مشورہ

دیتے ہیں۔ علمی کام کا برابر شوق دلاتے رہتے ہیں۔ ان کی خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے اور مشکلات ودشواریوں میں سہولت بہم پہنچاتے ہیں، ان کی رہنمائی فرماتے رہتے ہیں۔ مولانا کی طبیعت میں بے حد سادگی، تواضع اور فروتنی ہے، زندگی کے مختلف مراحل میں نامساعد حالات سے بھی دوچار ہوئے اور بدخواہوں نے بھی اپنی بدخواہی سے تنگ کیا، جس سے وہ ملول خاطر بھی ہوئے، لیکن غالب کی طرح ''دوستی اس بت بدخو سے نباہیں کیونکر'' پر عمل ہی نہیں کیا بلکہ بت ہاں بدخو سے مدارات اور تعلق خاطر قائم رکھا، میری نظر میں اسی خوبی نے انہیں اپنے معاصرین میں ممتاز کردیا، یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت مخالفین اور بدخواہوں کے لئے بھی کشش کا باعث اور اپنوں کے لئے سرمایۂ افتخار ونازش ہے۔ آپ آہنی عزم وحوصلہ اور اعلیٰ کردار کے حامل ہیں اور ہر کام خلوص ولگن کے ساتھ کرنے کے عادی ہیں، مشکل سے مشکل حالات میں بھی آپ کے پائے ثبات واستقلال میں لغزش نہیں آئی، دیگر رفاہی امور کے علاوہ مولانا نے کئی سماجی ورفاہی مفید کام اپنے گاؤں میں بھی سرانجام دیئے، ان میں مساجد کی تعمیر وتوسیع، قبرستان کی اصلاح ومرمت اور جلسہ ہائے اصلاح ومعاشرہ قابل ذکر ہیں، ان تمام کاموں میں قابل قدر دلچسپی لی اور سرمایۂ کی فراہمی میں اپنی خدمات بلاتکلف پیش کیں، مولانا کو اپنے گاؤں کے مدرسہ قاسم العلوم حسینیہ دوگھرا در بھنگہ کے عروج وترقی اور اس کے استحکام وبقا اور تعلیمی نظام کو بہتر بنانے اور ترقی دینے کی بڑی فکر رہتی ہے۔ اس سلسلہ میں صرف اپنے رفقاء سے ہی مشورہ وتبادلۂ خیال پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ خردوں کو بھی شریک رکھتے اور ان کے مفید مشوروں کو قبول کرکے ان کی عزت افزائی کرتے ہیں۔

مولانا کی کتاب زندگی کا سب سے روشن ورق جوان کی عظمت کا بلند مینار اور ان کے خلوص کے لئے دلیل اور سند اعتبار ہے بلکہ ان کے لئے وقار ومعیار ہے، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ایک بار مقامی الیکشن میں موقع پر گاؤں کے مسلمان آپسی گروہ بندی کے شکار ہوگئے لیکن مولانا نے شیرازہ بندی اور اتحاد اتفاق پیدا کرنے کے لئے بڑی انتھک کوشش کی، ماشاء اللہ مولانا کا عمل پیہم اور جہد مسلسل ثمر آور ہوا اور اس کے نتیجہ میں بحمد اللہ موضع دوگھرا کے تمام مسلمان آپس میں متحد ومتفق ہوکر اغیار کے لئے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کے مانند ہوگئے۔ مولانا کا قیام اکثر پٹنہ میں رہتا ہے، جب بھی

اپنے گاؤں آتے ہیں تو جمعہ کی نماز سے قبل ایک مختصر تقریر فرماتے ہیں جس میں عموماً گاؤں کے مسلمانوں کو آپس میں مل جل کر اور محبت سے زندگی گزارنے اور بغض وکینہ اور حسد سے دور رہنے، باہمی اتحاد واتفاق پیدا کرنے کی تلقین کرتے ہیں، مثالی سماج کی تشکیل اور خوشگوار ماحول کے وجود وتعمیر پر خصوصی زور دیتے ہیں۔ آپ دوگھرا گاؤں مشرقی عیدگاہ کے امام بھی ہیں۔ پہلے خطبہ کے بعد آخر میں موقع کی مناسبت سے کسی موضوع پر مختصر مربوط اور مؤثر تقریر کرتے ہیں۔ موضوع کا تعلق کردار کی تعمیر اور صالح معاشرہ کی تشکیل سے ہوتا ہے۔ ان کی زبان وبیان، طرز ادا، اسلوب کلام اور ہاتھ پاؤں اور چشم وابر کے حرکات وسکنات میں خطیبانہ ومقررانہ جوش وخروش اور انداز نہیں ہوتا، بلکہ زبان انتہائی سادہ، بیان بڑا سلیس ہوتا ہے، لیکن ان کا خلوص دل سے نکلنے اور گوش وہوش کے ذریعہ دل پر اترنے اور نہاں خانۂ دل میں اس کو جاگزیں کردینے اور اخلاق کو سنوارنے اور تابندہ تر کردینے والا ہوتا ہے۔

مولانا تجوید وقرأت اور مخارج کے پیچیدہ اصول کے پابند نہیں ہیں بلکہ سیدھے سادے انداز ولہجہ میں قرأت وتلاوت فرماتے ہیں۔ یہ آپ کی زندگی کا مختصر خاکہ اور آپ کی امنگوں وحوصلوں کا سرسری، اجمالی تعارف ہے، ورنہ آپ کی کتاب زندگی کے بہت سے جلی عناوین اور حیات مستعار کے بہت سے روشن پہلو ہیں، جن پر لکھنے اور انہیں منظر عام پر لانے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی صاحب قلم کو ان کڑیوں کی تکمیل اور سلسلوں کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

بلاشبہ مولانا کی ذات گرامی ایک شجر سایہ دار ہے، جو قوم وملت کے لئے خیر وفلاح کا ذریعہ، نئی نسل کے لئے مشعل راہ اور معاصرین کے لئے ایک قابل تقلید نمونہ ہے۔

آج یہ قوم وملت اور ہر علاقہ وحلقہ کو ایسے ہی افراد کار کی ضرورت ہے جو خدمت ملک وقوم کے لئے اپنے آپ کو وقف کردیں اور اپنے بعد والوں کے لئے ایک زندہ مثال اور فکر وعمل کے لئے گہرا نقش چھوڑ کر یہ باور کرا جائیں۔

مت سہل انہیں سمجھو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردہ سے انسان نکلتے ہیں

☆ استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

(٦)

# مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی ۔نقوش وتاثرات

محمد اشرف علی ندوی

یہ دور علمی لحاظ سے قحط الرجال کا ہے، یوں تو یہ دنیا انسانوں سے پٹی ہوئی ہے، متعدد مما لک میں کثرت آبادی کا رونا رویا جار ہا ہے، مگر علم وتحقیق، اخلاق وشائستگی اور کمال واختصاص کے انسانی بازار میں متاع گراں مایہ تلاش کیا جائے تو یہ جنس بہت کمیاب نظر آئے گی، لیکن ہندوستان کی سرزمین اس معاملہ میں ہمیشہ بڑی مردم خیز رہی ہے۔ یہاں کی مٹی سے وہ مشاہیر علماء، بڑے بڑے ادباء اور وہ باکمال مصنفین پیدا ہوئے، جن کے علم وفضل سے ایک زمانہ مستفید ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا، واقعہ یہ ہے کہ اس خاک کے ذرات سے پیدا ہونے والی شخصیتیں آسمان عالم پر ایک کہکشاں بن کرا بھری ہیں۔

صوبہ بہار کا ضلع دربھنگہ اپنی مردم خیزی میں کسی سے پیچھے نہیں رہا، یہاں کی مٹی سے وہ ممتاز ہستیاں ابھریں، جن کے علم کا لوہا پورے ملک نے مان لیا جن کے علم کی روشنی سے پورے پورے علاقے روشن ہوئے۔انہیں چند روشن ستاروں میں ایک نمایاں نام ''مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی (پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ) کا بھی ہے۔

مولانا کا تعلق ضلع دربھنگہ کے ایک ایسے علمی قصبہ سے ہے جسے لوگ دوگھرا کے نام سے جانتے ہیں۔ جو جالۂ بلاک سے متصل ہے، اور جہاں کے علماء کی ایک لمبی فہرست ہے۔ مولانا موصوف کی ولادت ۲۵ را کتوبر ۱۹۵۱ء میں اسی مردم خیز قصبہ میں ہوئی، ابتدائی تعلیم اور متوسط درجہ

کی تعلیم یہیں حاصل کی، اس کے بعد بہار مدرسہ بورڈ سے فاضل امتحان پاس کیا اور دارالعلوم دیوبند اور دیگر مستند اداروں کے اساتذہ سے بھی کسب فیض کیا۔ فراغت کے بعد کئی دینی مدرسوں میں تدریسی خدمات انجام دیئے، پھر مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے جونیئر سیکشن میں بحیثیت معاون مدرس منتخب ہوئے اور چند سالوں کے بعد ترقی کر کے مدرسہ مذکور کے سینئر سیکشن میں منتقل ہوئے اور تدریسی خدمات انجام دیتے رہے، بعد میں وہیں پرنسپل کے عہدہ پر فائز ہوئے، تاحال اسی عہدہ پر دینی وعلمی خدمات انجام دینے میں مشغول ہیں۔ اسی دوران ہندو بیرون ہند کے مختلف اسفار ہوئے اور ہورہے ہیں، جن میں امریکہ کا سفر قابل ذکر ہے، اپنی علمی خدمات کے صلہ میں آپ صدر جمہوریہ ایوارڈ سے بھی نوازے گئے۔ مولانا ایک عالم باعمل ہونے کے ساتھ ساتھ کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں، درس وتدریس کے علاوہ علمی وتحقیقی ذوق سے مالا مال ہیں، دینی کانفرنس اور علمی سمیناروں میں شرکت کرتے رہتے ہیں۔ آپ کی تحریروں میں تحقیق وتدویق کا عنصر غالب رہتا ہے۔ آپ کے رشحات قلم سے عربی اور اردو دونوں زبانوں کی تصانیف منظر عام پر آچکی ہیں، جن میں خاص طور پر ''تذکرہ علمائے بہار (دو جلدوں میں) اور تین ہفتے امریکہ میں'' داد تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ آپ کے علمی وتحقیقی مضامین عربی اور اردو دونوں زبانوں کے وقیع رسائل اور اخبارات کی زینت بنتے رہتے ہیں۔ موصوف ایک باوقار اور کامیاب مقرر بھی ہیں گرچہ آپ کا لب ولہجہ نہ واعظانہ ہے نہ خطیبانہ، پھر بھی آپ کی گفتگو بڑی مؤثر اور فکر انگیز ہوتی ہے اور سامعین کے دلوں پر گہرے وتابندہ نقوش ثبت کردیتی ہے۔

چونکہ راقم السطور مولانا موصوف کا ہم وطن ہے، اس لئے اپنی کم عمری سے ہی بہت قریب سے آپ کو دیکھنے کا موقع ملا، مولانا بہت ساری خوبیاں اور خصوصیات اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ ایک بڑی خوبی یہ دیکھی کہ کسی کا کام ہو، اسے مولانا اپنا کام سمجھ کر کریں گے اور اسے اس طرح سے انجام دیں گے جیسے آدمی کو اپنے کام کو فکرمندی سے انجام دیتا ہے۔ ایک انجانا شخص بھی اپنی کوئی ضرورت لے کر آتا ہے تو حتی الامکان اس کی تکمیل کے لئے کوشاں رہتے ہیں، بسا اوقات یہ دیکھا گیا ہے کہ ویزے کا ترجمہ کے لئے لوگوں کی آمد بڑی کثرت سے ہوتی ہے اور ہر ایک کا کام خوشی سے کردیتے ہیں۔

مولانا کی ذات میں ایک دوسری خوبی یہ نظر آتی ہے کہ اپنے سے چھوٹوں کے ساتھ بھی بڑا پن ظاہر نہیں کرتے، بلکہ ہم نشیں وہم جولی کی طرح ہر ایک کی بات توجہ اور غور سے سنتے ہیں۔ اپنے و بیگانے سب کے ساتھ حسن واخلاق کا مظاہرہ کرتے ہیں، کبر و تعلیٰ سے تو گویا آپ کو بیر ہے، زندگی میں حد درجہ سادگی پسند واقع ہوئے ہیں، کم سخنی فطری عادت بن گئی ہے۔ اختلافات اور رنجشوں سے کتراتے ہیں اور مخالفانہ طرز عمل کو ہوا نہیں دیتے۔ گاؤں گھر اور قرب وجوار کی بستیوں کے مختلف فیہ معاملات میں ایک دور اندیش، محتاط اور خیر خواہ رہنما کا کردار ادا کرتے ہیں، اپنی بستی کی عیدگاہ میں عرصہ دراز سے عیدین کی امامت آپ ہی کے ذمہ ہے، جو آپ کی محبوبیت اور ہر دل عزیزی کی علامت ہے۔

راقم سطور کو بعض موقعوں پر اپنے ذاتی امور میں مولانا سے رجوع کرنے کی ضرورت پیش آئی تو یہ تاثر قائم ہوا کہ مولانا اپنے تجربات کی روشنی میں ناصحانہ مشوروں سے نوازتے ہیں۔ راقم کو مولانا کی معیت میں کچھ وقت گزارنے کا بھی موقع ملا تو تجربہ اور مشاہدہ نے دیکھا کہ آپ اعتدال، تواضع او رہمدردی کے پیکر ہیں، آپ کی گفتگو میں اخلاص اور میٹھاس کی آمیزش ہوتی ہے، کسی کی دل شکنی پسند نہیں کرتے۔ مہمان نوازی اور اکرام نوازی میں پیش پیش رہتے ہیں، بے لوث خدمت انجام دے کر آپ قلبی وذہنی مسرت محسوس کرتے ہیں، سماجی خدمات کو نہایت خندہ پیشانی سے انجام دیتے ہیں۔ مسلم نوجوانوں میں دینی ترغیب پیدا کرنے میں ہمہ وقت کوشاں نظر آتے ہیں۔ غرض یہ کہ بے لوث، بے غرضانہ خدمت اور جذبہ انسانیت وشرافت نے آپ کو لوگوں کی نگاہ میں ہر دل عزیز بنا دیا ہے۔ موصوف علمی ودینی حلقوں کے علاوہ عوامی اور سیاسی سطح پر بھی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ آپ کے متعلق میرے ذہن میں یہ چند نقوش وتاثرات تھے جو قارئین کی نذر ہیں۔

اللہ تعالیٰ مولانا موصوف کو دنیا وآخرت میں ان کی کاوشوں وکارناموں کا بہترین صلہ دے اور آپ کا سایہ عمر دراز کرے، نیز ہم سبھوں کو اچھے انسانوں کی روش پر چلنے کی توفیق دے۔

☆ اسسٹنٹ پروفیسر عالیہ یونیورسٹی کولکاتا

☆ سابق استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

## (۷)

# مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی

پروفیسر عبدالمنان طرزی

بوالکلام قاسمی تو نام ہے آپ کا
آگے 'شمسی' پیچھے 'مولانا' مگر بڑھ جائے گا

دن اگر پچیسواں تو ماہ اکتوبر وہ تھا
ایک سال انیس سو پچاس پر دیجے بڑھا

فضل سے اللہ کے پیدا ہوئے تھا بوالکلام
اور اسی کا ہے کرم کہ آج ہیں اعلیٰ مقام

جائے پیدائش بھی ٹھہری دوگھرا ہی آپ کا
بہرہ ور ہیں وہ علوم دینی وعصری سے بھی

سربراہ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ
آپ ہی کے نام سے وابستہ ہے یہ مرتبہ

وہ بہاری علماء کا تذکرہ ہیں لکھ گئے
مشتمل دو جلدوں پر یہ کارنامہ جانئے

قاسمی امید رکھتے حسب توفیق خدا
جائے گا دو اور جلدوں تک یہ ان کا تذکرہ

تذکرے کی وجہ سے ہے اک حقیقت سامنے
ادباء، شعراء بھی کچھ ان عالموں میں تھے بڑے

بعض عالم تو یقیناً صاحب دیوان ہیں
بعض عالم نثر میں خود صاحب ایقان ہیں

بعض کی تخلیقیں ہیں مثل مسودات ہی
جو کتب خانوں میں ہیں محفوظ پوری آج بھی

اک اہم پہلو جو ہے اس تذکرے کا اور بھی
اس میں مخطوطات کی فہرست بھی دیکھی گئی

گم شدہ اور علم والے باخبر افراد کی
ہوگی دنیائے ادب کو اس طرح پہچان بھی

رکھتے ہیں شعر وادب میں جیسا وہ عالی مقام    کچھ تو واقف ہم بھی ہوجائیں گے اس سے لاکلام
جو اشارے بھی مہیا کر گئے ہیں قاسمی    دولت علمی کی جانب گویا انگلی ہے اٹھی
کوئی دیوانہ ہو پیدا بڑھ کے منزل تھام لے    ساغر و صہبا، سبو، مینا، صراحی ،جام لے
کوئی دیوانہ تو ہو کر جائے یہ کارگراں    قاسمی نے دی زمیں وہ لائے جس کا آسماں
سیدھا سادا، پرخلوص ان کا مگر اسلوب ہے    دیدہ و دل کو یقیناً ہر بیاں مرغوب ہے
جس طرح کوزے میں دریا کو سما دیتا کوئی    جانتے ہیں یہ ہنر بھی بوالکلام قاسمی
قاسمی جو چھ برس پہلے تھے امریکہ گئے    وہ سفر نامہ بھی دلکش ،معلوماتی لکھ گئے

قاسمی صاحب بلاشبہ ہیں سرگرم سفر
وہ بڑے کاموں کی جانب رکھتے ہیں اپنی نظر

دیدہ وران بہار(منظوم) جلداول۔عبدالمنان طرزی،صفحہ ۱۹۹

(۸)

# مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی ایک دین دار اور باوقار دانشور

سید شکیل حسن

میں مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی صاحب سے مارچ 2005 تک ان کی دنیاوی ودینی صلاحیت سے غائبانہ واقفیت رکھتا تھا،لیکن ذاتی طور پر اپنی سرکاری ملازمت (.Coal India Ltd) سے فرصت پاکراپریل 2005 میں اپنے غریب خانہ واپس آگیا۔اس کے بعدان سے ملاقات کا سلسلہ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ (پٹنہ) ودیگر مقامات جاری رہا اور باتیں ہوتی رہیں۔ملاقات کا سلسلہ بڑھتا رہا اور تعلقات مضبوط ہوتے گئے۔میں ان کے حسن اخلاق،سادگی،انکساری،دینی وعلمی صلاحیت سے متاثر وسیراب ہوتا رہا۔کلام صاحب مجھ سے عمر میں کافی چھوٹے ہیں لیکن ان کا مقام بہت بلند ہے اور میں ان کی صلاحیت واخلاص کی بے پناہ قدرواحترام کرتا ہوں۔

موصوف محب علم اور علم کو پھیلانے کا ان کے پاس بھرپور جذبہ ہے۔انہوں نے مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ میں بحیثیت استاذ، پرنسپل، مذہب اسلام اور دنیاوی تعلیم کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ان کی یہ خوبی رہی ہے کہ ان کو جو بھی ذمہ داری دی گئی اسے بڑی خوبصورتی سے نبھایا ہے۔یہی وجہ ہے کہ آپ علم کے میدان میں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ہمیشہ لوگوں کے ساتھ اخلاص،انکساری اور مسکراتے ہوئے گفتگو کیا کرتے ہیں۔چھوٹوں سے محبت اور بڑوں کے ساتھ ادب سے ملنا،ان کی زندگی کا ایک اہم ترین پہلو ہے۔

ایک بہترین لمحہ یاد آرہا ہے جب موصوف نے مدرسہ شمس الہدیٰ کی پوری کارکردگی کو اپنی ذاتی کاوش سے ''ویب سائٹ'' پرلادیا۔ اس سے پوری دنیا میں لوگوں نے مدرسہ کے بارے میں جانکاری حاصل کرلی۔ اس خبر کو میں نے اخبارات میں پڑھا تھا اور دلی مسرت ہوئی تھی۔ ان کی اس بہترین کاوش کے لیے میں نے موصوف کو فوراً فون کے ذریعہ دلی مبارکباد پیش کی تھی۔ انہوں نے میرے مبارکباد کو قبول کرتے ہوئے مجھے اپنی رہائش گاہ پر اپنی نگاہ سے دیکھنے کے لئے دعوت دے دی۔ میں نے اسی روز مغرب کے بعد اپنے قدم کو جنبش دیتے ہوئے ان کے دولت خانہ پر حاضر ہوگیا اور اس ویب سائٹ کو مجھے اپنے Computer پر دکھا دیا۔ غرض یہ کے مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کا نام روشن ہو چکا ہے، جو قابل تعریف قدم ہے۔ اس کے بعد موصوف نے بہت ہی محبت کے ساتھ میری ضیافت بھی کرڈالی، یہ ان کا حسن اخلاق ہے۔

میں پچھلے 50 سالوں سے مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کو قریب سے دیکھ رہا ہوں۔ میں اس ادارے کا کبھی طالب علم نہیں رہا ہوں مگر محبت وقدر ہمیشہ کی۔ یہاں جو بھی نیا پن یا ترقی دیکھنے کو ملی ہے، جیسے تعلیمی وتعمیری کام میں بنیادی ترقی کو ابوالکلام قاسمی صاحب نے اپنی ذاتی کاوش سے مدرسہ کو سنوار کر دلہن کی طرح حسین بنا دیا۔ کسی بھی تعلیمی ادارے میں ایک لائبریری کا ہونا لازمی ہے۔ یہ ہوتے ہوئے بھی سلیقے سے نہ تھا۔ موصوف نے اسے زبردست محنت کر کے اس کی شکل کی ہی بدل ڈالی، جس کی وجہ سے آج طلبا اس سے فیضیاب ہورہے ہیں۔ اشوک راج پتھ پر سائنس کالج کے سامنے یعنی دکھن کی طرف کوئی بھی انسان اپنی نگاہ لے جائے تو مدرسہ کی عمارت کو دیکھتے ہی آنکھوں کو ٹھنڈک نصیب ہوگی اور دلی مسرت ہوگی اور موصوف کو دل سے دعاء دیئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔ کیونکہ آج پورا معاشرہ ان کی کاوش وکاریگری دیکھ رہی ہے۔ آپ نے اس ادارے میں جو خدمت کی ہے، اسے فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے، اگر بھولنا چاہے تو بھلایا نہیں جاسکتا ہے۔ موصوف نے طلباء کے درمیان تعلیم کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اپنی تعلیمی وانتظامی صلاحیت کی وجہ سے بہار کے ایک دانشور ومفکر کی حیثیت سے ان کا ایک مقام ہے اور انہیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ طلباء کے درمیان ادبی ذوق پیدا کردیا اور ہر سال مدرسہ کے وسیع ہال میں مشاعرہ کی محفل آراستہ

کرتے رہے جس میں لڑکوں نے بھی بھرپور حصہ لیا۔ موصوف نے بڑے ہی جوش وخروش کے ساتھ مدرسہ کو ہر زاویہ سے سنوار دیا۔ موصوف نے ہمیشہ حق گوئی سے کام لیا ہے۔ آپ کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ 2011ء میں آپ ایران تشریف لے گئے تھے۔ ہندوستان جب واپس آئے تو انہوں نے بڑی خوبصورتی سے سفرنامہ لکھا، جسے بے حد پسند کیا گیا اور ان کی اس بہترین تحریر کے لئے شکریہ ادا کیا گیا اور انہیں لوگوں نے مبارکباد بھی پیش کی۔

میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا کہ ان میں بھرپور خاکساری ہے اور غرور نام کی کوئی چیز نہیں ہے، جو عموماً مسلمانوں کے درمیان دیکھنے کو ملتا ہے۔ معاشرے میں ایسا دیکھنے کو ملتا ہے کہ مسلمانوں کے جب پروردگار اعلیٰ تعلیم، عہدہ، یا مال واسباب سے نواز دیتا ہے تو بیشتر لوگوں کے دماغ شریف میں ایک کیڑہ داخل ہو جاتا ہے اور دوسروں کو اپنے برابر کا نہیں سمجھتا ہے۔ ایسے لوگوں کی یہ پہلی اور آخری بھول ہے۔ ایک کہاوت ہے کہ پھل دار درخت ہمیشہ جھکا رہتا ہے۔ اسی پھل دار درختوں میں سے ایک مولانا محترم ابوالکلام قاسمی شمسی صاحب ہیں۔ میری دعا ہے کہ پروردگار انہیں اور ان کے گھر کے تمام لوگوں کو تندرستی دے اور اپنی حفاظت میں رکھے۔ آمین۔ مزید دعاء ہے کہ ان کی علمی صلاحیت سے معاشرہ وحکومت ہمیشہ فیض اٹھاتا رہے۔ آمین۔ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کی تعلیم پر آپ کی زبردست پکڑ ہے۔

مزید ان کی شخصیت علمی وانتظامی صلاحیت پر روشنی ڈالنے میں کوئی کمی رہ گئی ہو تو مولانا ابوالکلام قاسمی صاحب مجھ جیسے حقیر وگنہگار بندہ کو معاف فرمائیں گے۔

☆سابق ڈپٹی چیف پرسنل ولیگل منیجر۔ کول انڈیا لمیٹڈ
وسابق ڈائریکٹر لیگل و پرسنل المونیم کمپنی۔

(۹)

# زندگینامہ وآثار مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی

دکتر محمد صادق حسین

ایالت بیہار خصوصاً خطۂ شمالی بیہار علماء وادباء صوفیاء ودانشمندان برجستہ ای را بر صفحۂ ہستی بہ وجود آوردہ است کہ آنان در نشر وترویج علم وادب نقش مہمی را ایفاء نمودہ اند۔ درمیان آنان مولانا ابوالکلام قاسمی بدون شک وتردید در زمینۂ احیاء علم ودانش اسلامی از اہمیت خاصی برخوردار است۔

مولانا در یکی از دہات ناحیہ دربھنگہ دردوگھرا بتاریخ ۲۵ اکتبر ۱۹۵۱ء میلادی چشم بہ جہان گشود۔ پیدرش عبدالستار است کہ ہنوز با ہمراہ مولانا در پٹنا زندگی می کند۔ مولانا تحصیلات مقدماتی را در مدرسۂ دہ خود فرا گرفت۔ سپس برای تحصیلات عالی در مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنا ثبت نام کرد ولاکن بہ حالات ناموافق او برای حصول تعلیم بہ مدرسہ رحمانیہ سپول، دربھنگہ سفر کرد واز اینجا تا درجہ فاضل درس گرفت۔ اور زکودکی ذہین وباسواد بودہ است ودر ہمہ امتحانات از درجہ اول موفق شد وبہ ہمین سبب در دوران تحصیلات بورسہای گوناگون را بدست آورد۔ او نہ تنہا تحصیلات علوم دینی وملاک مدارس را فرا گرفتہ بلکہ تحصیلات کنونی را ہم از دبیرستان تا دانشگاہ گرفتہ است۔ لیسانس وفوق لسانس درارد واز دانشگاہ مظفرپور، بیہار وفوق لیسانس در عربی از دانشگاہ اسلامیہ علی گرھ فرا گرفت کہ گواہی می دھد کہ او برای فراگیری علم ودانش از شروع زندگانی کوشان بودہ است۔

او پس از اتمام تحصیلات در ماہ ژانویہ سال ۱۹۷۱ء میلادی بہ حیثیت مولوی معاون در مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنا کہ گہوارہ دانش او بودہ است، استخدام شد و در ماہ ژانویہ سال ۱۹۹۹ء میلادی برکرسی ریاست این مدرسہ فائز گشت، وتاحالن این فریضہ را بہ حسن خوبی انجام می دہند و در ۳۱ اکتبر ۲۰۱۱ء میلادی از این خدمت بازنشستہ خواہد شد۔

مولانا از شروع زندگانی فعال بودہ است و فعالیت ادبی و اجتماعی زیادی دارد۔ در سمینار و کونفرانس مختلف جہان شرکت کردہ اند و از این رو سفرہای زیادی، چہ در ہند وچہ در کشورہای خارجی، کردہ است۔ سفرہای ایالت متحدہ آمریکا، کویت، سعودی عربیہ و ایران او در مورد مجالس ادبی بودہ است۔ او نہ تنہا در درس و تدریس و فعالیت ادبی و اجتماعی بودہ اما تمایلات بہ زمینہ ای تحقیق و تدوین فراوان دارد۔ دانشجویان تحت نظارت وی کارہای پژوہشی را بہ انجام رساندہ اند۔ او کتابہای زیادی کہ مشتمل بر موضوعات گوناگون می باشند، تالیف و تدوین نمودہ اند کہ از ینقرار اند۔

علاوہ از ین مقالہ ہای تحقیقی و تنقیدی در زبانہای عربی و فارسی و اردو وارۂ دادہ اند کہ در مجلّات معروف مشہور چاپ شدہ است۔ پس از بررسی این تالیفات و مقالات وی ہویدا می شود کہ مولانا بر زبانہای عربی و فارسی و اردو دسترس کامل دارد و ہمین سبب است بیشتر کتابہای در برنامہ ہای درسی دبیرستانہا و مدارس داخل ہستند۔

درمیان کتابہای فوق الذکر ''تذکرہ علمای بہار'' وی اہمیت خاصی دارد۔ او اولین کسی است بر این موضوع قلم برداشتہ تذکرہ علمای بہار را مورد بحث قرار دادہ است و راہی برای دیگران باز کردہ است۔ اسلوب وطرز نگارش این کتاب کمالیت و جامعیت مولانا را نشان می دہد و بہ شہرت وی سزاوار است۔ دولت ہند و دولت بہار حتی کہ ایالت متحدہ آمریکا دانش پژوہی و علم دوستی وی را تسلیم کردہ از جوانیر خود گرامی داشتہ اند۔ در حقیقت مولانا نہ تنہا افتخار ایالت بہار است بلکہ افتخار سراسر ہند است کہ شخصیت او برای آئندگان باعث شرف و سربلندی خواہد شد۔

استاد یار بخش فارسی دانشگاہ پٹنا

(۱۰)

# مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی: ایک متنوع شخصیت

ثناءاللہ ثناؔ دوگھروی

اس عالم رنگ و بو میں آدمؑ سے لے کر اب تک نہ جانے کتنے انسان پیدا ہوئے اور اپنی زندگی جی کر ملک عدم کے راہی ہو گئے۔ آج ان کے نام ونشان تک نہیں ہیں۔ لیکن ان ہی میں بہت سی مہتم بالشان وآفاقی شخصیات ایسی بھی پیدا ہوئیں جنہیں تاریخ نے اپنے باب زریں کا حصہ بنالیا اور وہ آج تک یاد کئے جاتے ہیں اور شاید آئندہ بھی اسی طرح یاد کئے جاتے رہیں گے۔ ایسے بے شمار لعل و گہر ہیں جن سے تاریخ کے اوراق آج بھی درخشاں ہیں۔ ان ہستیوں نے مختلف شعبہ ہائے حیات میں ایسے ایسے گراں قدر کارنامے انجام دیے کہ دنیا انہیں چاہ کر بھی فراموش نہیں کرسکتی ہے۔ ان ہی عظیم ہستیوں میں سے بعض ہستیاں ایسی بھی تھیں جنہوں نے زندگی کی دیگر مصروفیات کے ساتھ پرورش لوح وقلم کو اپنی زندگی کا مقصد وشعار بنالیا اور آخری دم تک اس کام میں مستغرق رہے اور اپنے پیچھے ایسی ایسی تصنیفات چھوڑیں کہ صدیوں تک آنے والی نسلیں بھی ان کے اس علمی کارنامے سے استفادہ کرتی رہیں گی، زندگی کی تاریک راہوں میں روشنی پاتی رہیں گی۔ شاید ایسے ہی لعل وگہر میں سے مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی، پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدی، پٹنہ بھی ایک ہیں، جنہوں نے ان قدما کے نقش قدم پر چلتے ہوئے پرورش لوح وقلم کو اپنی زندگی کا شعار بنالیا ہے اور تصنیف وتالیف کی سنگلاخ وادیوں میں زندگی کی گوناگوں الجھنوں ودیگر مصروفیات کے باوجود گزشتہ کئی برسوں سے بغیر ان پریشانیوں کی پروا کیے ہوئے بخوبی گامزن ہیں۔ مولانا ابوالکلام قاسمی ایک ہمہ جہت شخصیت

کے مالک ہیں۔ وہ ایک بہترین معلم، مدبر، بہترین مقرر، مصنف، مورخ ومفسر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ درجہ کے تذکرہ نگار بھی ہیں۔

تصانیف: مولانا کی اردو زبان میں اب تک کم وبیش پچیس کتابیں منظر عام پر آکر قارئین سے دادو تحسین حاصل کر چکی ہیں، جو نئی نسل کے لیے علمی وتاریخی سرمایہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کتابوں میں 'تذکرہ علمائے بہار' 'مکالمہ سنت وبدعات' 'تفسیر سورہ فاتحہ' 'حضرت اویس قرنی' 'تحریک آزادی میں علمائے کرام کا حصہ' 'مشاہیر بہار کے خطوط' اور 'تین ہفتے امریکہ میں' کئی اعتبار سے بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ اس کے علاوہ مولانا کی کئی اور بھی اہم کتابیں ہیں، جن میں کئی کتابیں اپنے تحقیقی مراحل سے گزر رہی ہیں۔ اس کے علاوہ متعدد مضامین مختلف اخبارات ورسائل میں وقفہ وقفہ سے شائع ہوتے رہے ہیں۔

اب ہم ڈالتے ہیں مولانا کی چند کتابوں پر ایک طائرانہ نظر، جن سے ان تصنیفات کے متعلق قارئین کو شاید کچھ معلومات فراہم ہو سکے۔ سب سے پہلے ہم شروع کرتے ہیں کلام الٰہی سے، جو تمام عالم انسانیت کے لیے راہ نجات اور مکمل ہدایت ہے۔ قرآن حکیم اللہ کا کلام ہے۔ اس کتاب کا ہر لفظ اپنے اندر معنیٰ کا ایک گہرا اور اتھاہ سمندر لیے ہوئے ہے۔ ایسے میں قرآن کے ایک لفظ یا ایک آیت کا ترجمہ کرنا یا اس کی تفسیر لکھنا انتہائی مشکل فن ہے، یہ کام گویا تلوار کی تیز دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔ ذرا سی کہیں لغزش ہو جائے تو پورا معاملہ ہی بگڑ جانے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ہر کس وناکس وسطحی علم رکھنے والے علما کے بس کی بات نہیں ہے کہ وہ قرآن شریف کا ترجمہ کریں یا اس کی تفسیر لکھیں۔ اس میدان میں وہی شخص اترتا ہے، جس کی اس فن پر سخت گرفت ہو، جو علم کا بحر ذخار ہو اور جو الفاظ کے اسرار ورموز ومعانی ومفاہیم ودیگر نشیب وفراز سے بخوبی واقف ہو۔ مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی نے بھی اس سمت میں کوشش کرتے ہوئے سورۂ فاتحہ کی تفسیر لکھی۔ موصوف کی تصانیف میں سورۂ فاتحہ کی تفسیر کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ جہاں تک اس میں زبان وبیان کے استعمال کی بات آتی ہے تو موصوف کی ہمیشہ اور ہر تصنیف میں یہ کوشش رہتی ہے کہ زبان انتہائی سادہ سلیس مگر نہایت بلیغ استعمال کیا جائے جسے ایک اوسط درجہ کے تعلیم یافتہ شخص بھی مطالعہ کر سکے اور اسے بھی پوری بات سمجھ میں آجائے اور اس

قاری کے دل ودماغ پر وہ فن پارہ گہرا نقش چھوڑ جائے۔ موصوف کا یہی طرز تحریر سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں بھی ملتا ہے، کہیں کوئی اس طرح کی زبان استعمال نہیں کیا گیا ہے جسے پڑھنے کے بعد سمجھ میں نہ آسکے یا پھر وہ لفظ نہ سمجھنے کی وجہ سے بوجھل معلوم ہو۔ تفسیر سے پتہ چلتا ہے کہ موصوف کا مطالعہ بڑا گہرا ہے۔ مولانا اس موضوع کو اس وقت تک نہیں چھوتے ہیں، جب تک کہ اس کے ایک ایک جز کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ نہ کرلیں، مولانا کا یہی تصنیفی وصف انہیں امتیازی حیثیت عطا کرتا ہے۔

مولانا کی ایک اور اہم تصنیف ''تذکرہ علمائے بہار'' ہے۔ اسے ایک تصنیف نہیں بلکہ ایک پروجیکٹ، ایک مشن کہیں تو بیجا نہ ہوگا کیونکہ منصوبے کے مطابق اس کتاب کی تین جلدیں ہیں۔ اس میں سے پہلی جلد، جو کافی ضخیم اور تقریباً 500 رصفحات پر مشتمل ہے، 1995ء میں منظر عام پر آکر قارئین سے داد وتحسین وصول چکی ہے۔ اپنے حلقے میں یہ کتاب کافی مقبول ہوئی۔ اس میں ایسے 501 علمائے کرام کے تذکرے ہیں جو اس جہان فانی سے پیشتر کوچ کرچکے ہیں۔ بڑی جدوجہد کے بعد اس کتاب کی دوسری جلد 2006ء میں منظر عام پر آئی۔ اس میں بھی ان 283 علمائے کرام کی زندگی کا احاطہ کیا گیا ہے جو اب ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ موصوف کی تیسری جلد کا کام چل رہا ہے۔ چونکہ مولانا کی زندگی بڑی مصروف ترین زندگی ہے اور اسی قلت اوقات میں مولانا کو وقت نکال کر اپنے ذوق کا سامان بھی کرنا پڑتا ہے یعنی تصنیف وتالیف کا کام جو مولانا کی زندگی کا ایک اہم جز ہے۔ لہٰذا تاخیر سے ہی سہی ''تذکرہ علمائے بہار کی تیسری جلد مستقبل قریب میں منظر عام پر آنے والی ہے، جس میں بہار کے ان علمائے کرام کو شامل کیا گیا ہے جو بقید حیات ہیں۔ اس سمت میں مولانا کی یہ ایک اچھی کوشش کہی جائے گی کیونکہ اس کتاب کی پہلی اور دوسری جلدوں میں بہت سے ایسے علمائے کرام حضرات کے تذکرے ہیں، جو باصلاحیت ہونے کے باوجود اپنی پوری زندگی گوشۂ گمنامی میں پڑے رہے۔ کسی چھوٹے تعلیمی ادارے میں درس وتدریس کے فرائض انجام دے کر دنیائے فانی سے کوچ کر گئے اور اب انہیں موجودہ نسل جانتی بھی نہیں ہے، جو کسی بھی طرح بہتر نہیں ہے، کیونکہ یہ ان عظیم شخصیات کے ساتھ، ان کے کارناموں، ان کی کوششوں، ان کے جہد پیہم کے ساتھ یہ بلا تامل ناانصافی کہی جائے گی۔ لہٰذا مولانا موصوف کی نگاہ دوربیں اس طرح گئی

اور انہوں نے اس کمی کو بخوبی محسوس کیا اور اپنے قلم کو اس سمت میں کام کرنے کے لیے جنبش دی اور مولانا اپنی اس کوشش میں بہت تک کامیاب ہوئے، جس کے خاصے نتائج قوم وملت کے سامنے ہیں، گویا مولانا نے اپنی اس کوشش کے ذریعہ ان عظیم شخصیات کو بھی تاریخ کے صفحات کا ایک اہم باب بنا دیا ہے۔

''تحریک آزادی میں علمائے کرام کا حصہ'' بھی ایک مولانا کی تصنیفات میں ایک اہم مقام کی حامل ہے۔ اس کتاب کی اہمیت اس لیے اور بھی بڑھ جاتی ہے کیونکہ ہمارے درمیان ایک ایسا گروہ بھی پیدا ہو چکا ہے، جس کی سوچ پر پوری طرح فسطائیت غالب ہے، جس کی آنکھوں پر تعصب کے عینک لگے ہوئے ہیں، جس کے دل ہندوستان میں اقلیتی فرقوں کے تعلق سے بدرجہ اتم متنفر ہیں۔ اس گروہ کے ذریعہ پوری طرح سے اور جہاں کہیں بھی ان کے ذریعہ ممکن ہے، وہ ہر سطح پر اس بات کے لیے اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ کوشاں ہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ کو مسخ کر دیا جائے، ہندوستان کی جنگ آزادی میں علمائے کرام کی قربانیاں تاریخ کے صفحات سے مٹا دی جائیں، ان کے کارنامے بھلا دیئے جائیں، انہوں نے ملک عزیز کی آزادی کی خاطر جن اذیتوں اور نامساعد حالات کا سامنا کیا، انہیں سرے سے فراموش کر دیا جائے۔ ایسے ماحول میں مولانا ابوالکلام قاسمی نے وطن عزیز ہندوستان کی آزادی میں علمائے کرام کی حصہ داری، پر باقاعدہ تحقیقی کام کیا اور بڑی محنت وجاں فشانی سے تاریخ کے سمندر سے ان جواہر پاروں کو نکال کر سامنے لانے کی کوشش کی جن سے آج بھی ہندوستان کی آزادی کی تاریخ کا باب درخشندہ ہے۔ مولانا موصوف کا یہ کارنامہ بھی گراں قدر ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ ہمارے بچے بھی اپنے آباء واجداد کی شجاعت، ان کے دلیرانہ وجانبازانہ کارناموں اور ملک کی آزادی میں ان کی بے بہا قربانیوں سے بخوبی واقف ہو سکیں گے۔ لہٰذا مولانا کی یہ کتاب بھی ایک اہم اضافہ ہے اور اسے بہ نظر استحسان دیکھا جائے گا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے بچوں کو ایسی کتابوں کے مطالعے کی طرف بھی ضرور راغب کریں تا کہ ہمارے بچے اپنی تاریخ سے واقف ہو سکیں اور ہمارے اسلاف کی زندگیاں، ان کے عظیم کارنامے ہماری نئی نسل کے سینوں میں محفوظ رہ سکیں اور آنے والی نسلوں کے

لیے ایک سبق ہو۔ ہماری آئندہ نسلیں بھی ان کی زندگی کے روشن وتابناک پہلوؤں سے استفادہ حاصل کرسکیں اور جب بھی وطن عزیز پر کوئی خطرہ منڈلاتا ہوا پائیں، تو اپنے اجداد کی طرح ہی ہر طرح کی قربانیاں پیش کرنے میں کوئی دریغ نہ کریں۔

موصوف کی ایک اور تصنیف ''تین ہفتے امریکہ میں'' جو سال 2004 میں منظر عام پر آئی، وہ ایک سفر نامہ ہے، جو مولانا کے امریکہ کے سفر سے لوٹنے کے بعد منظر عام پر آیا تھا۔ یوں تو ادب میں سفر نامے کا فن بڑا قدیم ہے۔ کئی قدما نے اپنے زمانے میں بڑے اچھے سفر نامے لکھے ہیں، جس میں البرونی، فاہیان وغیرہ کے سفر نامے تو بہت ہی مشہور و معروف اور اپنی مثال آپ ہیں اور ادب میں ان سفر ناموں کی آج تک نظیر نہیں ملتی۔ سفر نامہ جس خطۂ ارضی سے منسلک ہوتا ہے خواہ وہ کوئی ضلع ہو ، ریاست ہو یا کوئی بھی ملک ہو، ہمیں ان علاقوں کے متعلق بے شمار معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ وہ مخصوص علاقہ جس کا سفر نامہ میں ذکر ہے، وہ دنیا کے نقشے میں کہاں ہے، وہاں کے لوگ کس طرح کے ہیں، ان کی تہذیب کیسی ہے، ثقافتی و تمدنی اعتبار سے وہ لوگ کس مقام پر ہیں، وہاں کی زبان کیسا ہے، وہاں کی تعلیم کیسی اور کس معیار کی ہے، وہاں کے قدرت کے بنائے ہوئے حسین مناظر، باغات، جنگل، پہاڑ، ندیاں وغیرہ وغیرہ کے متعلق تفصیلی معلومات فراہم ہو جاتی ہیں۔ یہ چیزیں بہت حد تک منحصر کرتی ہیں مصنف کی علمی استعداد، ان کی دلچسپی، ان کے مزاج اور ان کے نکتۂ نگاہ پر کہ انہوں نے اپنے سفر نامے کو کون ساز او یہ عطا کیا ہے اور کس نوعیت کی باتوں کو مصنف نے اہمیت دی ہے۔ بہر کیف سفر نامے کے اس سلسلے کو مولانا ابوالکلام قاسمی نے بھی آگے بڑھایا ہے اور سال 2003 میں حکومت کی جانب سے امریکہ کے سفر سے لوٹنے کے بعد اس کتاب کی تصنیف کی اور امریکہ کو مولانا نے جیسا دیکھا، جیسا سمجھا اسے اپنے قلم کے ذریعہ قارئین تک پہنچانے کی ایک بہتر کوشش کی۔ یوں تو یہ کتاب سیدھا سادہ ایک سفر نامہ ہے، جس میں امریکہ کے اہم مقامات، تاریخی عمارتیں اور وہاں کے لوگوں کے شب و روز کو بڑی خوبی اور ایک ایک چیز کو تفصیل کے ساتھ قلمبند کیا گیا ہے، لیکن اس کتاب کی ایک اور اہم خوبی بھی ہے جسے ہم اس کتاب کی انفرادیت بھی کہہ سکتے ہیں، یہ ہے کہ مولانا نے اس کتاب میں امریکہ کے کچھ ان گوشوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے یا قارئین تک پہنچانے کی کوشش ہے جنہیں

عام طور سے لوگ کم جانتے ہیں یا نہیں کے برابر جانتے ہیں۔ امریکہ کی عریانیت، بے حیائی اور وہاں کی جدید تہذیب کی دنیا کے دیگر ممالک کے معاشرے پر مرتب ہوئے انتہائی خطرناک قسم کے منفی اثرات نیز دور حاضرہ میں اسکول و کالج کی ہائے ہیلو کی تہذیب سے تو آج غالباً ہر کس و ناکس واقف ہے لیکن اس کے باوجود کچھ اچھائیاں بھی ہیں جس کی طرف لوگوں کی نگاہیں کم جاتی ہیں۔ مولانا نے ان اچھائیوں کو بھی لوگوں تک پہنچانے کی ایک کوشش کی ہے۔ مثلاً وہاں کے اہم مقامات، وہاں کی مسلم تہذیب، وہاں کے مدارس، وہاں کے لوگوں کا اخلاقیاتی پہلو، وہاں کا مسلم معاشرہ، وہاں کی مساجد، وہاں کے مدارس وغیرہ۔ ان تعلیمی اداروں میں طلبا کے طور طریقے اساتذہ کے تدریسی انداز، طلبا اور اساتذہ کے رشتے اور ان رشتوں کا وہاں کا تعلیمی ماحول پر اثر، وہاں کے لوگوں کی فیاضی وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جن کا مولانا نے اپنی کتاب میں دیگر چیزوں کے ساتھ بخوبی ذکر کیا ہے۔

مولانا اپنے تصنیفی سفر میں بچوں کو کہیں بھولے نہیں، بلکہ انہیں بھی اپنے ساتھ ساتھ رکھا ہے۔ موصوف نے نچلے درجہ کے طلبا کے لیے کئی اہم کتابیں لکھی ہیں، جن میں القراۃ الجدیدۃ پرائمری حصہ سے لے کر حصہ چہارم تک شامل ہیں، ساتھ ہی 'ہمارا دین' اور عربی قواعد کی کتاب تسہیل النحو بھی قابل ذکر ہیں۔ مولانا کی بچوں کے لیے اردو قواعد کی کتاب 'جدید اردو قواعد حصہ دوم اور جدید اردو قواعد حصہ تین' مشہور کتابیں ہیں، جو خالص بچوں کی عمر، ان کی علمی صلاحیت اور ان کے ذہن کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔ دیگر تصنیف کی طرح یہ بھی بچوں کی سہی لیکن ایک اہم تصنیف ہے۔ یہ بچوں کے لیے نہایت مفید کتاب ہے جس کے ذریعہ بچے اردو صحیح صحیح بولنا اور لکھنا سیکھ سکتے ہیں، ان کے اندر اردو زبان کے تعلق سے اصول ضوابط کے جاننے کا بہتر رجحان پیدا ہوگا۔ ایک اور کتاب ہماری نظمیں بھی اس حیثیت سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ مولانا موصوف نے ابتدائی طلباء کے لیے دوسری کتاب عربی انشا کی کتاب 'الترجمۃ العربیۃ' طلبا کے لیے انتہائی کارآمد اور مفید ہے۔

## مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی

پیدائش: مولانا ابوالکلام قاسمی صوبہ بہار کے دربھنگہ ضلع میں واقع جالہ بلاک کے تحت معروف

گاؤں دوگھرا میں 25/اکتوبر 1951 میں پیدا ہوئے۔ یہ گاؤں شروع سے ہی اپنے بہتر تعلیمی ماحول و تعلیمی نظام کے لیے قرب وجوار میں اپنی شناخت قائم کئے ہوئے رہا ہے۔

پرورش و پرداخت: مولانا کی پرورش و پرداخت اپنے آبائی گاؤں دوگھرا میں بہترین ماحول میں ہوئی۔ موصوف کے والدین نے بڑے لاڈ و پیار اور شفقت کے سایہ میں ان کی پرورش کی۔ موصوف کے والد اعلیٰ تعلیم یافتہ نہیں ہیں، لیکن چونکہ وہ تعلیم کی اہمیت وافادیت سے بخوبی واقف ہیں لہٰذا مولانا کی تعلیم وتربیت کے سلسلے میں شروع سے ہی وہ بیدار رہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا کے والدین نے مولانا کو اوائل عمری سے ہی بہترین، باکردار اور باصلاحیت اساتذہ کی شاگردی میں دے دیا، جس کا ثمرہ آج مولانا ابوالکلام قاسمی کی شکل میں دنیا کے سامنے ہے۔ مولانا کی تربیت میں ان کی والدہ مرحومہ کا انتہائی اہم اور غیر معمولی کردار رہا ہے، جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ موصوف کے والد کا خاصا وقت حصول معاش میں گزر جاتا تھا، تو ایسی صورت حال میں والدہ نے ہی پوری طرح اپنی نگرانی میں رکھا اور کافی مستعدی سے ان کی تربیت کی اور مولانا کو زیور تعلیم سے آراستہ کیا۔ مولانا کی والدہ کے مزاج میں مولانا کے تئیں جہاں ماں کا لاڈ و پیار تھا وہیں مرحومہ کی شخصیت میں باپ کی سختی کا بھی عنصر بدرجہ اتم موجود تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شاید مولانا کی اتنی اچھی تربیت نہ ہو پاتی۔ اللہ مولانا کی والدہ کو غریق رحمت کرے۔ آمین۔

تعلیم: ابتدائی تعلیم گاؤں کے ہی معروف مدرسہ مدرسہ قاسم العلوم حسینیہ دوگھرا، دربھنگہ میں ہی حاصل کی۔ اس وقت ان کے استاذ ہوا کرتے تھے مولانا عبدالحمید قاسمی، نیپالی، جنہوں نے بڑے پیار اور بڑی شفقت ومحبت سے انہیں پڑھایا اور عربی وفارسی کی اچھی تعلیم دی کہ پھر اونچے درجوں میں انہیں کبھی کسی نے پیچھے نہیں کیا اور یہ استاذ محترم مولانا عبدالحمید نیپالی کا فیض اور ثمرہ تھا کہ تعلیم کے معاملے میں پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور تمام کے تمام امتحانات میں اول درجہ حاصل کیا۔ مولانا نے 1963 میں بہار مدرسہ ایجوکیشن بورڈ سے وسطانیہ کا امتحان اول درجہ سے پاس کیا۔ 1965 میں فوقانیہ، 1967 میں مولوی، 1969 میں عالم، 1971 میں فاضل (فارسی)، 1972 میں فاضل (اردو)، 1976 میں فاضل (حدیث) اور 1982 میں فاضل (عربی ادب) کے امتحانات بہار مدرسہ ایجوکیشن بورڈ سے ہی

فرسٹ ڈویژن سے پاس کیے، 1970 میں میٹرک (پرائیوٹ) سے بہار سکنڈری اکزامنیشن بورڈ سے فرسٹ ڈویژن سے، 1977 میں مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا سے انٹر میڈیٹ فرسٹ ڈویژن سے، 1981 میں بہار یونیورسٹی مظفر پور سے اردو آنرس، اسی یونیورسٹی سے 1988 میں ایم اے (اردو)، 1994 میں علی گڑھ مسلم یونیوسٹی سے ایم اے (عربی) کے امتحانات فرسٹ ڈویژن سے پاس کیے۔ ساتھ ہی 1974 میں بہار اسکول اکزامنیشن بورڈ سے ٹیچر ٹریننگ کا امتحان بھی فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا۔ موصوف کا شمار شروع سے ہی ذہین طلبا میں ہوتا تھا، جس کا ثبوت مولانا کے اسناد اور مولانا کی علمی لیاقت اور علمی کارنامے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں درجہ وسطانیہ سے لے کر فاضل تک بہار مدرسہ اکزامنیشن بورڈ سے ذہانت کی بنیاد پر وظیفہ بھی حاصل کیا۔

ملازمت: مولانا نے 17 جنوری 1976 میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدی پٹنہ، بہار میں اسسٹنٹ مولوی کی حیثیت سے جوائن کیا اور اس حیثیت سے 31 مارچ 1981 تک درس وتدریس کے فرائض بخوبی انجام دیتے رہے۔ یکم اپریل 1981 سے لے کر 31 دسمبر 1996 تک بہار ایجوکیشن سروس کے تحت (کلاس ii) کے عہدے پر فائز رہ کر درس وتدریس کے سلسلے کو جاری رکھا اور پھر یکم جنوری 1997 کو مدرسہ ہذا میں پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوئے اور تا حال اس حیثیت سے اپنے فراض منصبی کی ادائیگی بخوبی کرتے آرہے ہیں۔

مولانا کے اساتذہ: مولانا کے دیگر اساتذہ کرام میں مولانا صغیر احمد رحمانی، سابق استاذ مدرسہ جامعہ رحمانی مونگیر (جو ان دنوں مدرسہ قاسم العلوم حسینیہ دوگھرا میں درس وتدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے۔، حافظ محمد ابو یوسف، (مرحوم)، ماسٹر محمد امیر الدین (مرحوم)۔ دار العلوم دیوبند کے اساتذہ میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمی، مولانا فخر الدین مراد آبادی، علامہ حسین بہاری جو ملّا بہاری کے نام سے بھی مشہور تھے، مولانا شبیر احمد خاں بلند شہری، مولانا شریف حسن، مولانا نعیم الدین دیوبندی، مولانا سالم قاسمی، مولانا انظر شاہ کشمیری، مولانا نصیر احمد خاں، مولانا معراج الحق اور مولانا وحید الزماں کیرانوی وغیرہم کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔

ادارے سے وابستگی: اردو زبان وادب کی خدمات کے اعتراف میں حکومت بہار کے ذریعہ

مولانا جون 2008 میں اردو مجلس مشاورتی کمیٹی کے ممبر بنائے گئے۔

مولانا کی اولاد: مولانا کی اولاد میں دولڑکے اور تین لڑکیاں ہیں۔ بڑے صاحبزادے مولانا محمد کلیم اختر قاسمی، جو مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں ہی استاذ کی حیثیت سے درس تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں، دوسرے صاحبزادے محمد جسیم اختر عرف گلاب۔ بابو جوالفلاح انجینئرنگ کالج، فرید آباد میں زیر تعلیم ہیں۔ مولانا کی بچیوں میں دو کی شادیاں ہو چکی ہیں اور ایک سب سے چھوٹی بچی جو ابھی زیر تعلیم ہے۔

مولانا بحیثیت پی ایچ ڈی نگراں: مولانا ابوالکلام قاسمی کثیر الجہات شخصیت وہمہ گیر شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کے علمی کارنامے اور ان کی علمی صلاحیت واستعداد کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ انہوں اب تک کئی طلبا کو اپنی نگرانی میں پی ایچ ڈی کروایا ہے۔ طلبا نے ان کی نگرانی میں اپنے تحقیقی کام بخوبی مکمل کیے اور پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی ہیں، جن میں محمد افتخار احمد، اور محمد ریاض احمد ندوی کے نام قابل ذکر ہیں۔

آبائی گاؤں دوگھرا سے مولانا کی محبت: مولانا ابوالکلام قاسمی کی ذات میں اور بھی بہت سی صفات حمیدہ بدرجہ اتم موجود ہیں، جن پر روشنی ڈالی جانی چاہئے، جیسا کہ اس مضمون کا تقاضا ہے۔ موصوف مٹی سے جڑے انسان ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اپنے گاؤں دوگھرا سے انہیں بڑی محبت ہے اور موصوف گاہے بگاہے گاؤں میں تشریف لاتے رہتے ہیں۔ مولانا جب بھی اپنے گاؤں تشریف لاتے ہیں تو نوجوان طلبا کی خبر گیری ضرور کرتے ہیں، ان سے ملاقات کرتے ہیں اور انہیں تعلیم سے متعلق نیک اور اہم آرا سے نوازتے رہتے ہیں اور جہاں تک ممکن ہوتا ہے اپنی ذات سے ایسے طلبا کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، تاکہ ان مشوروں کی روشنی میں وہ طلبا اپنے بہترین مستقبل کے لیے لائحہ عمل تیار کر سکیں۔ اس لیے گاؤں کے نوجوان طلبا میں بھی مولانا کی شخصیت کافی مقبول ہے۔

گاؤں کے نوجوان طلبا کی معروف فلاحی تنظیم ''انجمن آوازنو'' گزشتہ کئی برسوں سے اپنی فعالیت کا ثبوت پیش کرتی آرہی ہے، جسے مولانا موصوف کی سرپرستی حاصل ہے۔ مولانا اکثر ان

طلبا سے پوچھ تاچھ اور انہیں تنظیم کے تعلق سے اپنی قیمتی آراء سے نوازاتے رہتے ہیں۔ یہ مولانا کی سرپرستی کا ہی نتیجہ تھا کہ دوگھرا گاؤں میں 2003 میں 'انجمن آوازنو' کے صدر محمد ممتاز، سکریٹری محمد فیض و دیگر ہونہار کارکنان نے اپنی انتھک کوششوں کے ذریعہ اس انجمن کے بینر تلے ایک ایسے عظیم الشان جلسے کا انعقاد کیا جو دور دراز کے علاقوں کے لیے مثال بن گیا اور اس جلسہ کی کامیابی میں جہاں اس کے ہونہار طلبا کا اہم رول تھا وہیں مولانا ابوالکلام قاسمی کی سرپرستی کا اور ان کی ذات گرامی کا اثر تھا کہ جید اور معروف و بزرگ علمائے کرام نے اس جلسے میں شرکت کی اور اپنی بیش قیمتی اصلاحی پند ونصائح سے تمام سامعین کو نوازا۔

مولانا بحیثیت استاذ: مولانا کی شخصیت کو اگر ہم استاذ کی حیثیت سے دیکھیں تو طلبا کے لیے ان کی ذات انتہائی مشفق اور ہمدرد استاذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ مولانا ایک باصلاحیت عالم ہونے کے ساتھ ساتھ کئی زبانوں پر عبور رکھتے ہیں۔ مولانا جہاں عربی زبان وادب، فارسی، فقہ، تاریخ وقرآن اور حدیث میں مہارت رکھتے ہیں وہیں انگریزی کی بھی ان کے اندر بہتر صلاحیت موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ طلبا کو اپنے مضمون میں بہتر طریقے سے درس دیتے ہیں۔ طلبا کو درس دیتے وقت ان کا انداز بیان اتنا پرکشش ہوتا ہے کہ طلبا بڑی یکسوئی سے ان کے درس میں منہمک ہوجاتے ہیں۔ درس دیتے وقت اگر طلبا میں سے کسی نے سوال کردیا تو اچھی طرح پوری وضاحت کے ساتھ سمجھانا مولانا کے شعار میں سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بحیثیت استاذ مولانا ہمیشہ طلبا میں مقبول رہے۔ بحیثیت استاذ مولانا موصوف کے اندر اور بھی کئی اوصاف حمیدہ بدرجہ اتم موجود ہیں۔ مولانا طلبا کو ہمیشہ اپنے بچوں کی طرح دیکھتے اور ان سے بیحد محبت رکھتے ہیں۔ وہ طلبا کی ہر ضرورت میں پیش پیش رہتے ہیں۔ کبھی کسی ضرورت مند طالب علم کو انہوں نے پھٹکارا نہیں، اگر طلبا کی کسی غلطی پر انہیں ڈانٹنے کی نوبت آتی ہے تب بھی وہ کچھ اس انداز میں ڈانٹتے ہیں کہ اس سے بھی ان کی شفقت جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ہمیشہ طلبا کو خوب سے خوب تر کی جستجو میں سرگرداں رہنے کی ترغیب دیتے رہنا ان کی زندگی کا ایک اہم شعار بن چکا ہے۔ یہی سبب ہے کہ طلبا بھی ان سے بیحد ادب واحترام سے پیش آتے ہیں اور ان کے دل میں مولانا کی جو عظمت ہے اسے طلبا اپنا بیش قیمتی اثاثہ ہی سمجھتے ہیں۔ مدرسہ کے اوقات کے علاوہ ان کی

رہائش گاہ ہر وقت طلبا کے لیے کھلی رہتی ہے، کبھی بھی کوئی طالب علم اپنی کسی بھی طرح کی پریشانی لے کر وہاں پہنچ جاتا ہے اور مولانا ان کی پریشانی کو دور کرنے اور ان کے مسائل کو حل کرنے میں ان کی حتی الامکان معاونت فرماتے ہیں۔

مِلّی اداروں سے مولانا کی قربت: ملی عمارتوں سے مولانا کی قربت کچھ زیادہ ہی ہے اور یہ مولانا کی زندگی کا ایک اہم خاصہ ہے، کیونکہ ملی عمارتیں خصوصاً مسجدیں، عیدگاہیں اور مدارس وغیرہ کسی علاقے کے مسلمانوں کی آئینہ دار ہوا کرتی ہیں۔ یہ عمارتیں کسی علاقے کے مسلمانوں کی معاشیات، ان کی تہذیبی وثقافتی زندگی، ان کی تعلیم، ان کا مذہب سے لگاؤ، ان کی ذہنیت، غرض اس نوع کی دیگر تمام چیزوں کی عکاس ہوتی ہیں۔ جولوگ باشعور ہوتے ہیں وہ ان عمارتوں کو دیکھ کر ہی اس علاقے کے لوگوں کے متعلق کافی کچھ معلومات حاصل کر لیتے ہیں اور انہیں مزید کسی ذرائع سے ان کے متعلق اور کوئی علم حاصل کرنے کی ضرورت شاید نہیں کے برابر رہ جاتی ہے۔

اس نوعیت کے نیک اور عوامی کاموں کو بخوشی اور پوری کوششوں و پوری توانائیوں سے انجام دینا مولانا کی خمیر میں شامل ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ مولانا گاؤں کی مسجدوں اور عیدگاہوں سے بھی کافی دلچسپی رکھتے ہیں، خصوصاً تعمیری کام میں پیش پیش رہتے ہیں۔ برابر ان کی نگرانی و دیکھ ریکھ کرتے رہتے ہیں۔ اپنی سرپرستی میں ان تعمیری کاموں کو انجام دیتے ہیں۔ مشرقی محلے کی عیدگاہ خستہ حال تھی اور گزشتہ کئی برسوں سے آبادی میں اضافہ کے سبب عیدین کے مواقع پر عیدگاہ میں آئے نمازیوں کے لیے جگہ کی کمی شدت سے محسوس کی جارہی تھی، مولانا نے اسے محسوس کیا اور عید کے دوسرے روز چند نوجوان طلبا و دیگر معزز حضرات کو اپنے ساتھ لے کر عیدگاہ کی تعمیر نو و توسیع کے تعلق سے گاؤں میں تمام لوگوں سے رابطہ قائم کیا۔ لوگ کافی متاثر ہوئے اور اس عیدگاہ کی تعمیر نو و توسیع میں بڑھ کر مالی طور پر معاونت فرمایا۔ اس طرح مولانا نے اپنی سرپرستی میں عیدگاہ کی تعمیر و توسیع کا کام کروایا، رقم کی کمی کے سبب کچھ کام باقی رہ گئے، جنہیں امید کی جارہی ہے کہ مستقبل قریب پایہ تکمیل کو پہنچا دیا جائے گا۔ اس کام میں اگر مولانا کی ذات گرامی کی سرپرستی نہ ہوتی تو شاید اتنے پیسے دوسرے اکٹھا نہیں کر پاتے اور یہ کام شاید اس وقت نہ ہو پاتا۔

مغربی محلے کی عیدگاہ جوگاؤں سے گزرنے والی اہم شاہراہ کے کنارے واقع ہے۔ اس عیدگاہ کی بھی حالت ناگفتہ بہ بنی ہوئی تھی، دیواریں کافی مخدوش ہوچکی تھیں۔عوام وخواص میں یہ بات شدت سے محسوس کی جارہی تھی کہ اس عیدگاہ کی تعمیرنو کی جائے۔ مولانا نے بھی گاؤں کے لوگوں کی اس اہم ضرورت کوشدت سے محسوس کیااور کی تعمیرنو کی جانب اپنی توجہ مبذول کی۔ اس طرح مولانا موصوف نے اپنی سرپرستی میں اس عیدگاہ کی تعمیر جدید کا کام کروایا۔ یہ تعمیری کام ابھی بھی اپنے مراحل سے گزررہاہے۔

دوگھرا گاؤں کے پرانے قبرستان جوگاؤں کے مغربی کنارے پر واقع ہے، گرچہ وہ قبرستان دوگھرا کا ہےلیکن جغرافیائی اعتبار سے وہ لتراہا قبرستان کے نام سے جانا جاتا ہے، اس میں گھرا ہوجانے کی وجہ سے برسات کے دنوں میں پانی جمع ہوجاتا تھااور میت کودفن کرنے میں کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا، جسے مولانا نے اپنے گاؤں کے نوجوان طلبا کی تنظیم ’انجمن آوازنو‘ کے ذریعہ اپنی سرپرستی میں اس کے کچھ حصوں میں مٹی کے بھروانے کا کام کیا جس سے اب موسم باراں میں بھی بہ آسانی میت کودفن کیا جاتا ہے۔

بحیثیت پرنسپل: مولانا نے بحیثیت پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدی پٹنہ میں بھی بہت سے اہم اہم تعمیری کام انجام دیے ہیں جن کا تذکرہ نہ کیا جائے تو شاید مولانا کی شخصیت کے ساتھ انصاف نہیں ہوگااوراس مضمون کا بھی کماحقہ شایدادانہ ہوپائے۔ مولانا نے مدرسہ میں اپنے پرنسپل شپ کے زمانے میں جوتعمیری کام کروادیا ہے اسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ تعمیری کام کا جو سلسلہ ہے اس میں سب سے پہلے قابل ذکر ہے مدرسہ ہٰذا کے ہاسٹل شیش محل کی مرمت کا کام۔

ہاسٹل شیش محل: مدرسہ کا ایک ہاسٹل جوشیش محل کے نام موسوم ہے اس کے کئی کمرے کافی مخدوش ہوچکے تھےاور کسی بھی طرح ان کمروں کورہائش کے لیے استعمال نہیں کیا جاسکتا تھا، اس لیے ان کمروں میں کوئی بھی طلبا نہیں رہ رہے تھے، وہ یونہی خالی تھے۔ مولانے پرنسپل کا عہدہ سنبھالنے کے قبل ہی اپنی جدوجہداور دوڑ دھوپ کرکے اس کی بہترین مرمت کروائی اوراسے رہنے کے لائق بنادیا۔ اس میں کچھ کام باقی رہ گئے تھے، جنہیں مولانا نے پرنسپل کا عہدہ سنبھالنے کے

بعد مکمل کروایا۔ ہاسٹل کے اس عمارت میں از سر نو چھت کی ڈھلائی کروائی اور دیواروں کی عمدہ پینٹنگ کروائی جس سے یہ عمارت بالکل نئی لگنے لگی۔ اس ہاسٹل کی انگنائی میں بھی پہلے کافی غیر ضروری چھوٹے چھوٹے پودے اگ آئے تھے جس سے یہ جنگل نما لگنے لگا تھا مولانا نے پوری انگنائی میں از سر نو سیمنٹ کا کام کروایا جس سے انگنائی بیحد خوبصورت اور پختہ ہوگئی۔ اب اس انگنائی میں طلبا نے خود سے بیڈمنٹن کورٹ بھی بنالیا ہے جس سے اس کی خوبصورتی میں اور بھی چار چاند لگ گیا۔

شیش محل ہاسٹل کے ٹھیک مشرق کی طرف مدرسہ کا بیت الخلا واقع ہے، جو کئی برسوں سے خستہ حالی کا شکار تھا، اور وہاں پر کافی گندگی بھی لگی رہتی تھی، مولانا نے اس جگہ کی اچھی صفائی کروائی اور اسے بھی از سر نو تعمیر کروایا۔

پانی کا بہتر انتظام: مولانا موصوف کی کوششوں کا ہی نتیجہ ہے کہ جہاں مدرسہ کے احاطہ میں پانی صرف صبح اور شام کو آتا تھا، جس کے سبب طلبا و دیگر ملازمین پریشان رہا کرتے تھے۔ غسل کرنے، کپڑے دھونے، کھانا بنانے کے و دیگر ضروریات کے لیے ایک طرح سے پانی کے تعلق سے ذہنی الجھن بنا رہتا تھا اور ایک ہی وقت میں نلوں پر بھیڑ اکٹھی ہو جاتی تھی جس کے سبب دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ جب کوئی ایک اپنی ضرورت پوری کر رہا ہوتا تو دوسرے کو اس وقت تک انتظار کرنا پڑتا تھا۔ مولانا نے مدرسہ کے اندر پانی کی اس قلت کو شدت سے محسوس کیا اور اس مسئلہ کی طرف توجہ دی اور احاطہ کے اندر پانی سپلائی نظام کو بہتر بنانے کی بھی پوری کوشش کی۔ انہوں نے اس سمت میں بہتر قدم یہ اٹھایا کہ مدرسہ کے احاطہ میں ہی بورنگ کروادی، جس سے پانی کی قلت ختم ہوگئی۔ اب مدرسہ کے احاطہ میں ہر وقت پانی مہیا رہتا ہے۔

لائبریری کا قیام: مدرسہ کے احاطہ میں پرنسپل کی رہائش گاہ کے ٹھیک سٹے شمال کی طرف جو جگہ بچی تھی، جس میں کئی تناور درخت لگے ہوئے تھے اور وہ جگہ اب تک یونہی بے مصرف تھی، مولانا نے موقع کی نزاکت اور مدرسہ کے طلبا کی ضرورت کو سمجھتے ہوئے اس میں شاندار لائبریری کی تعمیر کروائی۔ یہ لائبریری بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں جہاں بہت سی اہم اور نادر کتابیں موجود ہیں وہیں اس لائبریری میں کئی اہم مخطوطے بھی ہیں جن سے طلبا اپنے تحقیقی کاموں میں کافی استفادہ کرتے ہیں۔

پہلے مدرسہ ہذا کے طلبا کو تحقیقی کام کرنے میں انتہائی دشواریوں وجاں فشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور دیگر لائبریریوں کی خاک چھاننی پڑتی تھی۔ مدرسہ کے احاطہ میں لائبریری ہونے سے طلبا کے لیے بہت سہولت ہوگئی ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ دیگر لائبریریوں میں آنے جانے میں جو وقت صرف ہوتا، اس سے طلبا کو نجات مل گئی۔ اب کسی بھی وقت اپنے مطلب کی کتاب حاصل کر کے اپنے مطلب کے ٹاپک کا مطالعہ کرتے ہیں۔

پرنسپل کوارٹر کے سامنے لان کی احاطہ بندی: پرنسپل کی رہائش گاہ کے ٹھیک سامنے ایک لان ہے، جس میں کئی پھول کے خوبصورت پودے لگے ہوئے تھے، مگر وہ پودے محفوظ نہیں تھے، باہر کے لوگ پھولوں کو توڑ لیا کرتے تھے، ساتھ ہی محلے کے بچے بھی کرکٹ وغیرہ کھیلنے پہنچ جاتے تھے، جن کے باعث ان پودوں کو بھی کافی نقصان پہنچتا تھا اور ان کی خوبصورتی پر بھی آنچ آتی تھی۔ مولانا موصوف نے اس لان کی گھیرابندی کروائی اور اس میں ایک لوہے کا گیٹ لگوادیا۔ اس کام سے جہاں اس کی ہیئت بدلی، اس کی خوبصورتی میں اضافہ ہوا وہیں اب پرنسپل کی رہائش گاہ کے سامنے کی رونق بھی دوبالا ہوگئی اور پودے بھی پوری طرح محفوظ ہوگئے۔

مدرسہ میں مزید نئے کلاس روم کی تعمیر: مولانا موصوف کی کوششوں کے ذریعہ مدرسہ کے اندر بہت سے تعمیری کام انجام پائے ہیں، ان میں ایک ہے مدرسہ میں نئے کلاس روم کی تعمیر۔ مدرسہ کی عمارت پہلے یک منزلہ تھی یعنی گراؤنڈ فلور کے اوپر ایک اور منزل لیکن اس منزل پر تعمیر پوری نہیں ہوسکی تھی۔ صرف کچھ ہی کمرے تھے، مولانا نے اپنی جدوجہد کے ذریعہ اس تعمیر کو مکمل کرایا اور مزید کئی کمروں کا اضافہ کیا، جس کے سبب اب طلبا کو کلاس کرنے میں بڑی سہولتیں ہوگئی ہیں۔

نوری پارک کی احاطہ بندی: شیش محل کے ٹھیک شمال کی جانب ایک اور پارک ہے جو نوری پارک کے نام سے موسوم ہے۔ اسی پارک میں 15 اگست (یوم آزادی) کو اور 26 جنوری (یوم جمہوریہ) کو پرچم کشائی بھی جاتی ہے۔ اس پارک میں بھی کئی اہم پودے لگے ہوئے ہیں، جنہیں یا تو جانوروں کے ذریعہ یا پھر طلبا یا دیگر بچوں کے کھیلنے کے سبب کافی نقصان پہنچتا تھا، اسے دیکھتے ہوئے مولانا نے اس طرف بھی اپنی توجہ دی اور اس طرح اس پارک کی احاطہ بندی کروادی۔ اس سے

جہاں پارک کی خوبصورتی میں اضافہ ہوا وہیں سارے پورے محفوظ ہو گئے۔ اب مدرسہ کے طلبا بھی شام کو تفریحاً اس میں بیٹھ جاتے ہیں اور جاڑے کے موسم میں تو دھوپ خوری کی غرض سے طلبا اپنی کتابیں لے کر اس پارک میں آجاتے ہیں اور یہاں بیٹھ کر گھنٹوں مطالعہ میں غرق رہتے ہیں اور جاڑے کی سنہری دھوپ کا مزا بھی لیتے ہیں۔

**مدرسہ کے تاریخی ہال کی جدید کاری:** اس مدرسہ میں ایک تاریخی ہال بھی ہے، جو کافی وسیع و عریض ہے۔ جس میں اہم میٹنگیں یا اس نوعیت کے دیگر پروگراموں کا انعقاد بھی کیا جاتا ہے۔ اس حیثیت سے مدرسہ کا یہ تاریخی ہال بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس ہال بھی خستہ حالی کا شکار بنا ہوا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس ہال کے در و دیوار اس کی خستہ حالی کی ایک خاموش صدا آرہی ہو اور وہ اپنے محسن سے اس کی مرمت کی دہائی دے رہے ہوں۔ مولانا ابوالکلام قاسمی کی نگاہ اس ہال پر بھی گئی اور جہاں انہوں نے مدرسہ کی خوبصورتی اور اس کی دیدہ زیبی میں اضافہ کے لیے اتنے سارے تعمیری کام کروائے وہیں انہوں نے اس ہال میں بھی کافی بہتر طریقہ سے مرمت کام کروایا اور رنگ روغن کروایا جس کے باعث یہ تاریخی ہال جہاں صاف شفاف، خوبصورت ہو گیا وہیں از سر نو اس میں مزید پائیداری بھی آگئی۔ مدرسہ کے اس ہال سے محلے اور علاقے کے لوگوں کو بھی کسی نہ کسی شکل میں فائدہ پہنچتا رہتا ہے۔

**پرنسپل کی رہائش گاہ کی جدید کاری:** مولانا موصوف نے جب پرنسپل کا عہدہ سنبھالنے کے چند ماہ بعد مدرسہ ہذا کے احاطہ میں ہی تعمیر شدہ پرنسپل کوارٹر میں رہائش اختیار کی تو اس وقت عمارت کی حالت کچھ بہتر نہیں تھی۔ مولانا نے اس کی پوری طرح مرمت کروائی، اس میں سلیقہ سے فرش کا کام کروایا، اور مہمان خانہ میں دیواروں پر خوبصورت ٹائلس لگوائے جس کے سبب اس میں جہاں پائیداری آئی وہیں اس کی زیب و زینت میں بلاشبہ خاصا اضافہ ہوا۔ مولانا کی تعمیری کاموں میں یہ بھی ایک کام ہے۔

**مدرسہ ہذا میں شعبہ کمپیوٹر کا قیام:** مولانا نے اپنے زمانے میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ کو جدید ٹیکنالوجی سے بھی آراستہ کرنے کی حتی الوسع کوشش کی اور اس طرح مدرسہ میں شعبہ کمپیوٹر کا آغاز کیا۔ یہ شعبہ روز اول سے ہی بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر رہا ہے و مدرسہ کے طلبا اس سے گزشتہ کئی

برسوں سے مستفید ہو رہے ہیں۔ طلبا کو فراغت کے بعد اب روزی روٹی کے متعلق زیادہ سوچنا نہیں پڑتا اور نہ ہی زیادہ پریشان نہیں ہونا پڑتا۔ انہیں کہیں بھی کسی ادارے میں کمپیوٹر آپریٹر کی حیثیت سے ملازمت مل جاتی ہے۔ اس تعلق سے یہ بہت ہی خوش آئندہ بات ہے کہ یہاں کے طلبا روزگار کے تعلق سے احساس کمتری کے شکار نہیں ہوتے۔ مولانا کا یہ کام مدرسہ اور اس کے طلبا کے لیے انتہائی اہمیت کا حامل اور ایک مستحسن قدم ہے۔ یہ مولانا کی تعمیری ذہنیت، فعالیت و کرشماتی شخصیت کا ہی نتیجہ ہے کہ آج مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کی تصویر پہلے سے بہت حد تک بدل چکی ہے اور ماشاء اللہ مدرسہ ہر سطح پر ہر شعبہ میں ترقی کی راہ پر زور وشور سے گامزن ہے۔

**کانفرنسوں میں مولانا کی شرکت:** مولانا نے اب تک تقریباً پچاس سمیناروں و کانفرنسوں میں شرکت کی ہے، جن میں سے چند کی تفصیل پیش خدمت ہے۔

- ☆ پٹنہ یونیورسٹی کے عربی نصاب کی جدید کاری پر سمینار (1978)
- ☆ اعظم گڑھ میں فقہ اکیڈمی کی جانب سے منعقد سمینار (1975)
- ☆ مسلم پرسنل لاء کے موضوع پر بنگلور میں منعقد سمینار (2000)
- ☆ مدرسہ کے نصاب کی جدید کاری کے موضوع پر دہلی میں منعقد سمینار (2000)
- ☆ مدرسہ کی جدید کاری کے موضوع پر منعقد سمینار (2001)
- ☆ امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ میں مولانا محمد سجاد کی حیات وخدمات کے موضوع پر منعقد سمینار (1999)
- ☆ رابطہ ادب اسلامی کے موضوع پر منعقد سمینار (1999)
- ☆ حاجی پور ویشالی میں مولانا ثناء الہدیٰ قاسمی کی حیات وخدمات کے موضوع پر منعقد کانفرنس (2001)
- ☆ مظفر پور میں مولانا عبدالحنان کی حیات وخدمات کے موضوع پر منعقد سمینار (2002)
- ☆ پٹنہ میں آل انڈیا پرشین ٹیچرس کے موضوع پر منعقد کانفرنس (2002)

**مولانا کے ذریعہ منعقدہ سمینار یں:** مولانا کی شخصیت میں چونکہ اصلاحی پہلو بدرجہ اتم

موجود ہے، جس کا ثبوت گاہے بگاہے مولانا کی ذات پیش کرتی رہتی ہے۔ مولانا نے اپنی زندگی میں کئی سمیناروں کا انعقاد کیا ہے، جن میں کچھ خاص کا تذکرہ یہاں میں ضروری سمجھتا ہوں، جو مندرجہ ذیل ہیں:

☆ مدارس کے نصاب کی جدید کاری کے موضوع پر کانفرنس۔

☆ فارسی اساتذہ کے موضوع پر مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ میں سمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں اساتذہ، چیئر پرسن اور ایرانی سفارتخانہ کے قونصل حضرات نے شرکت کی۔

☆ رابطہ ادب اسلامی کے موضوع پر سمینار

☆ امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی حیات وخدمات کے موضوع پر سمینار

☆ پیام انسانیت کے موضوع پر کانفرنس

ایوارڈ: مولانا تعلیم اور دیگر میدانوں میں قائدانہ رول ادا کرنے والے اہم ترین ومعزز ترین لیڈروں کی ڈائریکٹری میں نامزد کیے گئے۔ انہیں ایجوکیشن اینڈ ڈسٹنگوش ایوارڈ AB15126 USA سے نوازا گیا۔

سفر امریکہ: امریکہ کے ذریعہ منعقد کیے گئے ویزیٹر پروگرام کے تحت مولانا سال 2003 میں امریکہ کے دورے پر بھی گئے۔ وہاں موصوف کا قیام تین ہفتے تک رہا۔ اس دوران موصوف کو امریکہ کے متعدد تعلیمی، مذہبی وثقافتی اداروں نیز وہاں کے لوگوں کی طرز زندگی، وہاں کی تہذیب وتمدن، وہاں کے لوگوں کی معاشرت، نیز وہاں کے حسین قدرتی مناظر کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، جس کا تذکرہ مولانا موصوف نے اپنی تصنیف ''تین ہفتے امریکہ میں'' بڑی خوبصورتی سے کیا ہے۔

اعزازات:

مولانا نے پہلا اعزاز 5 ستمبر 1995ء کو بہار پردیش کانگریس کمیٹی کی جانب سے عطا کیا گیا 4 اکتوبر 1997 کو پٹنہ میں ہی بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کی جانب سے اعزاز سے نوازا گیا۔

5 ستمبر 1999 کو یوم اساتذہ کے موقع پر نئی دہلی میں قومی ایوارڈ سے نوازا گیا۔
امریکی بائیوگرافیکل سینٹر یوایس اے کی جانب سے سال 2003 کا ''مین آف دی ایئر'' ایوارڈ سے نوازے گئے۔

مولانا نے 2003 میں حکومت امریکہ کی جانب سے اعزازی طور پر امریکہ کے دورے پر گئے جہاں سے لوٹنے کے کچھ دنوں بعد ایک کتاب منظر عام پر آئی اور وہ ہے ''تین ہفتے امریکہ میں''
اس کے علاوہ مولانا موصوف نے متعدد سمینار میں شرکت اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مولانا نے بذات خود کم ازکم اب تک پانچ سمیناروں کا انعقاد کیا ہے جس میں ''پیام انسانیت'' ''مدرسہ کے نصاب کی جدید کاری'' ''رابطہ ادب اسلامی'' ''
امام ابوحنیفہؒ کی زندگی اوران کے کارنامے'' اپنی مثال آپ ہیں۔

مولانا ابوالکلام قاسمی بحیثیت ماہر تعلیم: مولانا کی زندگی کا اگر بہ نظر غائر مطالعہ کیا جائے تو ان کی زندگی کے کئی اہم جہات ابھر کر سامنے آتے ہیں، تمام کو کسی ایک عنوان کے تحت سمیٹ دیا جائے تو یہ ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں کے ساتھ انصاف نہیں ہوگا جیسا کہ حق ہے۔ لہٰذا میں نے ضروری سمجھا کہ موصوف کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر علیحدہ علیحدہ قلم اٹھا کر اسے اجاگر کرنے کی کوشش کروں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے میں آرہا ہوں اس پہلو کی طرف جو اگر پوری طرح سے نہیں تو کسی حد تک ضرور ہی تمام پہلوؤں پر حاوی نظر آتی ہے اور وہ ہے 'مولانا بحیثیت ماہر تعلیم'۔ اس حیثیت سے مولانا شروع سے ہی علمی حلقے میں اس شعبہ کے ماہر سمجھے جاتے ہیں اور بلاشبہ یہی سبب ہے کہ جب کہیں تعلیم یا تعلیمی نصاب پر نظر ثانی کے تعلق سے کسی جلسہ یا سمینار کا انعقاد کیا جاتا ہے تو مولانا موصوف کو ضرور مدعو کیا جاتا ہے تاکہ نصاب میں ترمیم و تنسیخ یا تصحیح کے تعلق سے مولانا کی جو آرا ہیں ان سے استفادہ کیا جاسکے۔ سال 1978 میں جب پٹنہ یونیورسٹی کے عربی کے نصاب کی جدید کاری کے موضوع پر سمیار ہوا تو مولانا کو مدعو کیا گیا اور مولانا نے اس سمینار میں شرکت اور اس سلسلے میں اپنے بیش قیمتی خیالات کا اظہار کیا جو بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس حیثیت سے مولانا 1975 میں اعظم گڑھ میں فقہ اکیڈمی کی جانب سے منعقدہ سمینار میں شرکت کی اور اپنی بیش قیمتی آراء

سے اہل علم وسامعین کونوازا۔

اسی طرح سال 2000 میں جب ملک کی راجدھانی دہلی میں مدرسہ کے نصاب کی جدید کاری کے موضوع پر سمینار کا انعقاد کیا گیا تو اس موقع پر بھی مولانا کو مدعو کیا گیا اور مولانا نے دیگر مصروفیات کو ترک کرتے ہوئے اس سمینار میں شرکت کی اور مدارس کے نصاب کی جدید کاری کے کیا اثرات مرتب ہو سکتے ہیں، ان کے کیا فوائد ہو سکتے ہیں اور اگر جدید کاری کی جائے تو کس انداز میں، اس جدید کاری کو مدرسہ کے نصاب کے کن کن گوشہ پر نافذ کیا جائے اس تعلق سے بہت سے اہم نکات جوان کے ذہن میں آئے ان سے لوگوں کونوازا۔

پھر سال 2001 میں مدرسہ کی جدید کاری کے موضوع پر سمینار میں مولانا نے شرکت کی اور مدرسہ اسلامیہ کی جدید کاری کے فوائد اور اس کے ممکنہ خامیوں کی جانب توجہ دلائی اور ان امور پر بھر پور روشنی ڈالی۔

اس چھوٹے سے مضمون میں یہ ممکن نہیں ہے کہ مولانا کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا جاسکے کیونکہ مولانا کی ذات اپنے آپ میں ایک دفتر ہے۔ مولانا کی حیات اور خدمات کو دیکھتے اگر یہ کہا جائے کہ مولانا ابوالکلام قاسمی کی ذات آسمان علم وادب کے افق پر ایک ایسے تابندہ ودرخشندہ ستارہ کی مانند ہے جس کی روشنی دور تک بکھرتی ہوئی نظر آرہی ہے تو شاید مبالغہ نہ ہو۔ خدا مولانا کی عمر دراز کرے اور علمی دنیا پر ان کا سایہ تادیر قائم رکھے۔ آمین!

☆سینئر سب ایڈیٹر روزنامہ انقلاب، پٹنہ

# خدمات
# و
# تاثرات

(۱)

# مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی

پروفیسر وہاب اشرفی

ان کا اصل نام ابوالکلام ہے۔ ۲۵ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو دربھنگہ میں پیدا ہوئے۔ وسطانیہ، فوقانیہ، مولوی، عالم، فاضل فارسی، فاضل اردو، فاضل حدیث اور فاضل عربی ادب کے بعد انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے۔ میٹرک اور انٹرمیڈیٹ کے بعد اردو آنرس بھی کیا اور ایم اے کی ڈگری بھی لی۔ عربی میں بھی ایم اے ہوئے اور ٹیچر کی ٹریننگ لی۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں درس وتدریس کے فرائض انجام دینے لگے اور ترقی کرتے ہوئے 1997 میں پرنسپل ہو گئے۔

موصوف نے عربی میں کئی کتابیں مرتب کی ہیں اور اردو ادب میں بھی قابل لحاظ کام کیا۔ اردو کی ایسی تمام کتابوں میں ''تذکرہ علمائے بہار'' کی بڑی اہمیت ہے۔ اس کی پہلی جلد ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئی۔ دوسری زیر طبع ہے۔ پہلی جلد میں پانچ سو علماء کا تذکرہ ہے اور دوسری جلد میں بھی تقریباً یہی تعداد ہے۔ تذکرہ علمائے بہار کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں کچھ ایسے علمائے دین ہیں جو باضابطہ شاعر وادیب بھی رہے ہیں، ان میں بعض تو صاحب دیوان شاعر ہیں۔ خصوصاً پھلواری شریف کے علماء اور بزرگوں میں اچھی خاص تعداد شعرائے کرام کی ہے جن کے مسودات آج بھی وہاں کی

لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔مخطوطات کی اچھی خاصی فہرست ہے، گویا مولانا ابوالکلام قاسمی کی متعلقہ کتاب کے دونوں حصے ایسی رہنمائی کرتے ہیں جن کی بنیاد پر بعض گمشدہ یا فراموش شدہ شاعروں اور مصنفوں تک پہنچا جاسکتا ہے۔سبھی جانتے ہیں کہ قدیم مرثیوں کا ایک بڑا خزانہ پھلواری شریف کی خانقاہوں کے کتب خانوں کی زینت ہیں۔گاہے بگاہے ان پر توجہ جاتی رہی ہے،لیکن نہ تو پورا سرمایہ کسی کی نگاہ میں ہے، نہ ہی ایسے مخطوطات اور مسودہ کی اشاعت کا کوئی سلسلہ قائم ہوا،تذکرہ علمائے بہار کے حوالے سے بہت سی اہم کتابوں اور شاعروں تک رسائی ممکن ہے گویا یہ ایک ''دستاویزی'' کتاب ہے، جس کی طرف اہل علم کی توجہ ہونی چاہئے ،متعلقہ دونوں کتابوں کے ماخذ پر ایک نگاہ ڈالی جائے تو الف سے یا تک دوسوتراسی ۲۸۳ کتابوں کا یا مسودوں کا ذکر ہے، جن سے تذکرہ مرتب کیا گیا ہے۔ان کے علاوہ ۴۴ رکتابیات کی فہرست درج ہے، جو مختلف نوعیت سے کسی نہ کسی طرح اس کتاب میں حوالے کے طور پر استعمال ہوئی ہیں۔اس لحاظ سے تذکرہ علمائے بہار کی ادبی اہمیت ہے جس کی طرف ہمارے محققوں اور نقادوں کی توجہ ہونی چاہئے۔

مولانا ابوالکلام قاسمی کا اسلوب رواں اور شگفتہ ہے۔انتہائی جاذبیت اور اختصار سے وہ موضوعات کو سمیٹ لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

مولانا نے ایک سفرنامہ بھی قلم بند کیا ہے۔انہوں نے ماہ اپریل ۲۰۰۳ء میں امریکہ کا سفر کیا تھا۔ تین ہفتے پر مشتمل یہ سفرنامہ کئی لحاظ سے اہم ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسری باتوں کے علاوہ امریکہ کے مذہبی ادارے، اسلامک اسکول، اسلامک اسٹڈیز، اسلامک آرگنائزیشن کی تفصیل موجود ہے۔لہٰذا یہ ایک الگ نوعیت کا سفرنامہ ہے اور کئی لحاظ سے اہم ہے۔مولانا نے جو دینی، مذہبی موضوعات پر سیر حاصل گفتگو کی ہے، وہ میرے دائرۂ عمل سے باہر ہے، اس لئے میں ان پر کوئی روشنی ڈالنا ضروری نہیں سمجھتا اور نہ یہ میرے بس کی بات ہے۔قاسمی کا ادبی سفر جاری ہے۔

(تاریخ ادب اردو جلد دوم وہاب اشرفی صفحہ ۱۴۰)

## (۲)

# مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی۔تذکرہ علمائے بہار کی روشنی میں

ڈاکٹر کلیم عاجزؔ

حضرت مولانا ابوالکلام قاسمی کی کتاب تذکرہ علمائے بہار حصہ دوم میرے سامنے ہے۔میں کیا رائے دوں اور کیا تبصرہ کروں، اس دور میں رائے اور تبصرہ کا رواج عام ہے، جس پر چاہے رائے دے دو، جو چاہے رائے دے دے اور جیسی رائے چاہے دے دے، کوئی رائی ہے نہ دہائی ہے۔ہم اپنے سوا ہر ایک شخص پر ہر ایک چیز پر تبصرہ کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں کہ یہ جمہوریت کی آزادی گفتار ہے، جو چاہے جس کا جی کرے جو چاہے کہے، جو چاہے لکھے، جیسے چاہے لکھے۔رشدی نے کتاب لکھی اس پر اعتراض ہوا، تو وہ کتاب اپنی حیثیت اپنی اصلیت سے بہت زیادہ قیمتی بن گئی۔میں نے وہ کتاب کہیں دیکھی۔ابتدائی کچھ صفحات دیکھے تو یہ نہیں لگا کہ اس میں قابل اعتراض بات، دکھ کی بات، گرفت کی بات، ناجائز بات شروع کے آخر تک ہے۔میں نے تو شروع ہی کی یہ سمجھ کر کہ یہ کتاب ہے اور ایک بہت بڑے مصنف کی کتاب ہے، تو شروع کرتے ہی ایسا لگا کہ اس سے اچھی بات تو ہم کہہ سکتے ہیں۔اس سے اچھی تحریر اگر ہم کو انگریزی پر عبور ہوتا تو ہم لکھ سکتے تھے۔یعنی یہ کہ تصنیف کی حیثیت سے کسی صنف ادب کی تخلیق کے اعتبار سے ہمیں وہ کتاب ایسی بھی نظر نہیں آئی کہ اس کی طرف اعتنا کی نظر کی جائے۔ایک کتاب، بہت سی کتابیں بازاروں میں آتی ہیں۔تین پیسے کی ہیں،

تین آنے کی ہیں، تین روپئے کی ہیں، تین سو روپئے کی بھی ہیں۔ ایک چالو کتاب میری ہے۔

ولیکن قلم درکف دشمن ست

یہ بات زمانے سے چلی آرہی ہے کہ جس کے اختیار میں قلم ہے، جس کے اقتدار میں قلم ہے وہ جھوٹ کو سچ میں منوالے گا۔ کاہ کو کوہ میں منوالے گا، رائی کو پہاڑ بھی منوالے گا اور ہم یا کوئی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا۔

تو جھوٹ بول کے مات بھی اس کو کردے گا

میں جانتا ہوں کہ اس بات پر ہے قادر تو

تو یہ ہو رہا ہے۔ تو بہر حال مولانا کی یہ کتاب میرے سامنے ہے اور مجھ پر یہ عالم ہے کہ سینے کے اندر جذبات کا ہجوم ہے۔ اس لئے گفتار کے اسلوب پر قابو نہیں۔ اس لئے کہ میں نے علماء اور مشائخ کے سائے میں آنکھیں کھولیں اور بہت دیر تک یہ آنکھیں انہیں کے سائے میں کھلی رہیں، تا آنکہ بیس سال کا ہو گیا اور پھر پردہ کھینچ لیا گیا اور آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ میرے گھر میں، میری بستی میں جب وہ کچھ اینٹ، کچھ مٹی، کچھ پھونس کے گھروں کی بستی تھی، کتنے عالم تھے، مجھے گنتی نہیں یاد ہے، یعنی گو بے شمار عالم نہیں تھے مگر آٹھ تھے، دس تھے، بارہ تھے، یہ مجھے یاد نہیں، مگر علماء تھے مٹی کے گھروں میں اور ان علماء کے اثرات یافتہ لوگ مٹی کے گھروں میں بھی تھے، پھونس کے گھروں میں بھی اور اینٹ کے گھروں میں بھی۔ وہاں کھلواڑ بھی تھے، سنجیدہ اور گمبھیر بھی تھے، کاشت کار اور زمیندار بھی، مزدور بھی، معمار بھی، اور یہ سب لگتے تھے کہ مولوی صاحب کے خاندان کے ہیں۔ جیسے عنایت میاں معمار اور تہدوں میاں حلال خور۔ جب بھی شام کو یہ دونوں میرے نانا مولوی ضمیر الدین کی چوکی پر بیٹھ کر باتیں کرتے تو کسی اجنبی کا یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا کہ ان میں کون معمار ہے اور کون مزدور، اور کون مولوی صاحب۔ بیس سال پر پردہ گرا اٹھا تو سارا فرق نمودار ہو گیا۔ میری بستی میں سب سے کمتر درجے کے مولوی صاحب مولوی چمرو صاحب تھے۔ بات کہیں کی بہکی بات کہیں کا۔ کرتہ اور مارکین کی ٹوپی پہنے گھومتے رہتے تھے۔ میری کمسنی میں بتایا، ایک کمرے میں پوسٹ آفس کھلا باہر لیٹر بکس لگا دیا، تو مولوی چمرو صاحب نے برجستہ کہا۔

یکم فروری روز منگل شدی

کھلا پوسٹ آفس تیلہاڑہ میں جی

کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ شعر نہیں ہے یا یہ شعر غلط ہے، چاروں شانے چت ہیں۔ یہ کہہ سکتے ہیں کہ آج دوسو تین سو سال پہلے کے کسی استاذ کا شعر ہے، تو یہ مولوی صاحبان سب کچھ تھے۔ آخرت والے بھی اور دنیا والے بھی۔ یہ مزدور بھی تھے اور رئیس بھی۔ میر محفل بھی اور فقیر راہ بھی۔ ہر محاذ پر چست تھے۔ باتیں کرتے تو کسی کا باتیں کرنا دشوار کردیتے۔ بڑے بڑوں کا منہ بند کردیتے۔ سجدوں کے امام بھی تھے اور قاضی بھی تھے۔ سپاہی بھی تھے۔ وقت آیا تو مولوی عبدالحفیظ صاحب، مولوی عابد خیر صاحب، مولوی چمرو میاں لاٹھی اٹھائی، تلوار لے کر دشمنوں کے بحر ذخار میں کود گئے۔ جان دے دی، اس لئے کہ جان دی ہوئی اسی کی تھی، بخالت کیوں کرتے۔

تو علماء دین کے محافظ و مددگار بھی، دنیا کے سپہ سالار بھی۔ میری نگاہوں میں ایسے ہی علماء ہیں اور اس وقت بھی دین اور زبان وادب کے محافظ و مددگار بھی ہیں۔ اب نگاہیں اٹھتی ہیں تو سایہ یہیں نظر آتا ہے، پناہ گاہ یہیں نظر آتی ہے۔ آس انہیں سے ہے، امید انہیں سے ہے۔ اسلام کی تاریخ انہیں کی بنائی ہوئی، بادشاہوں کے رہنما بھی تھے۔ حکمرانوں کی نگہداشت انہیں کا منصب تھا۔ خواص کی خیریت انہیں سے تھی، عوام کی تربیت انہیں سے تھی۔

حضرت مولانا ابوالکلام قاسمی نے نہایت ہی عمدہ موضوع منتخب کیا، گرچہ علماء کا حال بہت تفصیل سے نہیں ہے، مگر ان کے علمی جدوجہد اور تعلیمی خدمات کا ذکر تفصیل سے ہے۔ جو کچھ ان علماء حضرات نے کمایا ہوگا وہ تو قوم وملت کی جھولی میں داخل ہیں۔ جھولی میں آیا تو خرچ بھی ہوا۔ یہ تاریخ اور یہ تذکرہ مبارک ہے۔ ان کا نام زندہ ہے، تو ان کا کام بھی کسی نہ کسی حد تک زندہ رہے گا۔ نام پڑھ کر بھی حوصلہ بڑھے گا، تو آئندہ اور بھی کام ہوگا۔ ہندوستان میں اس وقت اردو کے نام پر واویلا ہے۔ واویلا وہی کرتے ہیں جو سودا کرتے ہیں۔ کام کرنے والے واویلا نہیں کرتے، شور نہیں کرتے، جھگڑا نہیں کرتے، کام نہیں ہوتا ہے تو یہی سب ہوتا ہے۔ اور اس وقت علماء ہی کا ادارہ ہے۔ بڑا چھوٹا جیسا بھی ہو، جہاں بھی ہو، دین کی حفاظت بھی اور زبان وادب اور تہذیب کی بھی، حفاظت کا سامان یہیں سے

پہلے بھی ہوا۔ دین زبان وادب، تہذیب، عقیدہ، ایمان سب کچھ غارت کرنے کا سامان کرکے دشمن اٹھے، تو یہی داڑھی ٹوپی والے کمر کس کر میدان میں آ گئے۔ گرے بھی، مرے بھی، لیکن حملہ کو تو روک ہی لیا۔ حملہ علی گڑھ سے نہیں رکا، جامعہ ملیہ اسلامیہ سے نہیں رکا، رکا تو ان سے جو گلی گلی، شہر شہر بھیک مانگ کر لائے۔ اپنے گھر میں، جھونپڑیوں میں، مکانوں میں حفاظت کا سامان، حفاظت کا بندوبست کرنے لگے اور اب تک کر رہے ہیں۔ میں مدرسوں میں جاتا ہوں تو میری آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ جاتی ہیں اور کبھی کبھی ان کو روکنا اور سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے، تو میں زور سے رو پڑتا ہوں۔ سڑکوں پر وردیوں میں، سوٹ ٹائی پہن کر بچوں کو اسکول جاتے دیکھتا ہوں، رکشوں پر، بسوں میں، کاروں میں، موٹر سائیکلوں پر۔ پھر ان کی زندگی دیکھتا ہوں اور پھر دیکھتا ہوں کہ میلے کپڑوں میں، ٹوپیوں میں چھوٹے چھوٹے بچے قرآن شریف پڑھ رہے ہیں اور کھڑے ہو کر قرآن شریف سنا رہے ہیں۔ اردو کی نعت پڑھ رہے ہیں۔ حمد سنا رہے ہیں تو زور سے رو کر کہتا ہوں کہ اے اللہ! تو گواہ رہ کہ تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے نام کو یہ غریب یتیم بچے اپنے سینے سے لگا کر چٹائیوں پر جھوم جھوم کر اعلان کر رہے ہیں کہ

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام ونشاں ہمارا

(۳)

سلمان الحسيني الندوي

رئيس : جامعة الإمام أحمد بن عرفان الشهيد
رئيس : جمعية شباب الإسلام، الهند
عميد : كلية الدعوة والإعلام بدار العلوم لندوة العلماء لكناؤ، الهند

Salman Al-Husaini Al-Nadwi

Rector : Jamia Tul-Imam Ahmad Bin Irfan Ash-Shaheed
President: Jamiat-u-Shabab-il-Islam
Dean : Kulliyatud Dawah Wal-Elaam
Darul Uloom Nadwatul Ulama Lko.

الرقم Ref.

التاريخ Date

بسم اللہ الرحمن الرحیم

’’تسہیل القرآن‘‘ نامی آسان ترجمۂ قرآن میرے سامنے ہے، یہ مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی صاحب کا شاہ کار ہے، قرآن پاک کی خدمت کسی شکل میں بھی ہو، دربار نبوی ﷺ سے اس کی افضلیت اور عظمت کی سند پہلے ہی سے ملی ہوئی ہے، ’’خیرکم من تعلم القرآن وعلّمه‘‘۔

لاکھوں، کروڑوں عوام کی تعلیم کا اس سے بہتر ذریعہ کیا ہوگا کہ قرآن پاک کے مطالب ومضامین سے واقف کرایا جائے، قرآن پاک کے حقائق سے فضاؤں کو معطر اور دلوں کو منور کردیا جائے۔

نبی اکرم ﷺ کا احسان تو پوری انسانیت پر ہے، اور ایسا ازلی اور ابدی ہے کہ لوح محفوظ سے آسمان دنیا، اور آسمان دنیا سے قلوب انبیاء ومرسلین کی زبانیں اس کے ذکر سے تر ہیں، اور تا قیامت امت میں یہ سلسلہ باقی رہے گا، پھر ابدالآباد کے لیے اسی کے توسط سے جنت کی آبادیاں نعمتوں سے سرشار ہوں گی۔

مفسرین صحابہ نے دنیا کے اطراف واکناف کو نور قرآنی سے جگمگایا، پھر ان کے نقش قدم پر چلنے والوں کی تو کوئی گنتی ہی نہیں ہے، جب رہے اور جہاں رہے، قرآن کی مشعلوں سے کونہ کونہ کو روشن کردیا اور انسانیت کو ظلمات سے نور کی طرف لانے کے لیے کوشش میں کوئی کسر نہ چھوڑی، زبانوں کو بھی معانیٔ قرآن سے مالا مال کردیا، یا یوں کہئے کہ مسلمان کردیا، اور انسانوں کو بھی اس کلام ربانی کی رفعتوں سے ہم آغوش ہونے کے لیے معراج معنوی کو آسان کردیا۔

ہندوستان میں اردو نامی لشکری زبان کو ہمدوش ثریا کرنے کا کام اللہ تعالی نے حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ سے والد ماجد حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے قرآن کے ترجمۂ فارسی کا اتباع کرتے ہوئے ایسا لیا کہ ’’ہست قرآن درزبان اُرْدُوی‘‘ تک کہنے والوں نے کہہ دیا۔

مالٹا کی جیل میں حضرت شیخ الہندؒ نے رات ودن غور وفکر کے بعد امت کی اصلاح کے لیے اشاعت قرآن کو اکسیر سمجھا، اور ترجمۂ قادری کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے کے لیے اس کی تسہیل اور تجدید کا کام کیا، اور پھر مولانا تھانوی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا مودودی، مولانا اصلاحی، مولانا دریابادی، مولانا جالندھری اور کتنے ہی نابغۂ رزگار اس خدمت کو ہی اپنے لیے سرمایۂ سعادت سمجھتے رہے، اور زندگی کا سب سے بہترین اور قیمتی وقت اسی میں گزارتے رہے۔

مولانا ابوالکلام قاسمی لائق تحسین ومبارکباد ہیں کہ اسی مبارک قافلہ میں شامل ہوگئے، اور بڑی رواں، آسان اور سہل زبان میں قرآن پاک کے ترجمہ کو پیش کرنے کی سعادت سے مشرف فرمادیے گئے، ترجمہ میں مکمل ترجمانی ہے، اچھی تفہیم ہے، تسہیل وتیسیر ہے، اس پر ریسرچ کرنے والے اس کی خوبیوں کا احاطہ کرسکیں گے، میں نے جہاں جہاں سے دیکھا دماغ کو اطمینان اور قلب کو سکون نصیب ہوا، دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالی ایسی قبولیت مقدر فرمائے کہ گھر گھر اور مسجد مسجد پڑھا جائے، مترجم کے ثواب اور نیکیوں میں اضافہ ہوتا رہے اور ہدایت قرآنی سے ہر گھر روشن ہو، اور ہر شخص شاد کام ہو۔ آمین

سید سلمان حسینی ندوی

۶ رذی قعدہ ۱۴۴۰ھ

ص-ب-۹۳، دار العلوم لندوة العلماء لكناؤ-۲۲۶۰۰۷ (يوبي) الهند
Mobile : +91-9450265065 Telefax : +91-522-2740813 E-mail : salmanulhusaini@gmail.com
www.shababalislam.in

(۴)

# مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی اور ان کا تحریر کردہ ترجمۂ قرآن

محمد سراج الہدیٰ ندوی ازہری

سرزمین بہار کی موجودہ نمایاں شخصیتوں میں اک نام ''مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی'' کا بھی ہے، جو اہل علم کے درمیان اپنی ایک پہچان رکھتے ہیں، صاحب علم وفن ہونے کے ساتھ ساتھ، صاحب فکر ونظر بھی ہیں، علم وعمل کے میدان میں بہت کچھ کر چکے ہیں اور مزید بہت کچھ کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ آپ کی ولادت ۲۵/اکتوبر ۱۹۵۱ء میں صوبۂ بہار کے تاریخی ضلع دربھنگہ کے مردم خیز گاؤں دوگھرا میں ہوئی؛ لیکن اب مستقل رہائش پٹنہ کے نیو عظیم آباد کالونی میں ہے، تعلیم وتعلم کے لئے مدرسہ وکالج دونوں طرح کے اداروں کا رخ کیا، نسبت قاسمیت کے ساتھ ساتھ ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل کی، مختلف عہدہ ومنصب پر فائز رہے اور ہیں بھی۔ تالیفات وتصنیفات کے میدان میں بھی حصہ لیا، تقریباً بیس کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں۔ بہت سارے سرکاری، نیم سرکاری اور غیر سرکاری اداروں سے اعتراف خدمات کے ایوارڈس مولانا کو بھی مل چکے ہیں، جن سے مولانا کی علمی وادبی اہمیت اور ان کی خدمات کے دائرے کو باآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ بقول مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی نائب ناظم امارت شرعیہ پٹنہ بہار:

''ایوارڈس کی تقسیم میں اگر جانبداری نہ برتی جاتی تو وہ اب تک پدم شری اور پدم بھوشن بھی ہو گئے ہوتے۔''

مولانا ایک علمی آدمی ہیں، اللہ تعالیٰ نے تحریر وتقریر دونوں طرح کا ملکہ انہیں عطا فرمایا ہے، میرے خیال میں تحریر کو تقریر پر غلبہ حاصل ہے، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے تاریخ، عربی، اردو قواعد، درسیات اور مذہبی موضوعات پر بہت کچھ لکھا ہے، جن میں خاص طور پر دو کتابیں آپ کے علمی، ادبی اور تحقیقی ذوق کا آئینہ دار ہیں۔ ایک تذکرہ علمائے بہار، اور دوسری ''تسہیل القرآن: آسان ترجمۂ قرآن'' جو ہمارے اس مضمون کا خاص موضوع ہے۔

۱۹ر مئی ۲۰۱۹ء مطابق ۱۳ر رمضان المبارک ۱۴۴۰ھ کی تاریخ تھی، میرے وہاٹس ایپ پر مولانا کا مسیج آیا، جس میں انہوں نے میری تحقیق وتعلیق سے شائع شدہ ''آسان ترجمہ وتفسیر قرآن مجید'' کا ذکر خیر کیا اور کچھ خاص بات کرنے کے لئے وقت مانگا، جس سے مولانا کی خرد نوازی واضح تھی، خیر! میں نے جواب دیا اور گفتگو کی تو انہوں نے اپنے تحریر کردہ ترجمۂ قرآن کا تعارف کرایا، تفصیل بتائی، اور اس ترجمہ کے شائع ہونے کے بعد تفسیر بھی تحریر کرنے کا ارادہ ظاہر فرمایا، اس کے ساتھ ساتھ یہ حکم فرمایا اور لکھا بھی کہ ''آپ علوم شریعہ کے درسیات سے لگے ہوئے ہیں، درس وتدریس آپ کا مشغلہ ہے، قرآن کریم کے ترجمہ وتفسیر پر کام بھی کر چکے ہیں، میری خواہش ہے کہ میرے تحریر کردہ ترجمۂ قرآن پر مکمل گہرائی وگیرائی سے از اول تا آخر ایک نگاہ ڈالیں۔ یقیناً یہ ایک بڑی ذمہ داری تھی، اس کے لئے وقت نکالنا اور آیات قرآنی، ترجمۂ قرآن اور پروف ریڈنگ تینوں جہتوں پر نظر رکھنا، وقت کے ساتھ ساتھ دقت طلب امر بھی تھا، لیکن بات قرآن کریم کی تھی، اس سے بڑی سعادت اور عز وشرف کی بات اور کیا ہوسکتی تھی؟ اور پھر حکم دینے والے بھی بڑے ہیں، ان کی بات ٹالنا اور انکار کر دینا بالکل مناسب نہیں لگا۔ محض اللہ تعالیٰ کی توفیق اور اس کے نام سے کام شروع کیا گیا، تقریباً ساڑھے تین ماہ میں نظر ثانی کا کام مکمل ہوا، ترجمہ بہت عمدہ پایا، راقم نے کچھ نوٹس چڑھائے، تحریراً بعض مشورے دیئے اور یہ علمی سرمایہ بذریعہ اسپیڈ پوسٹ حیدرآباد سے مولانا کے پتہ پر روانہ کر دیا گیا۔

اکیسویں صدی عیسوی کی دوسری دہائی مکمل ہونے والی ہے، اس نئی صدی میں قرآنیات پر متعدد کتابیں اہل علم کے درمیان آئی ہیں۔ ان ہی میں مولانا ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی شمسی کا ترجمۂ قرآن ''تسہیل القرآن – آسان ترجمۂ قرآن'' بھی ہے۔ مولانا کے اس ترجمہ کو پوری توجہ کے ساتھ میں نے پڑھا اور تصحیح کا کام کیا ہے، لیکن فی الحال میرے پاس کوئی نسخہ نہیں ہے کہ باحوالہ گفتگو کروں، ہاں! اتنی بات ضرور ہے کہ ذہن ودماغ نے بہت کچھ محفوظ کر رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے وہ سب تروتازہ ہیں، تو آیئے! ذہن ودماغ کے دریچے سے قرطاس وقلم تک آتے ہیں اور ان یادداشتوں کو تحریری جامہ پہناتے ہیں۔ سنئے، پڑھئے اور اس نئے ترجمۂ قرآن کے خصائص واہمیت سے واقفیت حاصل کیجئے اور افادہ واستفادہ کی راہ ہموار کیجئے۔

قرآن کریم کے ترجمے مختلف انداز میں کئے گئے ہیں، مولانا محترم کا تحریر کردہ یہ ترجمہ بھی متعدد خصائص کا حامل ہے۔ نہایت آسان اور سلیس زبان میں ہے، عام فہم الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، بھاری بھرکم الفاظ وکلمات سے کلیتاً گریز کیا گیا ہے، تا کہ کم پڑھے لکھے عام آدمی کو بھی بآسانی سمجھ میں آجائے۔

ترجمہ میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ روانی رہے۔ اگر کوئی شخص صرف ترجمہ ہی پڑھے تو اسے تمام جملے مربوط لگیں، اس کے لئے ایک خاص انداز بھی اختیار کیا گیا ہے جو دوسرے مترجمین کے یہاں نہیں ہے، وہ یہ کہ عموماً کسی لفظ کی وضاحت بین القوسین اسی طرز پر (.........) ہوتی ہے۔ مولانا نے دوران ترجمہ وضاحت کے لئے جو الفاظ یا جملے لکھے ہیں، اس کے لئے قوسین نہ دے کر صرف تحریر کا سائز چھوٹا کر دیا گیا ہے، تا کہ روانی برقرار رہے، مترجم کی سوچ ہے۔ آپ اس سے اتفاق کریں یا نہ کریں کہ قوسین سے تسلسل اور روانی میں توقف پیدا ہو جاتا ہے، اس لئے قوسین نہیں دیا گیا ہے۔

بعض الفاظ وکلمات اور آیتوں کے ترجمے کے لئے ایسے الفاظ کا انتخاب کیا گیا ہے کہ طبیعت عش عش کرنے لگتی ہے۔ بس شرط یہ ہے کہ قاری زبان وادب کی لذت سے آشنا ہو، مثال کے طور پر سورۂ بقرہ آیت: ۲۰۹ر کا ترجمہ پڑھئے اور خاص طور پر: فَاِنْ زَلَلْتُمْ کا ترجمہ دیکھئے: پھر بھی تم

ڈگمگا گئے۔اسی طرح سورۂ نساء آیت: ۸۴ میں ''عَسَی اللّٰهُ اَنْ یَّکُفَّ بَاْسَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا '' کا ترجمہ پڑھیے: قریب ہے کہ اللہ کافروں کا زور توڑ دے۔اسی سورۂ نساء کی آیت ۱۱۳ میں ''اَنْ یُّضِلُّوْكَ '' کا ترجمہ کیا گیا ہے: غلط فہمی میں مبتلا کردے۔سورۂ انبیاء کی آیت ۲۳ کا ترجمہ دیکھئے، جس میں لفظ''لَا یُسْئَلُ '' کا ترجمہ کس خوبصورتی کے ساتھ کیا گیا: وہ کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہے۔

دوران ترجمہ بعض جگہوں پر ایسا انداز اختیار کیا گیا ہے کہ اس سے شان نزول کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے،لیکن اس باریکی کو صاحب علم ہی سمجھ سکتا ہے،مثلاً:سورۂ بقرہ، آیت ۱۷۸ کا ترجمہ پڑھئے: آزاد کے بدلے اسی آزاد کو،غلام کے بدلے اسی غلام کو،عورت کے بدلے اسی عورت کو قتل کیا جائے۔اگر قاتل کے ساتھ اس کا بھائی کچھ معاف کرنا چاہے،تو دستور کے مطابق فیصلہ ہونا چاہئے۔اور قاتل کو لازم ہے کہ اچھے طریقہ سے خوں بہا ادا کرے۔یہ تمہارے رب کی طرف سے آسانی اور رحمت ہے۔اس کے بعد کسی نے زیادتی کی،تو اس کے لئے دردناک عذاب ہے۔اسی طرح سورۂ آل عمران، آیت ۳۶ میں ''وَ لَیْسَ الذَّکَرُ کَالْاُنْثٰی '' کا ترجمہ دیکھئے: حالانکہ اگر لڑکا ہوتا تو اس لڑکی جیسا نہیں ہوتا۔

صاحب ترجمہ نے اس بات کی بھی کوشش کی ہے کہ ترجمہ کے ذریعہ اگر کسی طرح کے اشکال واعتراض کو دور کرنا ممکن ہے تو کیا جائے،اس سے قاری کو ذہنی سکون اور اطمینان قلبی نصیب ہوتا ہے۔

اخیر میں اس راقم کی یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس ترجمہ کو قبولیت عطا فرمائے،خاص وعام کے لئے مفید بنائے اور مترجم کا اگلا منصوبہ تفسیر قرآن کا ہے،اسے بھی بارگاہ الٰہی میں شرف قبولیت نصیب ہو،آمین۔

رابطہ: استاد، دارالعلوم سبیل السلام وجامعہ ریاض البنات حیدرآباد
موبائل نمبر:9849085328 ای میل:sirajazhari@gmail.com

(۵)

# مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی کا تحقیقی
# 'بہار کی اردو شاعری میں علماء کا حصہ' ایک جائزہ

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں

مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی بہار کے زندہ علماء میں مشہور و معروف نام ہے۔ مولانا سے ملاقات کا شرف مجھے حاصل ہے، مولانا نہ صرف سنجیدہ عالم اور محقق ہیں بلکہ وہ بہترین انسان ہیں، ان کی سادگی، شرافت، ملنساری اور علم دوستی کا انکار اس دور کا کوئی بھی شخص نہیں کر سکتا، وہ اپنے خردوں سے بھی نہایت محبت سے پیش آتے ہیں اور ان کو گفتگو اور تبادلۂ خیال کا موقع عنایت فرماتے ہیں۔ بہت برس پہلے کا واقعہ ہے کہ ہم لوگوں نے مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی کی علمی خدمات پر ایک سمینار حاجی پور میں منعقد کیا تھا۔ اس سمینار کی صدارت کے لئے ہم لوگوں نے مولانا ابوالکلام قاسمی صاحب کا انتخاب کیا۔ ہماری دعوت کو مولانا نے نہ صرف قبول فرمایا بلکہ وہ سمینار میں تشریف لاکر اور اپنی صدارتی کلمات سے نواز کر ہمیں ممنون و مستفیض کیا۔ مولانا نے اپنی کئی گراں قدر تصانیف تحفتاً عنایت فرمائیں۔ مولانا کے ملنے جلنے اور گفتگو کرنے میں جو سادگی ہے وہ سادگی مجھے بہت محبوب و مرغوب ہے۔ مولانا کی تحریروں میں بھی علم کی گہرائی، مطالعہ کی وسعت کے ساتھ بڑی دلنواز سادگی ہے۔ وہ جس موضوع پر کام کرتے ہیں، اس موضوع سے متعلق مواد پوری محنت سے جمع کرتے ہیں اور برسوں کے مطالعہ اور غور و فکر کے نتائج کو

صاف ستھرے انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان کی تصنیف 'تذکرہ علمائے بہار' کی دو جلدیں اور 'بہار کی آزادی میں علمائے کرام حصہ' کا مطالعہ میں نے کیا ہے۔ میں مولانا کی تحقیقی نگاہ اور تصنیفی صلاحیت اور علمی شغف کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا ہوں۔ یہ دونوں اعلیٰ درجے کی تحقیقی تصانیف ہیں جو کسی بھی اچھی اور معیاری، تصنیف وتحقیق کے بالمقابل رکھی جاسکتی ہے۔ مولانا کا حالیہ تحقیقی کام 'بہار کی اردو شاعری میں علما کا حصہ' پیش نظر ہے۔ اس مقالہ پر انہیں نالندہ اوپن یونیورسٹی پٹنہ سے پی ایچ ڈی کی سند تفویض ہوئی ہے۔ یہ بھی مولانا کی ایک اہم تحقیق ہے۔ کیونکہ جس موضوع پر یہ کام ہے، اس موضوع پر اب تک کوئی کام نہیں ہوا تھا۔ علمائے کرام نے ہر زمانے میں علمی اور ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیا اور تہذیب انسانی کے قافلہ کو آگے بڑھایا۔ علما نے ہندوستان گیر پیمانے پر اردو زبان میں اپنی تحریکی، اسلامی اور علمی سرگرمیوں کو جاری رکھا۔ وہ جہاں قرآن وحدیث کی تشریح وتفسیر لکھتے رہے وہیں ان کی جماعت کے بہت سے لوگ تاریخ، تذکرہ، تنقید، سوانح اور شاعری کے میدان میں اپنی تخلیقات وتصنیفات پیش کیں۔ اپنی بہترین فکر، عمدہ خیالات اور پاکیزہ جذبات کے اظہار میں انہوں نے دوسرے ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ ساتھ اردو زبان وادب کو مالا مال کیا۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ فکر کی صلاحیت اور رائے کی اصابت، علم کی گہرائی اور عقیدہ کی مضبوطی اور صداقت وخیر کی تبلیغ واشاعت میں جو کارنامے علما نے انجام دیئے وہ دوسروں نے نہیں دیئے۔ شاعری کی ترقی اور طہارت کا جتنا اور جس طرح کام علما نے کیا ہے دوسرے ان کے مقابلہ نہیں کرسکے۔ مولوی اسمٰعیل میرٹھی، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی اور بے شمار علماء بہترین شاعر تھے اور انہوں نے اپنے علم وفضل کے ساتھ اپنی شاعری کا بھی لوہا منوایا۔ بہار کے علما میں بھی بے شمار لوگ اچھے اور بڑے شاعر تھے۔ مولانا عبدالحمید پریشاں، مولانا ظہیر احسن شوق نیموی، مولانا سید حسن مرتضٰی، شوق رضوی عماد پوری، مولانا عبدالمجید مضطر مظفر پوری، مولانا تمنا عمادی پھلواروی، مولانا قوس حمزہ پوری، مولانا شاہ قتیل دانا پوری، مولانا سید محمد شمس الحق شمس، مولانا حاذق سہسرامی، مولانا شبنم کمالی، مولانا عبدالشکور آہ مظفر پوری وغیرہ کے نام ہر پڑھے لکھے آدمی کے ذہن میں ہیں۔ مولانا ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی شمسی نے انتہائی محنت سے بہار کے ایسے شعرا کو ڈھونڈ نکالا ہے جن کا تعلق طبقۂ علما سے ہے۔ اپنے تحقیقی مقالہ میں ایسے ساٹھ سے زائد علما کا تذکرہ لکھا ہے

اوران کے کلام کا جائزہ لیا ہے اور ہر شاعر کے کلام سے نمونہ کے اشعار پیش کئے ہیں۔ ساتھ ہی انہوں نے دس علما کی تفصیل اور تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔ شعرا کے جو بھی تذکرہ لکھے گئے ہیں ان میں بہت کم علما کا تذکرہ ملتا ہے۔ زیادہ تر علما کو تحقیق وتنقید کا موضوع نہیں بنایا جاتا۔ مولانا ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی نے علما کی شاعری کا موازنہ اساتذۂ فن کی شاعری سے کر کے ان کی قدر وقیمت متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ مولانا نے اس مقالہ کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ:

''بہار میں اردو شاعری خانقاہوں کے زیر سایہ پروان چڑھی۔ اس لئے اس میں بازاری اور رکیک خیالات نہیں ہیں۔ اگر کہیں کچھ اس طرح کی بات پائی جاتی ہے تو شعری محاسن کے ساتھ۔ اس کو بھی میں نے اپنی جگہ پر واضح کیا ہے۔ اس مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ علماء کی شاعری کا معیار بہت بلند تھا۔ انہوں نے خاموشی کے ساتھ اردو زبان وادب کی خدمت کی۔ خاص طور پر اردو شاعری کو پروان چڑھایا۔ اپنے کم وسائل کے باوجود اس زبان اور اس کے ادب کے ساتھ اپنے رشتہ کو مضبوط رکھا۔ اس کی آبیاری کی، آگے بڑھایا اور عوام وخواص کے درمیان مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔''

مولانا نے اردو کی شاعری جو علماء کے علاوہ شعرا کے ذریعہ ہو رہی تھی اس کی سطحیت اور کوتاہیوں کی جانب بھی اشارہ کیا ہے۔ مولانا کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

''آزادی کے بعد اسی کی دہائیوں میں غیر علماء شعرا نے جو شاعری کی ہے اس کے مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان میں سے اکثر زبان وادب میں مہارت اور فکر وفن میں کمی کی وجہ سے مغربی ادب سے مرعوب ہو گئے۔ ادھر ادھر بھٹکتے رہے اور کسی قابل ذکر شاعری کی تخلیق نہیں ہو سکی۔ اس کے برعکس اس مرعوبیت کے دور میں بھی علما نے اپنے ادبی سرمایہ کو مرعوبیت سے بچا کر رکھا اور اس کو آگے بڑھانے کی کوشش کی، یہ ان کا بڑا کارنامہ ہے۔ یقیناً ان کی شاعری میں جس فکر وفن اور محاسن کا مظاہرہ ہے وہ نہایت ہی اہم ہے۔ اس طرح علما اور مشرقی ادبیات سے رشتہ مضبوط رکھنے والے شعراء کی شاعری زندہ رہنے والی معلوم ہوتی ہے، بقیہ زیادہ تر شعراء کی شاعری صرف شاعری ہے، فکر وفن اور محاسن شعری سے عاری۔ اس طرح اس قحط الرجال کے دور میں آج بھی علماء کی شاعری قابل ذکر اور قابل قدر ہے۔ اس پر مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔ مطالعہ یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اسی اور بعد دہائیوں میں علما میں

شاعری کا رجحان کم ہوتا نظر آتا ہے، جس سے مایوسی معلوم ہوتی ہے۔ اہل مدارس اور علما کو اس پر غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔''

مولانا کے اس ضخیم علمی مقالہ کے مطالعہ سے جو تاثر قائم ہوتا ہے کہ مولانا تحقیقی کام پوری محنت اور دلجمعی سے کرتے ہیں۔ وہ عجلت میں سرسری تحریر پیش کر کے محض ڈگری لینے یا کتاب بنانے کے قائل نہیں ہیں۔ یہ ان کا علمی شوق وشغف اور سنجیدہ مطالعہ آنے والی نسلوں کی رہنمائی کرے گا۔ مولانا کی یہ تحقیقی تصنیف چھپ کر اہل علم سے ضرور داد تحسین وصول کرے گی۔

☆ ساجدہ منزل، باغملی حاجی پور، ویشالی

(۶)

# معمارِ علم وفن: مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی

ڈاکٹر محمد قمر الدین قاسمی (علیگ)

سرزمین بہار کے مختلف مقامات میں سے ایک اہم مقام دربھنگہ بھی خاصی علمی وادبی اہمیت وعظمت کا حامل ہے، جس کی گود میں پروان چڑھنے والوں میں بیشتر ایسے اصحاب علم وفن اور منبع رشد وہدایت نظر آتے ہیں کہ اگر ان باکمال شخصیات کی علمی وادبی خدمات کے مختلف پہلوؤں اور کارناموں پر طائرانہ نگاہ ڈالی جائے اور ان اکابرین عظام، دانشوران قوم وملت اور محافظ دین وملت کی سوانحی خاکوں، تذکروں اور معاشرتی وسماجی اور اصلاحی وفلاحی امور کا بنظر غائر مطالعہ ومحاسبہ کیا جائے تو بیشمار علماء، ادباء، فقہاء، شعراء، محدثین، فلاسفر، پروفیسران نیز دیگر میدان علم وادب کے شہسوار کی بھی طویل فہرست نظر آتی ہیں، جنہوں نے اپنی اپنی نوعیت اور مقام ومرتبہ کے اعتبار سے نمایاں خدمات انجام دی ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری وساری ہے۔ اسی میدان علم وفن کی ایک قابل قدر وذی وقار شخصیت جنہوں نے نہ صرف دربھنگہ بلکہ پورے بہار کے ساتھ ہندوستان کی علمی شخصیات میں اپنی ایک شناخت بنائی ہے اور اپنے علم وفن کا اعتراف بھی کروایا ہے، جسے علمی دنیا مولانا ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی شمسی کے نام سے جانتی وپہچانتی ہے۔

ابوالکلام بن عبدالستار کی ولادت ۲۵ ر اکتوبر ۱۹۵۱ء کو بمقام دوگھرا ضلع دربھنگہ کے ایک متوسط وعلمی گھرانے میں ہوئی۔ ابتدائی گھریلو تعلیم وتربیت کے بعد گاؤں کے مدرسہ قاسم العلوم حسینیہ میں داخل ہوئے، جہاں سے فوقانیہ تک کی تعلیم کے بعد مدرسہ رحمانیہ سپول سے منسلک ہو گئے، پھر اعلیٰ تعلیم کی غرض سے بہار کی مشہور اسلامی درسگاہ، پٹنہ کے لیے رخت سفر باندھا اور مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پہنچے تو آپ کو یہ محسوس ہوا کہ اب علمی تشنگی جس کی تلاش میں میری نگاہیں بھٹک رہی تھیں وہ مل گئی، چنانچہ وہاں علیا درجہ میں داخل درس ہو گئے اور وہیں مقیم رہ کر علیا درجات سے لے کر فضیلت تک کی تعلیم امتیازی نمبرات سے مکمل کی۔ دوران تعلیم عصری تعلیم کی طرف رجحان بڑھا تو والد محترم کی اجازت سے پرائیوٹ طالب علم کی حیثیت سے میٹرک کے امتحان میں شریک ہوئے، اس میں نمایاں کامیابی کے بعد جب مزید علمی شوق وذوق بڑھا تو دینی ودنیوی دونوں طرف کے تعلیمی سلسلہ کو قائم ودائم رکھا اور یہ اسی وقت ممکن ہوسکتا ہے جب علم کی چاشنی وحلاوت کے ساتھ اساتذۂ کرام کی دیرینہ شفقت ومحبت بھی شامل ہو۔ بالآخر بہار یونیورسٹی مظفر پور سے ۱۹۸۸ء میں اردو زبان وادب میں ایم اے کی سند حاصل کرنے کے بعد ہندوستان کی ممتاز ومعروف یونیورسٹی یعنی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ عربی سے منسلک ہوئے جہاں سے ۱۹۹۴ء میں ایم اے عربی کی ڈگری حاصل کی۔ یہ مثل مشہور ہے کہ تعلیم حاصل کرنے کی کوئی عمر نہیں ہوتی، اسی کو صحیح ثابت کرتے ہوئے شمسی صاحب نے ۲۰۱۱ء میں عہدۂ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد نالندہ اوپن یونیورسٹی، پٹنہ سے ۲۰۱۵ء میں اردو زبان وادب میں ”بہار کی اردو شاعری میں علماء کا حصہ“ کے عنوان سے ڈاکٹر آف فلاسفی (پی۔ ایچ۔ ڈی) کی سند سے نوازے گئے۔

شمسی صاحب نے اسی مادر علمی میں جہاں سے فاضل اردو، فاضل حدیث وعربی ادب کی تکمیل کے لیے ایک ہونہار ولائق طالب علم کی حیثیت سے بہار کی مشہور شخصیات، اکابر علمائے کرام اور محدثین عظام سے جو ہندوستان کی عظیم درسگاہ مدرسہ شمس الہدیٰ میں مسند درس پر فائز تھے اور ہمہ وقت زانوئے تلمذ طئے کرنے والے طلبا کی تربیت واصلاح کرنے میں مصروف رہتے، علمی جواہر پارے اور اپنے سلیس انداز بیان سے طلبا کے علم وفن میں اضافہ ونکھار پیدا کرتے۔ آپ طلبا کی علمی تشنگی دور کرنے میں

ہمہ تن مصروفِ مطالعہ رہا کرتے، آپ کی علمی شغف، صلاحیت وادب نوازی اور طلاقت لسانی کو دیکھتے ہوئے مدرسہ انتظامیہ نے آپ کو بحیثیت اسسٹنٹ مولوی جونیئر سیکشن کے عہدہ پر فائز کیا۔ شمسی صاحب کو عربی واردو زبان پر مہارت وقدرت حاصل ہے۔ وہ ایک فعال اور متحرک شخصیت کے حامل ہیں، ان کا طرز تدریس، طرز تکلم اور طرز تخاطب بہت ہی عمدہ اور نرالا ہے، آسان وسہل انداز میں درجات میں بچوں کو سمجھانے کی قدرت رکھتے ہیں یہی وجہ تھی کہ بہت جلد طلبا واساتذہ میں معروف ومقبول ہوجاتے، چنانچہ بہت جلد ترقی کے منازل طئے کرتے ہوئے ۱۹۹۷ء میں مدرسہ شمس الہدیٰ کے سب سے اہم اور عظیم المرتبت عہدۂ پرنسپل پر فائز ہوگئے، پھر کیا تھا ہر چہار جانب علمی وادبی، سماجی واصلاحی حلقوں میں ان کی امانت ودیانت، صداقت وشرافت اور جرأت ووفاشعاری کے چرچے ہونے لگے۔

شمسی صاحب نے نہ صرف تعلیمی وتدریسی میدان میں اپنا وقار ورتبہ قائم کیا بلکہ اصلاحی وتنظیمی امور میں بھی قابل قدر کارنامے انجام دیئے۔ موصوف نے بحیثیت پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ خدمت پر ماموروتمکن رہتے ہوئے بہار ودیگر صوبوں کے ساتھ ملکی پیمانہ پر بھی بہت سی تنظیمی اداروں کے اعزازی ممبر، چیئرمین، صدروسکریٹری جیسے اہم واعلیٰ عہدوں پر بھی رونق افروز نظر آتے ہیں، خاص طور پر مسلم پرسنل لا بورڈ، بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ، بہار اردو اکیڈمی، امارت شرعیہ بہار وجھارکھنڈ اور جمعیت علمائے ہند وغیرہ کے رکن کے علاوہ بہت سے ادبی اداروں کی سرپرستی وقیادت کی ذمہ داری بھی پٹنہ میں مقیم رہ کر بخوبی انجام دیتے ہوئے جہاں مختلف النوع ومختلف العنوان موضوعات پر صوبائی وملکی سیمیناروں میں مقالہ نویس کی حیثیت سے شرکت فرماتے ہیں، بلکہ بیرون ممالک یعنی امریکہ اور ایران جیسے ملکوں میں بھی شمسی صاحب نے کئی وقیع مقالے خاص طور پر ''مدرسہ کی تعلیم ہندوستان وبہار میں'' پیش کرکے داد وتحسین حاصل کی جس کی علمی حلقوں میں خوب پذیرائی ہوئی اور اپنی علمی شخصیت کا لوہا منوایا ہے۔ وہیں بہت سے علمی وادبی سیمینار، مذاکرے اور علمی محاضرے کی صدارت وسرپرستی کا سلسلہ بھی جاری وساری ہے جو ارباب علم وادب، اصحاب فکروفن اور احباب ذوق وشوق کی نظروں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

شمسی صاحب کا بیشتر وقت وظیفہ یاب ہونے کے بعد تحریر وتقریر، تدوین وترتیب اور ترجمہ

وتالیف کے ساتھ تحقیقی وعلمی مضامین ومقالات تحریر کرنے اور اپنے شاگردوں کی اصلاح وعلمی ذوق پیدا کرنے میں مصروف بہ عمل ہیں۔ آپ کی تدریسی وعلمی اور معاشرتی واصلاحی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ۱۹۹۹ء میں نیشنل ٹیچرز ایوارڈ بذریعہ صدر جمہوریہ ہند، نئی دہلی کے اعزاز کے ساتھ بہار اردو اکیڈمی نے حسن عسکری ایوارڈ، بہار مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے اعزاز کے ساتھ دیگر ادبی اداروں نے اعزازات وانعامات سے بھی نوازا ہے جس سے موصوف کی علمی شخصیت، وقعت و عظمت اور قدر وقیمت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ایک متوسط گھرانے کا سپوت جس نے نہ صرف اپنے علاقے وصوبے میں عزت وعظمت، قیادت وسیادت سے سرفراز ہوا بلکہ ملکی ونیشنل پیمانے پر بھی سرفرازی وسربلندی سے بہرہ ور ہوا۔

شمسی صاحب کو طالب علمی دور سے ہی لکھنے پڑھنے اور مطالعۂ کتب کا شوق وذوق تھا، جہاں کہیں بھی شہر میں مقالہ نویسی ومضمون نویسی کا مقابلہ منعقد ہوتا تو ضرور شریک ہوتے، کبھی انعام سے تو کبھی خالی ہاتھ بھی واپسی ہوتی لیکن کبھی ہمت نہیں ہاری اور نہ ہی اپنے قلم کو زمانہ کی گردش کے بھنور سے روکا، بلکہ اپنے قلم میں روانی پیدا کرنے میں سرگرداں ومصروف رہے کہ پھر ہر ایک وقت آیا کہ ہر طرح کے مقالہ نگاری مقابلوں میں اولین صف میں نظر آنے لگے، جس کا فائدہ حاصل کرتے ہوئے زمانۂ متعلمی میں ایک عمدہ قلم کار کی حیثیت سے معروف ہوئے۔ چنانچہ جب ملازمت سے منسلک ہو گئے تو ترجمہ وتالیف اور تدوین وتخریج کی طرف مزید رغبت بڑھی، جس کی بنیاد دور طالب علمی میں پڑ چکی تھی تو کبھی کبھی اپنے ذی وقار اساتذۂ کرام اور معروف ادیب وصحافی کی صحبت میں حاضر ہو کر قلمی اصلاح لی، کیونکہ جب کوئی ادب کا طالب علم نئے میدان میں قدم رکھتا ہے تو اسے کسی رہبر ومرشد کی تلاش اس غرض سے کرنی پڑتی ہے کہ اصلاح واستفادہ کے ساتھ اس میدان کے قیل وقال، قواعد وضوابط سے بھی بخوبی واقفیت حاصل ہو، اسی نکتہ کو ذہن میں ملحوظ رکھتے ہوئے شمسی صاحب نے تحریر وتدوین کے میدان میں قدم رکھا اور نہ صرف قدم رکھا بلکہ عربی واردو زبان میں چند ایسی ابتدائی عدیم المثال کتابیں تحریر کیں جس کی طلبائے مدارس ایک عرصۂ طویل سے ضرورت محسوس کر رہے تھے۔

شمسی صاحب کی شخصیت کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ انہیں عربی زبان و

ادب سے بے پناہ رغبت وشغف کے ساتھ ان کی طبیعت ترجمہ نگاری کی طرف بھی مائل نظر آتی ہے جو ایک مشکل فن ہے، کیونکہ دوسری زبانوں سے صرف الفاظ کا ترجمہ ہی نہیں کیا جاتا بلکہ اس کی روح کو بھی دوسری زبان میں منتقل کرنا ہوتا ہے جو بجا طور پر ان کی تحریر وعبارت میں دکھائی پڑتا ہے۔ نیز ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کے طریقۂ کار، لسانیاتی پہلو اور اس جیسے تمام نکات وجزئیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے ''الترجمة العربية'' کے نام سے ایک کتاب تحریر کی جو ۱۹۸۹ء میں پٹنہ سے شائع ہوئی۔ اس کتاب میں شمسی صاحب نے مدارس دینیہ کے طلبا کو مدنظر رکھتے ہوئے ترجمہ کے قواعد، اصول اور اغراض ومقاصد پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ عربی قواعد جو ہمیشہ سے طلبا کے ذہن میں مشکلات پیدا کرتی ہیں، اس سے طلبا اکثر کتراتے اور دوری اختیار کرتے ہیں جس کا شدت سے دوران درس احساس کیا کرتے تھے، ان ہی مشکلات کو حل کرنے اور طلبا کی بے توجہی کو دور کرنے کی تدبیر کے آسان راستے تلاش کرتے ہوئے ''تسهيل النحو'' کے نام سے مختصر مگر جامع کتاب تالیف کی، جس میں بہت ہی آسان زبان میں علم نحو کے اصول وضوابط، اس کی افادیت واہمیت کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ طلبا کو عربی عبارت کی قرأت میں جن دشواریوں اور الجھنوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا، اس سے نجات مل سکے اور طلبائے مدارس کی ضرورتیں پوری ہو سکیں۔ اس کے علاوہ عربی زبان دانی، عربی میں رغبت وانسیت، عربی سے وابستگی اور عربی میں بول چال کے رواج کو عام کرنے کی غرض سے چار جلدوں میں ''القرأة الجديدة'' کے نام سے ایک ایسی مفید کتاب تصنیف کی کہ جس سے طلبائے مدارس کے ساتھ عصری علوم سے وابستہ طلبا بھی اگر اس کتاب کی تمرینات اور مشقی سوالات کا صحیح طور استعمال کریں تو اپنی استعداد میں اضافہ کر سکتے ہیں اور اپنی علمی تشنگی دور کر سکتے ہیں۔ اس کتاب کے ذریعے ایک عرصہ سے ابتدائی عربی درجات کے نونہالوں وطلباء میں جس کی کا شدت سے احساس کیا جا رہا تھا وہ کافی حد تک دور ہوتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔

شمسی صاحب نے عربی زبان میں تصنیفی وتالیفی سلسلہ کو دراز کرتے ہوئے اردو زبان وادب میں بھی قلم کو جنبش دیتے ہوئے تقریباً ایک درجن سے زائد کتابیں تحریر کیں جن میں ''جدید اردو قواعد''، ''امریکہ میں تین ہفتے''، ''اویس قرنی''، ''مدرسہ اسلامیہ شمس الہدی سے مولانا مظہر الحق عربی

وفارسی یونیورسٹی تک'' اور''تحریک آزادی میں علمائے کرام کا حصہ'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان میں شمسی صاحب کی علمی گہرائی وگیرائی، طلاقت لسانی، سلاست روانی اور انداز تحریر قابل دید وقابل ستائش ہے۔ان کتب کے علاوہ درسیات کی بھی چند کتابیں ترتیب دی ہیں جو کئی جامعات کی نصاب میں شامل درس ہیں خاص طور پر نالندہ اوپن یونیورسٹی کے گریجویشن کے طلباء کے لیے دو اہم نصابی کتابیں''قدیم اردو زبان کی تاریخ'' اور''اسلامی تعلیمات'' ترتیب دی ہیں۔شمسی صاحب نے تاریخ، ادب اور مذاہب جیسے موضوعات پر خامہ فرسائی کے بعد فن تذکرہ نگاری جو کہ ایک بہت ہی مشکل اور پر مغز فن ہے پر بھی ایک اہم ومعتبر کتاب ترتیب دی جس نے شمسی صاحب کو ملک و بیرون ملک میں خاص شہرت دوام عطا کی اور اسی کتاب کے نام سے اردو دنیا میں شمسی صاحب موسوم ہوئے۔ وہ کتاب اصلاً بہار کے علماء کی ایک وضاحتی فہرست ہے جسے تذکرۂ علماء کے نام سے جانا جاتا ہے وہ'' تذکرۂ علماء بہار'' کے نام سے ۲۰۰۰ء میں دو جلدوں میں شائع ہو کر داد وتحسین حاصل کر چکی ہے۔ اس کتاب کا راقم الحروف نے بھی بنظر غائر مطالعہ کیا ہے جب احقر''علمائے بہار کی عربی خدمات'' پر تحقیق کر رہا تھا، سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ شمسی صاحب نے بہت تگ ودو اور محنت شاقہ کے بعد صوبۂ بہار کے زمانۂ قدیم سے لے کر دور جدید تک کے علماء ومشائخ کی ایک اجمالی تفصیل پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔اس کی تیسری جلد بھی تقریباً زیر اشاعت ہے۔

شمسی صاحب نے جہاں عربی واردو زبان وادب میں قابل قدر اور لائق مصنف ومترجم اور مرتب ومدون کی حیثیت سے شہرت حاصل کی ہے وہیں علمی وادبی وتحقیقی مضامین، خاکہ نگار اور تذکرہ نگار کی حیثیت سے بھی اپنی پہچان وشناخت بنائی ہے۔آپ کے خیالات بہت اعلیٰ وارفع ہیں، بیشتر موقعوں پر مدارس دینیہ واسلامیہ کے فروغ، اس کی ترویج واشاعت اور اس پر غیروں کے ذریعہ نگاہ بد سے محفوظ کے طریقۂ کار کے لیے پیش پیش رہتے ہیں۔ان کا سوچنا وسمجھنا، غور وفکر کرنا مدرسہ ہی کے گرد وپیش رہتا ہے، اسی غرض سے شمسی صاحب نے ہمیشہ اپنے افکار وخیالات کو قومی سطح پر مضبوط کرنے اور اس میں نئی روح پھونکنے کے لیے دینی ومذہبی، ادبی ولسانی اور سماجی ومعاشرتی موضوعات کے ساتھ دیگر عنوانات مختلفہ کو بھی مطمح نظر رکھتے ہوئے مضامین ومقالات قلمبند کئے ہیں جو ملک

وبیرون ملک کے قدیم وجدید معروف ادبی وعلمی رسائل، جرائداوراخبارات میں گاہے بگاہے شائع ہوتے رہتے ہیں۔آپ کو مدرسہ کی تعلیم اور طلبائے مدارس سے بے پناہ رغبت ومحبت ہے۔حالات حاضرہ کودیکھتے ہوئے فارغین مدارس کوعصری تعلیم کی طرف کیسے مائل کیاجائے اوران کے ذہن کوعلوم عصریہ پر کیسے مرکوز کیاجائے،ان کی ترغیب وترتیب کس انداز سے کی جائے کہ ہمارے بچے دوسرے علوم کے بچوں کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے ہوسکیں اور تقابلی امتحانات میں کیسے کامیابی وکامرانی سے ہمکنار ہوسکیں،ان تمام افکاروخیالات اورعزائم وقصائد کوتقویت دینے،موقع ومحل کے حساب سے اس کے نفوذ کی تدبیر کی غرض سے اکثر اکابر علماء ودانشوران قوم وملت سے مذاکرے ومباحثے کرتے نظرآتے ہیں یہی وجہ کہ جب بھی کوئی سیمینار وعلمی پروگرام آپ کی زیرسرپرستی یا آپ کے ذریعہ منعقد ہواتواکثر مدرسہ کوہی موضوع سخن بنانے پرزوردیتے ہیں۔

شمسی صاحب کے بلند حوصلے،افکاروعزائم اورخیالات ومقاصدکودیکھتے ہوئے جب بھی بہارو دیگر صوبوں میں کوئی اہم علمی مذاکرے ومباحثے،سیمینارز وورکشاپس منعقد کئے جاتے ہیں توموصوف مندوبین ومدعوئین کی فہرست میں ضرورنظرآتے ہیں۔یہ آپ کاخاص کمال ہے کہ جب بھی کسی مجلس میں چاہے مقالہ نگاریاسامع کی حیثیت سے شریک ہوتے ہیں تواس مجلس میں اپنی ایک منفرد چھاپ چھوڑجاتے ہیں۔آئندہ بھی میں شمسی صاحب سے اسی طرح کی خدمات علمیہ وادبیہ کی دعا کرتاہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے علمی سفرکوجاری وساری رکھے،ان کی تحریکات وفکریات کوجلا بخشے اوران میں ایسی قوت وحوصلہ عطاکرے کہ قوم وملت کی قیادت وسیادت کے لیے ہمیشہ سرگرداں ومصروف رہیں۔آمین۔

☆ اسسٹنٹ پروفیسر علامہ اقبال کالج،بہارشریف۔نالندہ

(۷)

# مولانا ابوا کلام قاسمی شمسی
# تذکرہ علمائے بہار کے آئینہ میں

ثناء اللہ ثنا دوگھروی

آسمان ادب پر ناول نگاری، افسانہ نویسی، تاریخ نویسی، سوانح نگاری وغیرہ جیسے علوم وفنون کے بے شمار ستارے درخشاں ہیں جن سے نسل انسانی فیضیاب ہورہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ ان ہی میں سے ایک نہایت ہی اہمیت کی حامل صنف تذکرہ نگاری ہے۔ یہ وہ فن ہے جو ہمیں ہمارے اسلاف کی زندگیاں، ان کے حالات وکوائف، ان کے کارہائے نمایاں کا حقیقت پر مبنی علم فراہم کراتا ہے، ساتھ ہی ماضی کی تہذیب وثقافت کا آئینہ بھی ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ تذکرہ نگاری انتہائی سخت کوش فن ہے کیونکہ افسانے اور ناولوں کی طرح فنکار کے تصورات وخیالات کو اس میں دخل نہیں ہوتا اور نہ ہی اس میں تصنع یا پھر مبالغہ آرائی سے کام لینا ہوتا ہے، بلکہ تذکرہ نگار متعلق اشخاص کی زندگی کے ایک ایک ظاہری وباطنی پہلو کی چھان بین بڑی ہی جانفشانی سے کرتا ہے اور ان تمام حقائق کو یکجا کر کے خوبصورت انداز میں کما حقہ اپنے قارئین تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔

اب تک تذکرہ کے موضوع پر بے شمار کتابیں تصنیف کی جا چکی ہیں۔ بیشتر مصنفین نے اس فن

پرطبع آزمائی کی ہے اور آنے والی نسلوں کے لیے ایک بے بہا اثاثہ چھوڑا ہے، جس سے رہتی دنیا تک تشنگان علوم وفنون اپنی پیاس بجھاتے رہیں گے۔ان میں مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب آب حیات، مولوی حبیب اللہ عظیم آبادی کا تذکرۃ الصالحین، مولانا مفتی حبیب الرحمن کی کتاب تذکرہ مشائخ دیوبند، حکیم سید احمد اللہ ندوی کی تصنیف تذکرہ مسلم شعرائے بہار، مولانا مفتی ظفیر الدین کا تذکرہ مشاہیر علما دارالعلوم دیوبند، شاد عظیم آبادی کا تذکرہ اسلاف، شاداں فاروقی کا بزم شمال، فرمان فتح پوری کا تذکرہ علمائے ہند کے نام خصوصی طور سے لیے جاتے ہیں۔اسی سلسلے کی ایک خوبصورت اور اہم کڑی ہے مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی (مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ بہار کے موجودہ پرنسپل) کی تصنیف تذکرہ علمائے بہار جس کی جلد اول جو 499 رصفحات پر مشتمل ہے، پہلی بار میں اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ منظر عام پر آ کر قارئین وادبی دنیا سے داد وتحسین حاصل کر چکی ہے۔تذکرہ علمائے بہار کی مزید دو جلدیں منظر عام پر آنا باقی ہیں جیسا کہ خود مصنف پیش لفظ میں رقم طراز ہیں تذکرہ علمائے بہار کی ترتیب وتدوین ایک پروجیکٹ ہے، اس پروجیکٹ کے تحت جلد اول میں وفات یافتگان کے حالات شامل ہیں اور جلد دوم میں بھی وفات یافتگان کے حالات شامل کیے گئے ہیں جبکہ جلد سوم سے باحیات اور معاصر علما کے حالات جمع کیے جائیں گے۔

تذکرہ علمائے بہار کی جلد اول میں 501 رعلمائے کرام کی زندگیاں اور ان کے حالات قلمبند کیے گئے ہیں۔ان تمام علمائے کرام کے اسمائے گرامی ابجدی ترتیب کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں جس سے قارئین کو کسی نام کے تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی اور پھر کتاب کے اخیر میں وفیات کی ایک علیحدہ فہرست دے دی گئ ہے۔پھر تقویم ہجری وعیسوی اور پھر اخیر میں ماخذ بھی ابجدی ترتیب کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں۔مصنف نے اس سلسلے میں قارئین کی سہولتوں کا خیال رکھا ہے۔کتاب کے سرورق پر غالباً کھلی ہوئی کاپی اور کھلے ہوئے قلم اس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ یہ کام ابھی اپنے پایہ تکمیل کو نہیں پہنچا ہے اور اس کی کاوشیں ہنوز جاری وساری ہیں۔

مصنف نے اس کتاب میں زبان وبیان کا خوب خیال رکھا ہے۔نہایت عمدہ، سلیس اور سریع الفہم زبان میں باتیں کہی گئی ہیں۔خواہ مخواہ عربی ورفارسی کے ثقیل الفاظ کے استعمال سے حتی

الامکان گریز کیا گیا ہے، تاکہ عام قارئین جو کم پڑھے لکھے ہوتے ہیں، بھی عبارت کو اچھی طرح اور آسانی سے سمجھ سکیں۔ چونکہ مولانا کو عربی وفارسی زبان پر عبور حاصل ہے، یہی وجہ ہے کہ فصاحت کا دامن کہیں ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیا ہے۔ کتاب میں کہیں کہیں تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے اور بیشتر حقائق یکجا کیے گئے ہیں، تو کہیں بحالت تحقیقاتی مجبوری اختصار سے کام لیا گیا ہے، کسی عالم دین کے متعلق اگر زیادہ معلومات حاصل نہیں ہو سکیں تو کم از کم اتنی کوشش تو ضرور کی گئ ہے ان کے ورثا سے کسی بھی طرح چند حقائق ہی سہی، معلوم کر کے کتاب میں جگہ دے دی گئ ہے۔ اس کتاب میں بیشتر ایسے علمائے کرام کے تذکرے ملتے ہیں جو عمر بھر دینی وادبی خدمات انجام دے کر دنیائے فانی سے کوچ کر گئے اور اگلی نسلیں ان کے متعلق جانتی تک نہیں، ان کے اپنوں نے بھی انہیں بھلا ڈالا اور وہ گمنامی کیے پردے میں چلے گئے جو یقیناً ان کے ساتھ ناانصافی تھی، مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی نے اس سلسلے میں پوری طرح جانفشانی اور تگ ودو سے کام لیا اور مختلف علاقوں اور مختلف لائبریریوں کی خاک چھان کر کے ان کے متعلق جتنے اور جہاں تک ہو سکے حقائق معلوم کر کے یکجا کیے اور انہیں تذکرہ علمائے بہار میں شامل کر کے ایک نئ زندگی عطا کرنے کی خوبصورت کوشش کی، جو یقیناً لائق ستائش اور کار خیر ہے اور یہی شاید اس کتاب کی تصنیف کا مقصد عین بھی ہے۔ پوری کتاب میں کہیں کوئ اول فول گفتگو نہیں ملتی، اور نہ ہی کہیں کسی طرح کی کوئ مبالغہ آرائی ملتی ہے او رنہ ہی کہیں مرچ مسالے سے کام لیا گیا ہے، بالکل سادہ اور سلیس انداز میں حقائق پیش کیے گئے ہیں۔ جن کے متعلق جو بھی باتیں کہیں گئ ہیں، مکمل حوالے اور سند اور ثبوتوں کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے، تاکہ کتاب کی صحت پر کسی طرح کی کوئی آنچ نہ آسکے۔ جہاں ضرورت محسوس کی گئ ہے حواشی سے بھی کام لیا گیا ہے۔ اس طرح کتاب کے مطالعہ سے مولانا کی بہترین فنی صلاحیتوں کا بھی پوری طرح اندازہ ہوتا ہے۔

یوں تو روز ہی کوئ نہ کوئ کتاب منظر عام پر آتی رہتی ہے مگر کم ہی ایسی ہوا کرتی ہے جس کا مقصد تعمیری ہو اور جس سے ہمارا معاشرہ فیضیاب ہو۔ اس سلسلے میں قاسمی صاحب کی کتاب تذکرہ علمائے بہار یقیناً ایک عظیم کارنامہ ہے جس کی ادبی حلقے میں ایک کمی محسوس کی جا رہی تھی، مولانا

ابوالکلام قاسمی نے اپنی کاوشوں کے ذریعہ اس خلا کو پر کرنے کی ایک مستحسن سعی کی ہے۔ تذکرہ علمائے بہار ایک ایسا ادبی سرمایہ ہے جس سے میں سمجھتا ہوں کہ ہر گھر کو فیضیاب ہونا چاہئے، کیونکہ اس میں بہار کے ان تمام بزرگان کاملین اور علمائے عارفین کے تذکرے شامل کیے گئے ہیں جنہوں نے اپنی زندگیاں چمنستان اسلام کی آبیاری کیلئے وقف کردیں اور یہ سب کچھ انہوں نے نام ونمود نہیں بلکہ خالصتاً اللہ کے لیے کیا، جن سے ہمارا اور آپ کا کسی نہ کسی طرح تعلق ضرور ہے۔ لہٰذا اس کتاب کا مطالعہ ضرور کیا جانا چاہئے، تاکہ اپنے آباء واجداد کی زندگیوں کے متعلق معلومات فراہم کریں اور ان کے کارناموں، ان کے عادات واطوار اور ان کے اخلاق حسنہ کو جاننے ان سے سبق حاصل کرنیکی دلچسپی پیدا کریں۔ امید کی جاتی ہے کہ کتاب تذکرہ علمائے بہار کی ادبی دنیا میں پذیرائی ہوگی اور اس کی تابانیوں سے جہان ادب روشن رہے گا۔

مطبوعہ: اردو روزنامہ سنگم پٹنہ بہار، شمارہ نومبر
سابق سب ایڈیٹر روزنامہ انقلاب دہلی

# (۸)
# مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی کی تصنیف
## ’’تحریک آزادی میں علمائے کرام کا حصہ‘‘

انوار الحسن وسطوی

پیش نظر تصنیف ’’تحریک آزادی میں علمائے کرام کا حصہ‘‘ مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی کی تازہ تصنیف ہے، جو ۲۰۱۳ء میں بہار اردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے۔ اس سے قبل مولانا موصوف کی اردو اور عربی زبان میں تقریباً ڈیڑھ درجن کتابیں منظر عام پر آکر قارئین سے خراج تحسین کر چکی ہیں۔ مولانا کی جملہ کتابوں میں ’’تذکرہ علمائے بہار‘‘ اور یہ نئی تصنیف ’’تحریک آزادی میں علمائے کرام کا حصہ‘‘ بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ ’’تذکرہ علمائے بہار‘‘ بہار کے علمائے کرام کی ڈائریکٹری ہے جس کے مطالعہ سے ہم ان مجاہدین آزادی سے روشناس ہوتے ہیں جن کے کارنامے تو کیا ان کے ناموں سے بھی کم ہی لوگ واقف ہیں۔ آج ملک کے لیے ہماری قربانیوں کو فراموش کیا جا رہا ہے تو ایسے وقت میں یہ کتاب نہ صرف ہمارے ہمیں اپنے اسلاف کی قربانیوں سے آشنا کرے گی بلکہ ہمیں ہمت اور حوصلہ بخشنے کا بھی کام کرے گی۔ کتاب کے پیش لفظ میں مولانا ابوالکلام قاسمی نے اس کتاب کی وجہ تصنیف بیان کرتے ہوئے جو لکھا ہے، اس سے ان کے جذبۂ خلوص کا اندازہ لگتا ہے:

> ’’دیگر مجاہدین آزادی کی طرح علمائے کرام کی بھی تعداد کثیر ہے۔ ان میں سے بہت کے نام محفوظ ہیں اور بہت کے نام تک معلوم نہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ جب کبھی مجاہدین آزادی کی بات آتی ہے صرف چند نام ہماری زبان پر ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر مجاہدین آزادی کے نام اور کارناموں کو معلوم کرنے کی ہمیں توفیق نہیں ہوتی ہے۔ ہمارا فریضہ ہے کہ دیگر مجاہدین آزادی کے ساتھ ساتھ ان مجاہدین آزادی کو بھی یاد رکھیں، جنھیں اب لوگ بھلاتے جا رہے ہیں۔ وہ مجاہدین آزادی علمائے کرام ہیں۔ اس مقصد کے تحت یہ کتاب ترتیب دی گئی ہے۔‘‘ (ص: ۱۴)

زیر مطالعہ کتاب تین حصے اور سولہ ابواب پر مشتمل ہے۔ حصہ اول میں نو (۹) ابواب ہیں، جبکہ حصہ دوم چھ ابواب ہیں اور حصہ سوم میں صرف ایک باب ہے جو حاصل مطالعہ کے لیے وقف ہے۔ حصہ اول کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد علمائے کرام نے ملک کو خوشحال بنانے ارو ملک میں امن وامان قائم کرنے کی ذمہ داری کو محسوس کیا اور ملک سے ظلم وزیادتی کو مٹانے اور خلقِ خدا کی فلاح وبہبود کو اپنی زندگی کا مشن بنایا۔ علمائے کرام کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ حکومت یہاں مسلمانوں کو یا کسی اور کی، ان کی صرف یہی خواہش تھی کہ حکومت جس کی بھی ہو، وہ ملک کے باشندوں کے ساتھ انصاف کرے۔ یہ علمائے کرام انگریزوں کے ظلم سے صرف مسلمانوں کو نہیں بلکہ ہندوؤں کو بھی نجات دلانا چاہتے تھے۔ چنانچہ مولانا شاہ عبدالعزیز نگر انگریزوں کے خلاف اس امر کا فتویٰ صادر کر کے علماء کی ایک جماعت کو انگریزوں کے خلاف محاذ آرائی کے لیے تیار کیا اور انہیں تربیت دے کر میدان جنگ میں اتارا۔

مولانا شاہ عبدالعزیز کے تربیت یافتہ سید احمد شہیدؒ اوران کے رفقاء انگریزوں کے خلاف میدان جنگ میں اترے اور پورے ملک میں انگریزوں کے خلاف محاذ آرائی کر کے ملک کی فضا کو آزادی ہند کے موافق بنایا۔ ان علمائے کرام کا مقصد انگریزوں کو ملک سے بھگانا تھا تا کہ ملک کے مسلمان اور ہندو باعزت زندگی گزار سکیں۔ سید احمد شہیدؒ کے رفقاء مولانا سید عبدالحیؒ، مولانا شاہ اسمٰعیل شہید، مولانا ولایت علی صادق پوری، مولانا امیر الدین مالدھی، مولانا سید نصیر الدین دہلوی وغیرہ کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ان علمائے کرام نے ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کے لیے راستہ ہموار کیا۔ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں حاجی امداداللہ مہاجر مکی کی قیادت میں مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی ،مولانا منیر احمد نانوتوی وغیرہ علمائے کرام نے باضابطہ انگریزوں کے خلاف جنگ کی۔ گرچہ اس جنگ میں انہیں ناکامیابی ہاتھ لگی لیکن ان علماء حضرات نے ہمت نہیں ہاری اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے مدارس ومکاتب کے قیام کا کام شروع کیا۔ چنانچہ اس تحریک کے نتیجے میں ۱۸۶۶ء میں دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا جن کا مقصد دین کی حفاظت کے ساتھ ساتھ ملک سے انگریزی تسلط کا خاتمہ بھی تھا۔ دارالعلوم دیوبند کے بعد ملک میں ہزاروں مدارس قائم ہوئے۔ ان مدارس سے بے شمار علمائے کرام پیدا ہوئے جنہوں نے دین کی حفاظت کے ساتھ ساتھ ملک کی آزادی کے لیے بھی کام کیا، جس

کے نتیجے میں پورے ملک میں آزادی کی لہر دوڑنے لگی۔ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کے نتیجے میں دارالعلوم دیوبند کے قیام کے علاوہ ریشمی رومال تحریک، ثمرۃ التربیت، جمعیۃ الانصار، خلاف کمیٹی اور جمعیۃ علمائے ہند جیسی تنظیمیں قائم ہوئیں۔ ان تنظیموں نے اپنے اپنے انداز سے اورحتی المقدور ہندوستان کی تحریک آزادی میں حصہ لیا۔ ان تمام تنظیموں سے منسلک علمائے کرام نے ملک کے ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی سبھوں کے ساتھ میل محبت قام کیا اور سبھوں کو ساتھ لے کر تحریک آزادی کو آگے بڑھایا۔

کتاب کے حصہ دوم میں صوبۂ بہار کے علمائے کرام کی تحریک آزادی کا خصوصی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ بہار میں تحریک آزادی کے بانی علمائے صادق پور تھے۔ ان علماء میں مولانا ولایت علی، مولانا عنایت علی، مولانا احمد اللہ، مولانا عبداللہ، مولانا یحییٰ علی اور مولانا عبدالرحیم کے نام قابل ذکر ہیں۔ صادقپور کے ان علمائے کرام نے تحریک آزادی کو زندہ رکھنے اور اسے آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کیا۔ ان علمائے کرام کی تحریک پر ہزاروں علمائے کرام میدان میں آئے اور اسی تحریک کے نتیجے میں امارت شرعیہ، انجمن علمائے بہار، خلافت کمیٹی، جمعیۃ علماء اور مسلم انڈیپنڈنٹ پارٹی جیسی مختلف تنظیموں کا قیام عمل میں آیا۔ مذکورہ تمام تنظیموں نے حتی المقدور ملک کو آزاد کرانے کی کوششیں شروع کیں جن کے نتیجے میں بہار میں تحریکِ آزادی نے زور پکڑا۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک بہار کے جن علمائے کرام نے حصول آزادی کے لیے اپنی قربانیاں دی ہیں، ان کی فہرست طویل ہے۔ مولانا ابوالکلام قاسمی نے اس فہرست میں علمائے صادق پور کے علاوہ مولانا سید نذیر حسین، مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی، مولانا سید شاہ بدرالدین قادری پھلواروی، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالوہاب دربھنگوی، مولانا سید عطاء اللہ بخاری، مولانا عثمان غنی دیوروی، مولانا عبدالعلیم آسی دربھنگوی، مولانا سید منت اللہ رحمانی، مولانا سید شاہ عون احمد قادری، مولانا نورالدین بہاری اور مولانا مفتی ظفیر الدین دربھنگوی سمیت تینتالیس (۴۳) علمائے کرام کی جدوجہد اور تحریک آزادی میں ان کی خدمات کا ذکر کیا ہے۔

کتاب کا حصہ سوم ''حاصل مطالعہ'' ہے جو پانچ صفحات پر مشتمل ہے۔ مولانا ابوالکلام قاسمی نے اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ پوری کتاب کا نچوڑ ''حاصل مطالعہ'' میں پیش کر دیا ہے جو مستقل ایک مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔ کتاب کا اختتام ان کتابوں کی فہرست پر ہوا ہے جن سے فاضل

محقق نے استفادہ کیا ہے۔

ہم میں سے اکثر کو یہ بات معلوم نہیں کہ ملک کی آزادی کے لیے علمائے کرام نے اس وقت تحریک شروع کی تھی جب دیگر اقوام کے دلوں میں حصول آزادی کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔ ہمارے علمائے کرام نے ملک کی آزادی کے لیے انگریزوں سے دشمنی مول لی جس کے نتیجے میں قید و بند کی تکلیفیں جھیلیں، پھانسی کے تختے پر چڑھے، کالا پانی بھیجے گئے۔ آزادی کی تحریک کو مضبوط کرنے کے لیے برادران وطن کے دلوں میں ملک کو آزاد کرانے کا جذبہ پیدا کیا۔ مولانا محمد علی جوہر نے مہاتما گاندھی کو ساتھ لے کر پورے ملک کا دورہ کیا۔ گاندھی جی ''مہاتما'' کی حیثیت سے پورے ملک میں متعارف کرایا۔ اتنی بڑی جدوجہد کے بعد ملک آزاد ہوا لیکن وائے افسوس کہ حصول آزادی کے بعد برسوں کی محنت سے ملک میں پیدا ہوئی قومی یکجہتی کی فضا ایک سازش کے تحت مسموم کر دی گئی اور دیدہ و دانستہ طور پر مسلم مجاہدین آزادی کی قربانیوں کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ برادران وطن کی بات تو الگ رہی، خود مسلمانو کو اور ان کی نئی نسل کو یہ معلوم نہیں کہ ملک کی آزادی کے لیے ہمارے اسلاف کی کیا قربانیاں ہیں اور ملک کے لیے ان کی کیا خدمات ہیں؟ مولانا ابوالکلام قاسمی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے مسلم مجاہدین آزادی کی خدمات کا اور کارناموں سے ہمیں باخبر کرنے کی ضرورت محسوس کی ارا پنی اس تحقیقی تصنیف کے ذریعہ نئی نسل کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ ع

میرا لہو بھی سرخی شام و سحر میں ہے

مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی کی یہ تحقیقی تصنیف ہمارے لیے ایک ایسا قیمتی اثاثہ ہے جس کے بل پر ہم ملک میں اپنے لیے مساوی حقوق کے حصول کی تحریک شروع کر سکتے ہیں اور اپنی خدمات اور قربانیوں سے ملک کے باشندوں کو بالخصوص نئی نسل کو باخبر کر سکتے ہیں اور اپنی خدمات اور قربانیوں سے ملک کے باشندوں کو بالخصوص نئی نسل کو باخبر کرا سکتے ہیں۔ اس کے لیے ہمیں اپنے مجاہدین آزادی کی خدمات پر سیمینار اور سمپوزیم منعقد کرنے ہوں گے اور یادگاری جلسوں کا انعقاد کرنا ہوگا، تب ہی عوام الناس اوراق گم گشتہ سے واقف ہو سکے گی۔ یقیناً مولانا ابوالکلام قاسمی اپنی اس گراں قدر تصنیف کے لیے عرصۂ دراز تک یاد رکھے جائیں گے۔

(۹)

# ایک مثالی پرنسپل مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی

نورعالم ابراہیم

**شہر** عظیم آباد سدا سے علم وفن کا گہوارہ رہا ہے اور دینی وعصری علوم کے تاریخی ادارے اس شہر میں ہمیشہ رہے ہیں جو ہر دور میں تشنگان علم کو سیراب کرتے رہے ہیں۔ ان ہی تاریخی اداروں کی کڑی میں پٹنہ کے قلب میں ایک تاریخی ادارہ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ ہے جو پٹنہ کے مصروف شاہراہ اشوک راج پتھ پر واقع ہے جسے الحاج سید نورالہدیٰ مرحومؒ نے قوم وملت کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے 1912 میں قائم کیا اور تب ہی سے یہ قوم وملت میں تعلیمی انقلاب برپا کرنے میں اپنا رول ادا کر رہا ہے اور زمانے میں علم کی روشنی بکھیر رہا ہے۔

کسی بھی ادارے کو بہتر ڈھنگ سے چلانے میں پرنسپل کا اہم رول ہوتا ہے جو ادارے کو منظم اور بہتر طریقے سے چلاتے ہیں اور ادارے کو اپنی خدمات دے کر ایک وقت مقررہ کے بعد رخصت ہو جاتے ہیں مگر ہر ادارے کی تاریخ میں کچھ لوگ ایسے آتے ہیں جو ادارے سے جانے کے بعد یعنی ریٹائرمنٹ کے بعد بھی اپنی نقوش چھوڑ جاتے ہیں جس کے لئے ان کا نام احترام سے لیا جاتا ہے۔ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ نے بھی اپنی تاسیس سے لے کر آج تک کی تقریباً 75 سال کی مدت میں کئی پرنسپل کے ادوار دیکھے ہیں مگر مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی نے بحیثیت پرنسپل مدرسے پر جو نشان چھوڑا ہے وہ قابل رشک ہے۔

مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی صوبہ بہار کے مشہور ومعروف ضلع دربھنگہ کے جالے بلاک کے علمی اعتبار سے زرخیز گاؤں دوگھرا سے تعلق رکھتے ہیں وہیں آپ کی پیدائش 25 اکتوبر 1951ء کو ہوئی۔

آپ مختلف اداروں سے فاضل ہیں اس کے ساتھ ہی آپ نے عصری علوم حاصل کرنے میں کوئی کمی نہیں کی ہے۔ ماشاء اللہ آپ نے بحیثیت پرائیویٹ امیدوار میٹریکولیشن سے لے کر ڈبل ایم اے تک کیا ہے الغرض کہ علمی اعتبار سے آپ کی شخصیت کافی بلند ہے۔

آپ کی عملی زندگی کا آغاز 1976ء میں ہوا جب آپ نے بحیثیت استاد مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ کو جوائن کیا اور تعلیمی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے۔ 1997ء ادارے کے لئے اہم اور تاریخی سال ثابت ہوا جب آپ نے پرنسپل کے طور پر چارج لیا۔ پرنسپل کا چارج لیتے ہی آپ اور جوش وخروش کے ساتھ ادارے کی خدمت میں تن من دھن سے لگ گئے۔ جس وقت آپ نے ادارے کا چارج لیا تھا اس وقت کا شمس الہدیٰ اور آج کے شمس الہدیٰ کو دیکھنے کے بعد خود بخود فرق سمجھ میں آجاتا ہے کہ واقعی کسی طرح آپ نے مدرسہ ہذا کو سینچا ہے۔

پرنسپل کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد ادارے کی تعلیمی وتعمیری فروغ کے لئے آپ ہمہ تن مصروف ہو گئے تعمیری اعتبار سے تو آپ نے مدرسے کا نقشہ ہی بدل دیا۔ مدرسہ کیمپس کی جو سڑکیں تھیں وہ کچی تھیں اور ہلکی بارش ہونے پر کیچڑ پھسلن ہو جاتی تھی جس پر چلنا کافی دشوار ہوتا تھا آپ نے ان سڑکوں کو پختہ کرایا۔ مدرسہ کے احاطہ میں واقع دارالاقامہ شیش محل کے مشرقی حصہ کی تعمیر پروفیسر جابر حسین، الیاس حسین اور رام کرپال یادو کی مدد سے کرائی۔ مدرسہ ہذا کی جو Main Building ہے جس پر پرنسپل آفس اور مدرسہ کا دفتر بھی ہے اور سینئر کلاسیز بھی چلتے ہیں اس کی دوسری منزل کے مشرقی حصہ کی نصف تعمیر آپ کی ہی دین ہے۔

کسی بھی تعلیمی ادارے کے لئے لائبریری قلب کی حیثیت رکھتی ہے مدرسہ ہذا میں مولانا موصوف کے پرنسپل بننے سے قبل لائبریری کے نام پر صرف ایک کمرہ تھا جس میں نہ کوئی ریڈنگ روم تھا اور نہ دیگر کسی طرح کی کوئی سہولت، پرنسپل کا عہدہ سنبھالتے ہی آپ نے اس کمی کو شدت سے محسوس کیا اور اس کی بھرپائی کے لئے کوشش میں لگ گئے اور بالآخر آپ کی کوشش رنگ لائی اور ڈاکٹر شمیم احمد ایم ایل سی کے فنڈ سے لائبریری تعمیر کرانے میں کامیاب ہوئے۔ آج ادارے کے پاس دو منزلہ شاندار لائبریری ہے جس میں ریڈنگ روم کا باضابطہ انتظام ہے جس سے طلبا استفادہ کر رہے ہیں اور

ادارے میں بالخصوص ہاسٹل میں تعلیمی ماحول کو بہتر کرنے میں کافی مدد ملی ہے۔ یہاں یہ ذکر کرنا ضروری ہوگا کہ آپ نے لائبریری کی بالائی منزل پر ادارے کے ابنائے قدیم اور ریسرچ اسکالرس کے لئے خوبصورت اور آرام دہ مہمان خانہ کی بھی تعمیر کرائی ہے جس میں قیام کرنے کے لئے ہر طرح کی سہولت دستیاب ہے۔ مہمان خانہ کی تعمیر آپ کی بہترین سوچ کا نتیجہ ہے۔ ادارے میں ایک تاریخی ہال ہے جس میں اکثر و بیشتر علمی پروگرام وتقاریب ہوتے رہتے ہیں اس ہال کی حالت بالکل ہی اچھی نہیں تھی آپ نے ڈاکٹر مناظر حسن کے تعاون سے تاریخی ہال، مدرسہ کا دفتر و دارالاقامہ شیش محل میں مخدوش عمارت کی مرمت وٹائلس لگوا کر مذکورہ عمارتوں کی حلیہ ہی بدل دی۔

مدرسہ کے ہاسٹل میں رہنے والے طلبا کو پانی کے لئے کافی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا کیونکہ طلبا پوری طرح سے سپلائی واٹر پر منحصر تھے۔ سپلائی واٹر کبھی آیا کبھی نہیں اور کبھی گندہ پانی آنے کی وجہ سے ہاسٹل میں اچھی خاصی تعداد میں رہنے والے طلبا کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا آپ نے طلبا کی اس پریشانی کو سمجھا اور آپ نے پروفیسر جابر حسین کے فنڈ سے مدرسہ میں بورنگ کرادی۔ آپ کی اس کوشش وکاوش کی بدولت آج ہاسٹل کے طلبا تو اللہ کی اس عظیم نعمت صاف ستھرے میٹھے پانی کا مزہ لے ہی رہے ہیں۔ مدرسہ کے آس پاس کے عوام بھی واٹر سپلائی نہ ہونے پر اس بورنگ سے مستفید ہو رہے ہیں۔ واقعتاً آپ کا یہ نیک کام آپ کے لئے اور پروفیسر جابر حسین کے لئے صدقہ جاریہ کا کام کر رہا ہے۔ باری پتھ پر ادارے کا ایک وسیع وعریض جونیئر سیکشن بھی ہے اس سیکشن میں بھی آپ نے بہترین تعمیراتی کام انجام دیتے ہیں جونیئر احاطہ کی سڑکیں بنوائیں تمام کمروں کو ٹائلس سے مزین کرایا اور پھر کلاس روم وغیرہ کے آگے گریل کا کام کرایا۔ آپ کی حسن کارکردگی کی ایک مثال یہ ہے کہ آپ نے ادارے کا نام محکمہ تعمیرات عمارت والیکٹرک محکمہ میں نوٹ کرایا جس کی بنا پر ہر سال ادارے میں عمارتوں کی مرمت اور الیکٹرک کی وائرنگ کا کام ہوتا ہے۔ آپ کی انتظامی صلاحیت کی تعریف کرنی ہوگی کہ جب حکومت نے کبھی مدرسہ احاطہ میں مولانا مظہر الحق عربی فارسی یونیورسٹی قائم کرنے کی تجویز رکھی تو کبھی اقلیتی ہاسٹل قائم کرنے کی، آپ نے ایسے مواقع سے حکومت کے سامنے مدرسے کی زمین کی حیثیت کو واضح کیا اور بتایا کہ مدرسے کے احاطے میں مدرسہ کی علاوہ دوسرا کوئی

ادارہ یا ہاسٹل قائم نہیں کیا جاسکتا حکومت نے بھی آپ کے موقف سے بخوشی اتفاق ظاہر کیا۔ آپ کے حسن تدبیر کا ہی نتیجہ ہے کہ ایسے مواقع پر حکومت سے بغیر کسی ٹکراؤ کے آپ نے معاملہ حل کر لیا اور مزید آپ اپنے ادارے کے لئے محکمہ اقلیتی فلاح بہار سے ایک ہاسٹل کی تعمیر کرانے کو منظور بھی کرالیا جس پر جلد ہی کام شروع ہوگا۔ آپ کے تازہ تعمیراتی کاموں میں ایک کام یہ ہے کہ آپ نے شیش محل کے اوپر ڈاکٹر اعجاز علی کے ایم پی فنڈ سے بالائی منزل کی تعمیر کرائی ہے جس سے مدرسہ میں زیر تعلیم زیادہ سے زیادہ طلبا کو دارالاقامہ کی سہولت حاصل ہوگئی ہے۔ ادارے کے لئے آپ کے یہ شاندار تعمیراتی خدمات ہیں اس کے ساتھ ہی آپ کی تعلیمی خدمات بھی اتنی ہی شاندار ہے۔

تعلیمی اعتبار سے آپ کی شخصیت کافی معتبر اور بلند ہے آپ کا شمار صوبہ بہار کے مشہور و معروف دانشوروں، مفکروں میں ہوتا ہے آپ بیک وقت ایک اچھے استاد، مصنف، محقق اور ادیب ہیں۔ آپ کی شخصیت کے ان ہمہ جہت پہلوؤں کا اثر ادارے کے تعلیمی ماحول پر پڑا۔ طلبا میں تعلیمی رجحان پیدا کرنے کے لئے آپ نے ہر طرح سے کوشش کی۔ تعلیمی ماحول کو بہتر بنانے کی غرض سے ہی آپ کے ذریعہ سختی کے ساتھ اس قانون کو نافذ کیا گیا کہ جن طلبا کی کلاس میں حاضری کم ہوگی ان کا فارم کسی بھی قیمت پر پر نہیں کیا جائے گا۔ مدرسہ میں آپ کے ذریعہ وقت وقت پر تعلیمی سمینار، کانفرنس، مذاکرہ علمیہ کا انعقاد کر کے بھی طلبا کو تعلیم کی طرف راغب کیا گیا۔ طلبا میں ادبی ذوق وشوق پیدا کرنے کی غرض سے آپ نے ہر سال یوم آزادی کے موقع پر مشاعرہ کا انعقاد کرایا جس میں بہار کے نامور شعراء شامل ہوتے رہے۔ آپ کا ایک اہم کام راقم الحروف کو یہ لگتا ہے کہ آپ نے طلبا میں خود اعتمادی پیدا کرنے کی کوشش کی کیونکہ موجودہ حالات میں ملت کے نوجوان احساس کمتری کے شکار ہیں۔ انہیں دوئم درجے کا شہری مانا جاتا ہے اس ذہنیت سے نکالنے کے لئے آپ ہر سال یوم آزادی اور یوم جمہوریہ کے موقع سے پرچم کشائی کے بعد آپ اپنے خطاب میں ملک کی آزادی اور تعمیر وترقی میں مدارس، علما اور ہمارے اسلاف کا جو نمایاں رول رہا اس کا ذکر کرنا کبھی نہیں بھولے۔ آپ نے اپنے پر مغز خطاب میں علما کے ذریعہ چلائی گئی تحریکوں مثلاً وہابی تحریک جس کا مرکز پٹنہ کا صادقپور تھا اور ریشمی رومال تحریک کا تذکرہ کرتے ہوئے طلبا کو اس کے لئے ابھارا کہ وہ اپنے اسلاف

کے کارناموں کا مطالعہ کریں تاکہ آپ کے اندر خود اعتمادی آئے اور آپ اپنے اسلاف کے کارناموں پر فخر کرسکیں۔ مدرسہ کے طلبا زندگی کے ہر شعبہ میں اچھا کریں اس جذبہ کے تحت آپ طلبا کے تعاون کے لئے ہر موقع پر پیش پیش رہے۔اس کی دلیل ہے کہ بہار میں جب چند سال قبل داروغہ کی ویکنسی آئی تو آپ نے طلبا کی فزیکل تیاری کے لئے مدرسے میں ہر طرح کا انتظام کرایا جس کے نتیجے میں ماشاءاللہ کئی طلبا نے فیزیکل امتحان کوالیفائی کیا۔حال میں بہار پولس کی بحالی میں بھی مدرسہ ہذا کے طلبا نے کامیابی حاصل کی۔کئی طلبا نے آپ کے دور پرنسپل میں ریلوے کا مقابلہ جاتی امتحان نکالا۔آپ کے حسن کارکردگی کی یہ مثال ہے کہ بہار میں اساتذہ کی تقرری میں مدرسہ شمس الہدی کے طلبا اچھی خاصی تعداد میں بحال ہوئے ہیں۔

آپ کی ایک بہترین اور نمایاں خوبی ہے آپ کا (Corporative Mind) ہونا، آپ کبھی اس زعم میں مبتلا نہ رہے کہ میں پرنسپل ہوں بلکہ جب بھی طلبا کو کسی طرح کی ضرورت یا دقت پیش آئی آپ اس کے حل کے لئے آگے آئے۔اس کی زندہ مثال ہے کہ مدرسہ کی ڈگری پر گورنمنٹ طبیہ کالج، پٹنہ میں طلبا کا داخلہ پری طب میں ہوتا تھا اور پھر پری طب کے بعد وہ بی یو ایم ایس کیا کرتے تھے مگر چند سال قبل اس کو کچھ لوگوں نے مدرسہ کی ڈگری کو نامنظور کہہ کر روکنے کی کوشش کی۔ایسے موقع پر آپ نے شب و روز ایک کر کے بے لوث کام کیا اور سنٹرل کونسل آف انڈین میڈیسن کے یہاں مدرسہ کی ڈگری کو نوٹ کرایا جس کی وجہ سے آپ پری طب میں طلبا کا داخلہ ہو پا رہا ہے۔تقریباً دو سال قبل بہار حکومت کے ذریعہ ہائی و پلس ٹو اسکولوں میں اساتذہ و لائبریرین کی تقرری ہو رہی تھی۔

اس بحالی کے لئے تیار ضابطہ نامہ میں مدرسہ کی ڈگری کے مساوی ہونے کا ذکر چھوڑ دیا گیا جس کی وجہ سے بہت سے طلبا تقرری پانے سے محروم رہ جاتے اس موقع سے بھی آپ نے بحیثیت گارجین ذمہ داری نبھائی اور سکریٹریٹ سے لے کر متعلقہ وزیر و افسر سے مل کر آپ نے اس کام کو کرانے میں اہم رول ادا کیا جس کی وجہ سے آج اچھی تعداد میں طلبا اساتذہ و لائبریرین کی تقرری میں بحال ہوئے ہیں۔ یہاں آپ کے ایک اور اہم کام کا ذکر نہ کرنا ناانصافی ہوگی کہ موجودہ دور

انفارمیشن اور ٹکنالوجی کا ہے۔ مدرسہ کے طلبا اس میں پیچھے نہ رہ جائیں اس کے لئے آپ نے مدرسہ میں ڈاکٹر رنجن یادو کے تعاون سے ایک کمپیوٹر سیکشن کا قیام کیا جس کی افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ الغرض آپ طلبا کے تئیں ایک دردمند دل رکھتے ہیں کہ ایسے طلبا ترقی کریں اور زندگی کے مختلف شعبوں میں وہ زیادہ سے زیادہ منتخب ہوکر آئیں۔

ادارے اور طلبا کی فلاح و بہبود میں مصروف رہنے کے بعد بھی آپ اپنے مصروف Routine سے اپنی تعلیمی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لئے وقت نکال لیتے ہیں کیونکہ وقت ان ہی کے پاس ہوتا ہے جو زیادہ مصروف ہوتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آپ کی عربی اور اردو میں تقریباً بیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور کچھ زیر طبع ہیں آپ کی تصنیفات میں تذکرہ علمائے بہار، کافی اہم تصنیف ہے جس میں آپ نے بہار کے علماء کی خدمات کو یکجا کردیا ہے۔ علمائے بہار پر کام کرنے والوں کے لئے آپ کی یہ کتاب مشعل کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ نے ماہر تعلیم کی حیثیت سے امریکہ کا سفر بھی کیا ہے اور وہاں سے واپسی پر آپ نے اپنا سفرنامہ ''تین ہفتہ امریکہ میں'' کے نام سے لکھا جو آپ کے تجربات پر مبنی ہے۔ تقریباً سال بھر قبل آپ نے جمہوری ایران کا بھی سفر کیا جہاں آپ نے کئی سمینار و کانفرنس میں شرکت کی۔ تصنیفات کے علاوہ آپ کی شرکت کانفرنس اور سمیناروں میں بھی ہوتی رہتی ہے جس میں آپ کے مقالات کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔ آپ کے مقالات کافی معتبر ہوتے ہیں۔ مدارس اسلامیہ کے نصاب وتعلیم اور حالات پر آپ کی کافی گرفت ہے اس پر آپ کے کئی علمی فکری مضامین اخبارات ورسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ آپ کی ان شاندار تعلیمی خدمات کی وجہ سے 1999ء میں آپ کو صدر جمہوریہ کے ایوارڈ سے نوازا جا چکا ہے۔ آپ کی شخصیت کی اہمیت و افادیت اس سے بھی سمجھ میں آتی ہے کہ آپ امارت شرعیہ کے مجلس شوریٰ کے ممبر اور مسلم پرسنل لاء بورڈ کے مدعو خصوصی بھی۔

مختصراً آپ کی شخصیت گوناگوں صفات کی حامل ہے اور آپ کی خدمات ادارے وقوم وملت کے تئیں لائق تحسین اور قابل تقلید ہے۔

☆ نیوعظیم آباد کالونی، پٹنہ 9798607136

(۱۰)

# مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی کی خدمات

ڈاکٹر محمد شفیع الزماں

صوبہ بہار کی علمی حیثیت مسلم ہے۔اس میں بڑے بڑے علماءصوفیائے کرام،دانشوران،ادباء، شعراء پیدا ہوئے۔جنہوں نے صوبہ بہار کا نام روشن کیا۔ماضی میں بھی اس صوبہ کو اہمیت حاصل رہی اور آج بھی اس کی حیثیت قابل فخر ہے۔صوبہ بہار کی علمی شخصیتوں میں سے ایک اہم شخصیت مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی کی ہے۔یہ صوبہ بہار ہی نہیں بلکہ شمال ہند میں مصنف،بلند پایہ مضمون نگار اور ادیب ودانشور کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ان کی عظمت وبلندگی اپنی جگہ مسلم ہے۔مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی ۲۵ اکتوبر ۱۹۵۱ کو دربھنگہ کے گاؤں دوگھرا میں پیدا ہوئے۔ان کے والد کا نام عبدالستار ہے۔مولانا نے حسب معمول پہلے دینی تعلیم وسطانیہ،فوقانیہ،مولوی،عالم وفاضل عربی،فاضل حدیث،فاضل اردو کی اور بڑے بڑے اداروں کے قابل فخر علماء سے فیض حاصل کیا۔۱۹۷۴ء میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں استاذ مقرر ہوئے۔ملازمت کے دوران انگریزی تعلیم،میٹرک،انٹرمیڈیٹ،اردو آنرز اور ایم اے اردو کی ڈگری حاصل کی۔عربی میں ایم اے اور ٹیچرس ٹریننگ کی۔۱۹۹۷ء سے پرنسپل کے عہدے پر فائز ہیں۔مولانا بہترین انتظامی امور ترقی پسندانہ رویہ رکھنے والے افراد ہیں۔انہیں ۵ر ستمبر ۱۹۹۹ء کو صدر جمہوریہ ہند کی جانب سے نیشنل ایوارڈ سے نوازا گیا۔ان کی شخصیت میں بہت سی خوبیاں موجود ہیں۔مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کے تعلیمی فروغ کے سلسلے میں ان کی خدمات قابل فخر وستائش

ہے، جو تاریخ کے اوراق میں سنہرے پنوں میں لکھی جائے گی۔ موصوف ادارے کی تعلیمی ترقی اور تعمیری فروغ کے لئے ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں۔ ان کی عربی اور اردو میں تقریباً ۲۵ رکتابیں طبع ہو چکی ہیں۔ ان میں سے کئی کتابیں مدارس اور اسکول کے نصاب میں شامل ہیں۔ ان کی تصنیفات میں سے سب سے اہم 'تذکرہ علمائے بہار' ہے۔ اس میں انہوں نے پہلی مرتبہ علماء بہار کے کارناموں پر روشنی ڈالی۔ اپنے انوکھے طرز اسلوب نگارش سے علمائے کرام کی تحریک کے پوشیدہ پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے اوران کی سچی تصویر کی عکاسی کی ہے۔ اس کتاب نے تحقیق کے لئے ایک دروازہ کھول دیا ہے۔ چنانچہ علمائے بہار کی خدمات پر مختلف طریقے سے تحقیقی کام کا آغاز ہو چکا ہے۔ علمائے بہار پہلی جلد میں ۵۰۰ علماء کا ذکر ہے جو اہم ہے۔ دوسری جلد میں بھی تقریباً ۳۰۰ علمائے کرام کے حالات ہیں۔ علمائے بہار کا جائزہ لیا توان میں سے کچھ ایسے علمائے دین ہیں جو باضابطہ شاعر اور ادیب ہیں۔ مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ساری فنی خوبیاں ان کی کتاب میں موجود ہیں۔ تاریخی اعتبار سے اس کتاب کی بڑی اہمیت ہے۔ ان کے مضامین اخباروں اور جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں، جس سے ان کا ادبی پوزیشن اپنی جگہ قائم ہے۔ انہوں نے انوکھے اور اسلوب نگارش سے اپنا سکہ جما دیا۔

ان کی تحریروں کو پڑھنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کا اسلوب ان کا رنگ وآہنگ سب سے الگ ہے۔ ان کی تحریر وتصانیف علمی دنیا میں ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی۔ پورے بہار میں عالم کی حیثیت سے ان کا الگ مقام ہے۔ مذہبی شعور فکر اور صوم وصلوٰۃ اور اصول کے پابند ہیں۔ تعلیمی اور علمی میدان میں ان کے کارنامے نمایاں ہیں۔ مدارس کی تعلیم پر ان کی گہری نظر ہے۔ اپنی اسی خصوصیت کی بنیاد پر مدارس اسلامیہ کے سلسلے میں جو کچھ تحریر کرتے ہیں، ان میں توازن اور فکر کی بات ہوتی ہے۔ انہوں نے ماہر تعلیم کی حیثیت سے امریکہ کا بھی سفر کیا۔ وہاں کی علمی مجلسوں میں مدارس اسلامیہ کے افسران، عوام وخواص کو مطلع کیا۔ ان کا سفر نامہ تین ہفتہ امریکہ میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ کتاب ایک سفر نامہ ہے، جو مشاہدات وتجربات پر مبنی ایک دستاویز ہے۔ ادیب اس کتاب کی ادبی حیثیت کے مترادف ہیں۔ مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی ایک مصلح وسماجی خدمت کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ دینی وسماجی جلسے اور دیگر دینی مطالبات میں پیش پیش رہتے ہیں۔ کبھی علمی

بحث ہو یا کوئی ادبی مسئلہ، اس موضوع پر حالات اور مواقع کے مطابق مضامین اخباروں میں دیکھنے کو ملا ہے۔ان کی تحریر میں منطقی استدلال اور حوالہ جات کا اہتمام خاص طور سے ملتا ہے۔ان کی تحریر میں حقیقت نگاری کا گہرا رنگ ملتا ہے۔اس طرح اپنی بات کو مدلال پیش کر کے سبھوں کو گرویدہ بنا لیتے ہیں۔ان کے مضامین ومقالات کی تعداد سیکڑوں میں ہے اور ہر ایک مضمون کی اپنی خصوصیت ہے۔ہر ایک میں فکر استدلال اور تاریخی حقائق موجود ہیں۔اس کے علاوہ پچاس سے زیادہ کانفرنس اور سیمینار میں شرکت کر چکے ہیں۔مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے طلبا اور دیگر اداروں کے طلبا کو تعلیمی معاملہ میں خوب رہنمائی کرتے ہیں۔اس طرح وہ اپنی خدمت کی وجہ سے ہمیشہ علمی، ادبی اور سماجی حلقوں میں قابل ذکر وقابل فخر شخصیت کی حیثیت سے یاد کئے جاتے رہے ہیں۔

☆انچارج ہیڈ ماسٹر، راجیہ کرت ہائی اسکول، جہانگیر پور(ویشالی)

(۱۱)

# مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی کی علمی خدمات

ڈاکٹر محمد تنویر عالم، ایڈووکیٹ

تاریخ کے ہر دور اور ہر عہد میں بہار نے دانشوری کا اونچا معیار قائم رکھا ہے۔ یہاں کی سرزمین نے ایسے ایسے عظیم سپوتوں کو جنم دیا ہے جس کا اعتراف کرتے ہوئے مولانا عبدالماجد دریابادی نے کہا تھا کہ ”بہار کی سرزمین آج سے نہیں گوتم بدھ کے زمانے سے پر بہار نظر آرہی ہے۔ کیسے کیسے عالم، درویش، حکیم، ادیب، مورخ، شاعر اس خاک سے اٹھے اور خاک میں ملے اور کتنے ماشاءاللہ آج بھی وہی شمع قدیم روشن کئے ہوئے اپنے وطن کو مطلع انوار بنائے ہوئے ہیں۔ ان ہی میں ایک عظیم مورخ اور ادیب مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی بھی ہیں جو اپنے علم وعمل سے صوبۂ بہار کا نام روشن کئے ہوئے ہیں۔ اس سرزمین بہار کا ایک قدیم شہر دربھنگہ ہے۔ جہاں سے کچھ فاصلہ پر دوگھرا گاؤں کے ایک غریب خاندان میں ۲۵/اکتوبر ۱۹۵۱ء کو پیدا ہوئے۔ والدین کے سایہ عاطفت میں پرورش پائی۔ ابتدائی تعلیم گاؤں ہی کے مدرسے میں ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے مختلف اداروں میں داخل ہوئے اور بہار مدرسہ اسٹیٹ بورڈ سے فاضل حدیث، فاضل اردو اور فاضل عربی کی اسناد حاصل کیں۔ اسی دوران ہندوستان کی چند موقر شخصیات سے بھی مستفیض ہونے کا موقع ملا اور ان کی صحبت میں ان کے علمی سفر کو جاری وساری رکھا۔ صرف یہی نہیں کہ مولانا مدارس ہی سے منسلک رہے

بلکہ یونیورسیٹی کی اسناد بھی حاصل کی۔اور ۱۹۹۴ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسیٹی سے ایم،اے (عربی) میں اعلیٰ نمبرات سے کامیاب ہوئے جوان کی ذہانت وفطانت اور قابلیت کی دلیل ہے۔مولانا ابوالکلام صاحب تعلیم سے فراغت کے بعد مدرسہ اسلامیہ رامپور میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا۔اللہ نے علمی صلاحیت اور تربیت وتدریس کا ایسا ملکہ عطا کیا تھا کہ بہت ہی جلد علمی حلقوں میں مقبول ہو گئے۔ اسی مقبولیت کے پیش نظر ۱۷رجنوری ۱۹۷۶ء میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کے جونیئر سیکشن میں تقرری عمل میں آئی۔مولانا شمسی تدریسی خدمات کو بحسن خوبی انجام دیتے ہوئے اور علمی ترقیوں کی طرف گامزن رہتے ہوئے یکم جنوری ۱۹۹۷ء سے پرنسپل کے اہم عہدہ پر فائز ہیں۔مولانا کا شمار بہار کے چند جید علماء اور ادباء میں ہوتا ہے۔انہوں نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں اور اشاعت دین مذہب و ملت کی قیادت اور تصنیف تالیف کے ذریعہ ملت اسلامیہ کی جو خدمات انجام دی ہیں،ان کا اعتراف مشہور مصنف،مورخ اور ادیب مفکر اسلام مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے کہا تھا''بہار کا قرض آپ نے پورا کر دیا''۔شمسی صاحب کو اردو اور عربی کے ساتھ ساتھ انگریزی اور فارسی میں بھی خاص مہارت ہے، لیکن اپنی علمی وادبی تحقیقات وتصنیفات کے لئے اردو وعربی کو ہی اساس بناتے ہوئے اپنے گراں بہا علمی ودعوتی وادبی افکاروں خیالات سے مالا مال کر رہے ہیں۔موصوف نے ادب وتاریخ کے علاوہ سیرت نبوی اور تذکرہ نگاری کو بھی اپنا موضوع بنایا جو اپنے مواد کی گراں مائیگی،زبان کی چاشنی،اسلوب کی لذت اور طرز تحریر کی شوق انگیزی کی وجہ سے اپنے الگ انداز اور مخصوص امتیاز رکھے ہوا ہے،جس کو باذوق قاری عرق ریزی سے مطالعہ کرتا ہے اور اس پر تبصرہ بھی کرتا ہے۔مولانا کا بھی عربی زبان وادب پر تصنیف کردہ کتابیں ہیں جو داخل نصاب ہیں اور اپنی خصوصیات وانفرادیت کی وجہ سے ہر خاص وعام میں مقبول ومعروف ہیں۔ان خاص طور پر''القراۃ الجدیدۃ''مدرسہ کے ہر طالب علم اور اساتذہ کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔یہ کتاب نہایت سہل اور آسان الفاظ میں تصنیف کی گئی ہے۔ساتھ ہی ایجاز و اختصار کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔مگر ایک صاحب طرز ادیب کی طرح ایسی ادبی چاشنی لئے ہوئے کہ قاری کے اندر اکتاہٹ کے بجائے پڑھتے رہنے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے جو مولانا کی منفرد شخصیت کو عیاں کرتی ہے اور دوسرے مؤلفین ومترجمین سے ممتاز کرتی ہے۔کیوں کہ اس کتاب میں جس قدر فصاحت

وبلاغت کا استعمال کیا گیا ہے، اس طرح کی عبارتیں دوسرے ادباء میں شاذ و نادر ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔

عربی زبان کے علاوہ اردو زبان میں بھی مولانا کے اہم کارنامے ہیں، جن میں چند کتابیں خاصی شہرت کی حامل ہے۔ مثلاً تذکرہ علمائے بہار، دو جلدوں میں، مشاہیر بہار کے خطوط، تحریک آزادی میں علمائے کرام کا حصہ، اویس قرنی کی شخصیت اور امریکہ میں چند ہفتے وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ بہار میں سیرت نگاری و تذکرہ نگاری کی روایت قدیم ہے۔ ہر زمانے میں سیرت و تاریخ پر لکھنے والوں نے اپنے اپنے انداز و اسلوبیاتی خصوصیات میں کتابیں تصنیف کیں اور عوام کو بہرہ ور کرنے کی کوشش کیلیکن مولانا شمسی نے جس نئے پیرائے اور نئے انداز تخاطب میں بہار کے علماء کا تذکرہ اور سوانح حیات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے، وہ قابل ستائش ہے۔ موصوف جس طرح مختصر الفاظ و جملوں میں کسی کی شخصیت کو پیش کرنے کی گڑ جانتے ہیں، جس سے قاری مطمئن ہوتا نظر آتا ہے جو کسی اور مصنف کے یہاں نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ تذکرہ علمائے بہار نے ترقی کے منازل کو جس سرعت سے طئے کیا ہے کہ باقی سوانح نگار بونے نظر آتے ہیں اور جب کوئی شخص بہار پر تحقیق و تدوین کا کام کرنا چاہے گا تو اس کتاب کے مطالعہ کے بغیر اس کا مقالہ مکمل نہیں ہوسکے گا۔ اسی طرح موصوف کی دوسری کتابیں جیسے ''تحریک آزادی میں علمائے کرام کا حصہ'' بھی اپنی اہمیت وافادیت کی وجہ سے مقبولیت اور معلومات کا خزینہ ہے، جس میں بیک وقت بہت سے علمائے کرام جنہوں نے ملک کی خدمت کے تحت اپنی جان کی فکر کئے بغیر قربانی دے دی اور ایسی مثال پیش کر گئے جو رہتی دنیا تک نمونہ کے طور یاد کیے جائیں گے۔ اس کے علاوہ ''تین ہفتے امریکہ میں'' بھی دلچسپ ہے، کیونکہ اس کتاب کے ذریعہ امریکہ کے علمی و ادبی مراکز و مکاتب کا بغیر وہاں کی صحبتوں کو برداشت کئے بغیر اپنے علم میں اضافہ کرسکتا ہے۔ اور وہاں کے علمی و دینی خدمات کا جائزہ لے سکتا ہے۔ مولانا صرف اپنے علمی سفر اور کدو کاوش کو کتابوں کے ذریعہ ہی نہیں بلکہ مقالات و مضامین کے ذریعہ بھی اس میں چار چاند لگا یا ہے۔ موصوف کے مضامین ہندوستان کے موقر جرائد و رسائل میں ہمیشہ شائع ہوتے رہتے ہیں اور ہر اس قاری کو جو آپ کے مقالات پڑھتے ہیں، انتظار رہتا ہے کہ کب اور کس رسالہ میں آپ کا مضمون شائع ہو رہا ہے، اس کو پڑھ کر اپنی علمی تشنگی کو بجھاتے ہیں اور دلوں کی دھڑکنوں کو

اطمینان بخشتے ہیں۔اس کے علاوہ سیمینار میں شرکت بھی کرتے ہیں۔ جیسے ''مسلم پرسنل لا بورڈ''، ''رابطہ ادب اسلامی''، ''فقہ اکیڈمی'' وغیرہ۔ ہر ایک میں آپ شرکت کرتے ہیں اور مسائل کو حل کرنے میں اپنی رائے بھی دیتے ہیں۔ان تمام خدمات کے بدلے اگر کسی کو انعامات سے نوازا نہ جائے تو اس کی حق تلفی ہوگی۔اس لئے صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے ۱۹۹۹ء راشٹر پتی ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔اس کے علاوہ امریکن بائیوگرافکل سنٹر کے ذریعہ مین آف سی ایئر ۲۰۰۳ء کے خطاب سے نوازا گیا۔یہی نہیں مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کی طرف سے بھی ایوارڈ سے نوازے گئے۔اس علاوہ بہت سے انعام واعزاز سے نوازے گئے۔ بہر حال مولانا کی شخصیت ہمہ جہت ایک جہت ایک جید فاضل ادیب اور تذکرہ نگار کی ہے، جنہوں نے اپنی لیاقت وصلاحیت، وسعت نظری اور تحقیق وتدوین کے ذریعہ یہ ثابت کردکھایا کہ ایک شخص بیک وقت ایک ادیب، سیرت نگار، سوانح نگار، تذکرہ نگار اور منطق وفلسفہ کا ماہر کیسے بن سکتا ہے۔وہ مولانا کی ذات وصفات حمیدہ صبر وتوکل وسنجیدگی ومتانت سے حاصل کی جاسکتی ہے اور بطور عبرت اس کو دیکھا جاسکتا ہے۔یہ تھی مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی صاحب کی ذات کا مختصر تعارف، اللہ تعالیٰ موصوف کو اپنے فضل وکرم سے صحت وعافیت کے ساتھ مزید علمی مشغولیت نصیب فرمائے اور امت اسلامیہ کی خدمت کی توفیق بخشے اور عمر طویل کے ساتھ علمی سفر کو جاری رکھنے کے اسباب فراہم کریں۔آمین

☆ایڈوکیٹ پٹنہ ہائی کورٹ، پٹنہ

(۱۲)

# ابوالکلام قاسمی شمسی کی تحریروں کا تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر بدرالدجیٰ بدر

اردو ادب میں مولانا ابوالکلام قاسمی کی خدمات نہ صرف یہ کہ کافی وقیع ہیں بلکہ مختلف الجہات بھی ہیں۔ موصوف نے اردو میں متعدد تصانیف کے علاوہ عربی زبان میں کئی درسی کتابیں بھی لکھی ہیں، جو مختلف دینی اداروں میں زیر نصاب ہیں۔ مولانا ابوالکلام قاسمی کی تصانیف کی فہرست ہم گذشتہ باب میں پیش کر چکے ہیں۔ اس باب میں پہلے موصوف کی اردو تصانیف کا جائزہ لیا جائے گا بعد ازاں عربی تصانیف کا ایک تنقیدی تجزیہ پیش کیا جائے گا۔

اردو میں مولانا کی اہم تصنیف تذکرہ علمائے بہار ہے جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے پہلے جلد کی اشاعت ۱۹۹۵ء میں ہوئی۔ جس کی ضخامت ۴۹۹ صفحات میں ہے۔ اس دستاویزی کتاب میں مولانا ابوالکلام قاسمی نے ۵۰۱ علمائے کرام کے حالات نہایت تحقیق کے ساتھ پیش کئے ہیں، تذکرے کی ترتیب چونکہ الفبائی ترتیب میں ہے، اس لئے علمائے بہار کے تذکرہ میں تاریخی تسلسل کی تلاش کار عبث ہے۔

اس تذکرہ کے ۴۲۴ صفحات علماء کے تذکرے کا احاطہ کرتے ہیں۔ پھر ۴۲۵ صفحہ سے ۴۴۹ صفحہ تک ان تمام علماء بہار کے وفیات کی ایک فہرست پیش کی گئی ہے جن کا تذکرہ اس کتاب

میں موجود ہے۔ اگر کوئی اس موضوع کا طالب علم کسی خاص عالم دین کی تاریخ وفات تلاش کرنا چاہے تو اس فہرست وفیات کے ذریعہ اس کی رسائی مطلوبہ مواد تک بآسانی ہوسکتی ہے۔ اس کتاب کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ وفیات کی فہرست کے بعد تقویم ہجری وعیسوی کی ایک لمبی فہرست بھی فاضل مصنف نے پیش کی ہے، جس کے تحت بعض مخصوص ہجری تاریخوں کو عیسوی تاریخ سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس کی مدد سے کوئی بھی قاری سنہ ھجری کی مخصوص تاریخوں کو اگر چاہے تو اس تاریخ کو عیسوی سنہ کون سی ہوگی تو وہ اس عیسوی سنہ کو کم از کم ضرور حاصل کر لے گا۔ مثلاً یہ کہ اگر ہمیں یہ معلوم کرنا ہو کہ ۱۰۰۱ھ میں عیسوی سنہ کا کون سا مہینہ اور سال تھا تو اس تقویم کے ذریعہ ہم بآسانی معلوم کرسکتے ہیں کہ اس ھجری سنہ میں ستمبر ۱۵۹۲ء کا ماہ وسال تھا۔ گرچہ یہ کام نہایت عرق ریزی اور تحقیق کا کام ہے، لیکن مولانا ابوالکلام قاسمی اس دشوار گذار راہوں سے بھی بآسانی گذر گئے ہیں۔ گرچہ یہ کام نہایت مختصر اور سرسری ہے، لیکن تاریخ کے طلبہ کے لئے نہایت مفید اور کار آمد بھی ہے۔

تقویم کے بعد کتاب کے آخر میں کتابیات اور حوالہ جات کی ایک طویل فہرست ہے، جن حوالوں کا استعمال اس کتاب میں ہوا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ یہ کتاب بہار کے علماء کے تذکرہ کے موضوع پر ایک معتبر اور مستند کتاب ہے۔ اس تذکرے کی اپنی ایک عصری وادبی اہمیت بھی ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں بہار کے مشہور ناقد پروفیسر وہاب اشرفی تاریخ ادب اردو جلد دوم میں یوں رقم طراز ہیں:

> ''موصوف نے عربی میں کئی کتابیں مرتب کی ہیں اور اردو ادب میں بھی قابل لحاظ کام کیا ہے۔ اردو کی ایسی تمام کتابوں میں تذکرہ علمائے بہار کی بڑی اہمیت ہے۔ اس کی پہلی جلد ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئی، دوسری زیر طبع ہے۔ پہلی جلد میں پانچ سو علماء کا تذکرہ ہے اور دوسری جلد میں بھی تقریباً یہی تعداد ہے۔ تذکرہ علمائے بہار کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں کچھ ایسے علمائے دین ہیں جو باضابطہ شاعر اور ادیب بھی رہے ہیں۔ ان میں بعض تو صاحب دیوان شاعر ہیں۔ خصوصاً پھلواری شریف کے علماء اور بزرگوں میں اچھی خاصی تعداد شعرائے کرام کی ہے، جن کے مسودات آج بھی وہاں کی لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔ مخطوطات کی بھی اچھی خاصی فہرست ہے۔ گویا مولانا ابوکلام قاسمی کی متعلقہ کتاب کے دونوں حصے ایسی رہنمائی کرتے ہیں جن کی بنیاد پر بعض گمشدہ یا فراموش شدہ شاعروں اور مصنفوں تک پہنچا جاسکتا ہے۔ سبھی جانتے

ہیں کہ قدیم مرثیوں کا ایک بڑا خزانہ پھلواری شریف کی خانقاہوں کے کتب خانوں کی زینت ہیں۔ گاہے بگاہے ان پر توجہ کی جاتی رہی ہے، لیکن نہ تو پورا سرمایہ کسی کا نگاہ میں ہے اور نہ ہی ایسے مخطوطات اور مسودہ کی اشاعت کا کوئی سلسلہ قائم ہوا۔ تذکرہ علمائے بہار کے حوالے سے بہت سی اہم کتابوں اور شاعروں تک رسائی ممکن ہے۔ گویا یہ ایک دستاویزی کتاب ہے جس کی طرف اہل علم کی توجہ ہونی چاہیے۔ متعلقہ دونوں کتابوں کے ماخذ پر ایک نگاہ ڈالی جائے تو الف سے یا تک دوسوتراسی ۲۸۳ کتابوں کا یا مسودوں کا ذکر ہے، جس سے یہ تذکرہ مرتب کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ ۴۴ رکتابیات کی فہرست درج ہے، جو مختلف نوعیت سے کسی نہ کسی طرح اس کتاب میں حوالے کے طور پر استعمال ہوئی ہیں۔ اس لحاظ سے تذکرہ علمائے بہار کی ادبی اہمیت ہے، جس کی طرف ہمارے محققوں اور نقادوں کی توجہ ہونی چاہئے۔'' ۱ے

تذکرہ علمائے بہار پر پروفیسر وہاب اشرفی کا بھرپور اور تفصیلی تبصرہ اس کتاب کی ادبی اہمیت ومعنویت نمایاں کرنے کے لئے کافی ہے، بلکہ بادی النظر میں اگر دیکھا جائے تو اس تبصرہ سے تذکرہ علمائے بہار کے تعلق سے مالہ وماعلیہ سامنے آجاتا ہے اور ایک مجموعی تاثر یہ ابھرتا ہے کہ مولانا ابوالکلام قاسمی کی یہ تصنیف دستاویزی نوعیت کی حامل ہے۔

پروفیسر وہاب اشرفی کا مذکورہ تبصرہ اس کتاب کے ادبی پہلوؤں کو نمایاں کرتا ہے، لیکن بحیثیت تذکرہ کے بھی اگر مولانا قاسمی کے اس کتاب کا جائزہ لیا جائے تو کئی پہلو واضح ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں روزنامہ انقلاب، دہلی کے سب ایڈیٹر ثناء اللہ ثنادوگھروی اپنے ایک تاثراتی مضمون میں لکھتے ہیں:

''اب تک تذکرہ کے موضوع پر بے شمار کتابیں تصنیف کی جا چکی ہیں، بیشتر مصنفین نے اس فن پر طبع آزمائی کی ہے اور آنے والی نسلوں کے لئے ایک بے بہا اثاثہ چھوڑا ہے، جس سے رہتی دنیا تک تشنگان علوم وفنون اپنی پیاس بجھاتے رہیں گے۔ ان میں مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب آب حیات، مولوی حبیب اللہ عظیم آبادی کا تذکرۃ الصالحین، مولانا مفتی حبیب الرحمٰن کی کتاب تذکرہ مشائخ دیوبند، حکیم سید احمد اللہ ندوی کی تصنیف تذکرہ مسلم شعرائے بہار، مولانا مفتی ظفیر الدین کا تذکرہ مشاہیر علماء دارالعلوم دیوبند، شاد عظیم آبادی کا ''تذکرہ اسلاف'' شاداں فاروقی کا بزم شمال، فرمان فتح پوری کا ''تذکرہ علمائے ہند'' کے نام خصوصی طور سے لئے جاتے

ہیں۔اسی سلسلے کی ایک خوبصورت اوراہم کڑی ہے مولاناابوالکلام قاسمی شمسی (مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ، بہار کے موجودہ پرنسپل) کی تصنیف تذکرہ علمائے بہار‘‘ جس کی جلداول جو ۴۹۹ صفحات پرمشتمل ہے، پہلی بار میں اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ منظرعالم پرآکرعام قارئین اورادبی دنیاسے دادوتحسین حاصل کرچکی ہے۔تذکرہ علمائے بہارکی مزیددوجلدیں منظرعام پرآناباقی ہیں،جیساکہ خودمصنف پیش لفظ میں رقم طراز ہیں۔تذکرہ علمائے بہارکی ترتیب وتدوین ایک پروجیکٹ ہے،اس پروجیکٹ کے تحت جلداول میں وفات یافتگان کے حالات شامل ہیں اورجلددوم میں بھی وفات یافتگان کے حالات شامل کیے گئے ہیں،جبکہ جلد سوم سے باحیات اورمعاصرعلماء کے حالات جمع کئے جائیں گے۔‘‘۲

تذکرہ علمائے بہارکے تعلق سے ثناء اللہ دوگھروی کا یہ تبصرہ کئی پہلوؤں کواجاگرکرتاہے،مثلاً یہ کہ مولاناابوالکلام قاسمی نے تذکرہ علمائے بہارلکھ کربہارکے علماء کوزندہ وجاویدبنادیا۔ایک طرف تواس کتاب میں صوبہ بہارکے مشاہیرعلمائے کرام کاتذکرہ ایک جگہ جمع ہوگیا۔مثلاً مولانامحمدعلی مونگیری،مولانامنت اللہ رحمانی امیرشریعت رابعؒ،مولاناعارف ہرسنگھ پوری،مولانابشارت کریم گڑھولویؒ،مولانامحمدادریسؒ،مولانامناظراحسن گیلانی،مولاناابولمحاسن محمدسجادؒ،مولاناسیدسلیمان ندویؒ،مولاناسلیمان اشرف ندویؒ اورپھلواری شریف کے علماءشعراء وادباء ایک ساتھ آگئے ہیں۔دوسری طرف بہارکے ان علمائے کرام کابھی تذکرہ ہوگیاہے جودوردرازکے دیہاتوں میں قیام پذیرتھے اوراب تک بہارکے علمی منظرنامے پران کاتذکرہ نہیں ہواتھا۔

دوسراپہلویہ ہے کہ تذکرہ علمائے بہارکواس کے فاضل مصنف نے ایک پروجیکٹ قراردیاہے۔ادب کے محققین سے یہ بات مخفی نہیں کہ کوئی بھی پروجیکٹ کی تکمیل ایک فردکے بس کی بات نہیں ہے، بلکہ کئی افرادکے تعاون سے کوئی بھی پروجیکٹ پایۂ تکمیل کوپہنچتاہے۔بعض اوقات پروجیکٹ کوتحقیقی مراحل سے گذرناہوتاہے،بلکہ اس کی تکمیل میں کئی سال لگ جاتے ہیں۔مولاناابوالکلام قاسمی کے اس پروجیکٹ کے تحت تذکرہ علمائے بہارکی جلداول ۱۹۹۵ء میں جامعہ اسلامیہ بالاساتھ سیتامڑھی کے اشتراک سے چھپ کرباذوق قارئین سے خراج تحسین حاصل کرچکی ہے۔اس میں تقریباً ۵۰۰ علمائے کرام کے حالات شامل ہیں۔اسی طرح اس کی دوسری جلدبھی ۲۰۰۶ءزیورطبع سے آراستہ ہو

چکی ہے، جس میں ۲۸۳ علماء کے حالات شامل ہیں، تیسری جلد بھی طباعت کے مرحلے میں ہے۔

تذکرہ علمائے بہار کے بارے میں ایک معتبر عالم دین مولانا صغیر احمد رحمانی کا تبصرہ بھی قابل ذکر ہے، جو مولانا ابوالکلام قاسمی مصنف کتاب کے ابتدائی عربی درجات کے استاد بھی رہ چکے ہیں۔

''تذکرہ علمائے بہار جلد اوّل اور جلد دوم لکھ کر قاسمی صاحب نے جید اور باکمال علماء جو گوشۂ گمنامی میں تھے اور جن سے موجودہ نسل بے خبر تھی، ان کے حالات اور سوانح کا معلوم کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ اس مرحلہ کی تمام مشکلات کو سر کرتے ہوئے علم وتحقیق کی دنیا میں بہت مفید اور دستاویزی شہادتیں فراہم کردیں۔ اب تک مرحومین علماء کے تذکرے ہیں، ابھی سرزمین بہار کے گل ولالہ کے بہت سے باغات ہیں، ان پر مصنف کی محنت جاری ہے۔ خدا کرے یہ کام بھی ان کے ہاتھوں انجام پائے اور علم وتحقیق کی دنیا میں مشعل راہ ثابت ہو۔ مولانا قاسمی نے تذکرہ علمائے بہار کے ذریعہ بہار کے علماء کی خدمات کو متعارف کرانے کی ایک طرح ڈالی ہے اور اس انداز سے مختلف شعبہ ہائے حیات سے تعلق رکھنے والے شخصیات پر مواد فراہم کرنے کی نئی راہ وا ہوئی ہے۔'' (۳)

تذکرہ علمائے بہار کے بارے میں مولانا صغیر احمد رحمانی کا یہ تبصرہ بہت ہی جامع اور برمحل ہے۔ اس تبصرہ میں مولانا رحمانی نے نہ صرف یہ کہ کتاب کے مقاصد کو بیان کردیا ہے، بلکہ علماء کے تذکرہ سے متعلق مستقبل کے امکانات ومضمرات کو بھی بیان کردیا ہے۔

اس کتاب کو اگر صرف تذکرہ کی نظر سے بھی دیکھا جائے تو اس کا ایک مثبت پہلو سامنے آتا ہے۔ ادبی منظرنامے پر ناول نگاری، افسانہ نویسی، تاریخ نویسی، سوانح نگاری وغیرہ جیسے علوم وفنون کے بے شمار ستارے درخشاں ہیں، جن سے نسل انسانی فیضیاب ہو رہی ہے اور ہوتی رہی گی۔ ان اصناف کے درمیان ایک اہم ترین صنف تذکرہ نگاری بھی ہے۔ یہ ایک ایسا فن ہے جو ہمیں ہمارے اسلاف کی زندگیاں، ان کے حالات وکوائف، ان کے کارہائے نمایاں پر مبنی ہر حقیقت اور اطلاعات فراہم کراتا ہے۔ ساتھ ہی ہمارے سامنے ماضی کی تہذیب وثقافت کا آئینہ بھی پیش کرتا ہے۔ تذکرہ نگاری درحقیقت نہایت ہی سخت کوش اور محنت طلب فن ہے، کیونکہ افسانے اور ناولوں کی طرح فنکار کے تصورات وخیالات کو اس فن میں قطعی دخل نہیں ہوتا ہے، بلکہ تذکرہ نگار متعلقہ اشخاص کی زندگی کے ایک

ایک ظاہری و باطنی پہلوؤں کی چھان بین بہت ہی عرق ریزی اور جانفشانی سے کرتا ہے اور ان تمام حقائق کو مرتب کر کے خوبصورت انداز میں کما حقہ اپنے قارئین تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔

تذکرہ علمائے بہار کی اس جلد میں بہار سے متعلق علمائے کرام کی زندگیاں اور ان کے حالات قلمبند کئے گئے ہیں۔ ان تمام علمائے کرام کے اسمائے گرامی ابجدی ترتیب کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں، جن سے قارئین کو کسی نام کے تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی اور پھر کتاب کے آخر میں وفیات کی ایک علیحدہ فہرست دے دی گئی ہے۔ پھر تقویم ہجری وعیسوی اور آخر میں ماخذ بھی ابجدی ترتیب کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔ مصنف نے اس سلسلے میں قارئین کی سہولتوں کا بھی خیال رکھا ہے۔ کتاب کے سرورق پر غالباً کھلی ہوئی کتاب اور کھلے ہوئے قلم اس بات کی غمازی کر رہے ہیں کہ یہ کام ابھی اپنے پایہ تکمیل کو نہیں پہنچا ہے۔ ظاہر ہے، جیسا کہ اوپر کے سطور میں بیان کیا گیا ہے، یہ ایک باضابطہ پروجیکٹ ہے، جس کی تکمیل کے لئے کاوشیں جاری وساری ہیں۔

فاضل مصنف نے اس کتاب میں زبان وبیان کی نزاکت کو ہر قدم پر پیش نظر رکھا ہے۔ نہایت ہی عمدہ، سلیس اور سریع الفہم زبان میں اپنی باتیں کی ہیں۔ خواہ مخواہ عربی وفارسی کے ثقیل الفاظ کے استعمال سے حتی الامکان گریز کرنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ عام قارئین جو کم پڑھے لکھے ہوتے ہیں وہ بھی عبارت کو اچھی طرح اور آسانی سے سمجھ سکیں۔ چونکہ مولانا کو اردو کے ساتھ عربی وفارسی پر بھی کلی دسترس حاصل ہے، یہی وجہ ہے کہ مولانا نے فصاحت کا دامن کہیں بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ کتاب میں کہیں کہیں تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے اور بیشتر حقائق یکجا کئے گئے ہیں، تو کہیں تحقیق میں مجبوری پیش آنے پر اختصار سے بھی کام لیا ہے۔ کسی عالم دین سے متعلق اگر مطلوبہ معلومات زیادہ حاصل نہیں ہو سکیں تو کم از کم اس قدر کوشش ضرور کی گئی ہے کہ ان کے ورثاء سے کسی بھی طرح چند حقائق ہی سہی معلوم کر کے کتاب میں جگہ دے دی گئی ہے۔ اس کتاب میں بیشتر ایسے علمائے کرام کے تذکرے ملتے ہیں جو زندگی بھر دینی وادبی خدمات انجام دے کر دنیائے فانی سے کوچ کر گئے اور بعد کی نسلیں ان کے بارے میں جانتی تک نہیں۔ ان کے اپنوں نے بھی انہیں بھلا دیا اور وہ گمنامی کے پردے میں چلے گئے، جو یقیناً ان کے ساتھ ناانصافی تھی۔

مولانا ابوالکلام قاسمی نے اس سلسلے میں پوری طرح جانفشانی اور تگ ودو سے کام لیا اور مختلف علاقوں اور مختلف لائبریریوں کی خاک چھان کران گمنام علماء کے متعلق جس قدر اور جہاں تک ہوسکا حقائق معلوم کر کے یکجا کئے اور انہیں تذکرہ علمائے بہار میں شامل کر کے ایک نئی زندگی عطا کرنے کی خوبصورت کوشش کی، جو یقیناً لائق ستائش اور ادبی اعتبار سے کار خیر ہے، اور یہی شاید اس کتاب کی تصنیف کا بنیادی مقصد بھی ہے۔

پوری کتاب میں کہیں کوئی اول فول یا فضول گفتگو نہیں ملتی اور نہ ہی کہیں کسی طرح کی کوئی مبالغہ آرائی ملتی ہے اور نہ ہی کہیں مرچ مسالے سے کام لیا گیا ہے، بالکل سادہ اور سلیس انداز میں حقائق پیش کئے گئے ہیں۔ جن کے متعلق جو بھی باتیں کہی گئی ہیں مکمل حوالے، مستند ثبوتوں اور پختہ سند کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے تاکہ کتاب کی صحت پر کسی طرح کی کوئی آنچ نہ آسکے۔ جہاں ضرورت محسوس کی گئی ہے حواشی سے بھی کام لیا گیا ہے۔ اس طرح کتاب کے مطالعہ سے مولانا قاسمی کی بہترین فنی صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

موجودہ ادبی منظرنامے پر یوں تو روز ہی کوئی نہ کوئی کتاب منظر عام پر آتی رہتی ہے، مگر ان میں کم ہی ایسی کتابیں ہوتی ہیں، جس کا مقصد قوم وملت یا ادب کی خدمت ہو، یا یہ کہ کوئی بھی تعمیری مقصد ہو، اور جس سے ہمارا معاشرہ فیضیاب ہو۔ اس ضمن میں مولانا ابوالکلام قاسمی کی تصنیف ''تذکرہ علمائے بہار'' یقیناً ایک قابل تحسین ملی وعملی کارنامہ ہے۔ ادبی حلقے میں جس کی کمی محسوس کی جارہی تھی یہ کتاب اس کمی کی تلافی ہے۔ مولانا قاسمی نے اپنے شب وروز کی عرق ریزی سے گویا اس خلا کو پر کرنے کی مستحسن کوشش کی ہے۔ پیش نظر کتاب ''تذکرہ علمائے بہار'' ایک ایسا ادبی سرمایہ ہے کہ میری ناقص رائے میں اس کتاب کو مسلم معاشرے کے ہر گھر میں موجود ہونا چاہئے تاکہ نئی نسل کے لوگ بہار کے علمائے کرام سے واقف ہوسکیں، کیونکہ اس کتاب میں بہار کے ان تمام بزرگان کاملین اور علمائے عارفین کے تذکرے شامل کئے گئے ہیں، جنہوں نے اپنی زندگیاں چمنستان اسلام کی آبیاری کے لئے وقف کردیں اور یہ سب کچھ انہوں نے نام ونمود اور دنیاوی شہرت کے لئے نہیں، بلکہ خالصتاً اللہ کے لئے کیا، جن سے ہمارا اور آپ کا کسی نہ کسی طرح کا تعلق ضرور ہے۔ لہٰذا اس کتاب کا

مطالعہ ضرور کیا جانا چاہئے تا کہ اپنے آباء واجداد کی زندگیوں کے متعلق معلومات حاصل کر سکیں اور ان کے کارناموں، ان کے عادات واطوار اور ان کے اخلاق حسنہ کو جاننے اور ان سے سبق حاصل کرنے کی دلچسپی پیدا کریں۔ توقع ہے کہ کتاب تذکرہ علمائے بہار کی ادبی دنیا میں خاطر خواہ پذیرائی ہوگی اور اس کی تابانیوں سے ادبی دنیا روشن رہے گی۔

## تذکرہ علمائے بہار۔ جلد دوم:

یہ کتاب مولانا ابوالکلام قاسمی کے علمائے بہار پر پروجیکٹ کی توسیعی شکل ہے، جس کے تحت تذکرہ علمائے بہار کی یہ دوسری جلد ہے۔ یہ کتاب ۲۰۰۶ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ یہ کتاب ۲۹۴ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں بہار کے ۲۸۳ علماء کا تذکرہ ہے۔ اس کتاب کو بھی فاضل مصنف نے اپنے پرنسپل شب کے مصروف ترین دور میں ترتیب دیا۔ زبان وبیان اور سلاست وروانی بھی تقریباً وہی ہے جو تذکرہ علمائے بہار جلد اول میں ہے۔ اس کتاب پر بہار کے مایہ ناز اردو شاعر کلیم عاجز نے خالص ادبی اور مخلصانہ انداز میں تبصرہ کیا ہے جو برمحل ہے۔

’’حضرت مولانا ابوالکلام قاسمی نے نہایت ہی عمدہ موضوع منتخب کیا، گرچہ علماء کا حال بہت تفصیل سے نہیں ہے، مگر ان کے علمی جدوجہد اور تعلیمی خدمات کا ذکر تفصیل سے ہے۔ جو کچھ ان علماء حضرات نے کمایا ہوگا وہ تو قوم وملت کی جھولی میں داخل ہیں۔ جھولی میں آیا تو خرچ بھی ہوا، یہ تاریخ اور یہ تذکرہ مبارک ہے۔ ان کا نام زندہ ہے تو ان کا کام بھی کسی نہ کسی حد تک زندہ رہے گا۔ نام پڑھ کر بھی حوصلہ بڑھے گا تو آئندہ اور بھی کام ہوگا۔ ہندوستان میں اس وقت اردو کے نام پر واویلا ہے۔ واویلا وہی کرتے ہیں جو سودا کرتے ہیں۔ کام کرنے والے واویلا نہیں کرتے، شور نہیں کرتے، جھگڑا نہیں کرتے، کام نہیں ہوتا ہے تو یہی سب ہوتا ہے اور اس وقت علماء ہی کا ادارہ ہے۔ بڑا چھوٹا جیسا بھی ہو جہاں بھی ہو دین کی حفاظت بھی اور زبان وادب اور تہذیب وثقافت کی بھی حفاظت کا سامان یہیں سے پہلے بھی ہوا۔ دین زبان وادب تہذیب، عقیدہ سب کچھ غارت کرنے کا سامان کر کے دشمن اٹھے، تو یہی داڑھی ٹوپی والے کمر کس کر میدان میں آ گئے۔ گرے بھی، مرے بھی، لیکن حملہ کو تو روک ہی لیا۔ حملہ علی گڑھ سے نہیں رکا، جامعہ ملیہ اسلامیہ سے نہیں رکا، رکا تو ان

سے جو گلی گلی، شہر شہر بھیک مانگ کر لائے۔ اپنے گھر میں، جھونپڑیوں میں، مکانوں میں حفاظت کا سامان، حفاظت کا بندوبست کرنے لگے اور اب تک کر رہے ہیں۔ میں مدرسوں میں جاتا ہوں تو میری آنکھیں آنسوؤں سے بھگ جاتی ہیں اور کبھی کبھی ان کو روکنا، سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے تو میں زور سے رو پڑتا ہوں۔ سڑکوں پر وردیوں میں، سوٹ ٹائی پہن کر بچوں کو اسکول جاتے دیکھتا ہوں، رکشوں پر، بسوں میں، کاروں میں، موٹر سائیکلوں پر، پھر ان کی زندگی دیکھتا ہوں اور پھر دیکھتا ہوں کہ میلے کپڑوں میں، ٹوپیوں میں چھوٹے چھوٹے بچے قرآن شریف پڑھ رہے ہیں اور کھڑے ہو کر قرآن شریف سنا رہے ہیں، اردو کی نعت پڑھ رہے ہیں۔ حمد سنا رہے ہیں تو زور سے رو کر کہتا ہوں کہ اے اللہ! تو گواہ رہ کہ تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے نام کو یہ غریب یتیم بچے اپنے سینے سے لگا کر چٹائیوں پر جھوم جھوم کر اعلان کر رہے ہیں کہ

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام ونشاں ہمارا" (۴)

اس تبصرہ کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تبصرہ نگار ڈاکٹر کلیم عاجز کے دل میں مذہبی جذبات کا ایک ہجوم ہے جو امنڈتا چلا آرہا ہے۔ اس نوعیت کے تبصرہ کا پس منظر یہ ہے کہ ڈاکٹر کلیم عاجز نے اپنے بچپن اور سن شعور کا وافر حصہ علماء و مشائخ کے سایہ میں گذارا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موصوف نے جذبات کے سمندر میں ڈوب کر یہ تبصرہ لکھا ہے، جس کا ہر لفظ اور ہر جملہ علماء کے تعلق سے عقیدت کا اظہار ہوتا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ادبی پہلو سے قطع نظر تذکرہ علمائے بہار گویا ایک مذہبی فریضہ کی ادائیگی بھی ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ علمائے بہار کے تعلق سے تذکرہ کی یہ پہلی کوشش ہے، جس کی پذیرائی مسلم معاشرے سے ہر سطح پر ہونی چاہئے، بلکہ ہوئی بھی ہے۔ اس لئے کہ بہار کے وہ علماء جو اپنی منفرد مذہبی وادبی خدمات کی وجہ سے ادبی منظرنامے پر نمایاں رہے، ان میں بعض وہ بھی تھے جو عالم دین کے ساتھ صاحب دیوان شاعر اور ادیب بھی تھے، لیکن وہ علماء حضرات جو دور دراز کے دیہاتوں میں راضی برضا ہو کر اپنی قیمتی زندگی کو دین کی خدمت میں گذار دیا اور کبھی شہرت وناموری کی خواہش بھی نہیں کی، ان کے کارناموں سے نئی نسل تاہنوز واقف نہیں تھی، ان کو مولانا

ابوالکلام قاسمی نے گوشۂ گمنامی سے نکال کر نہایت عرق ریزی سے ان کے حالات کی تحقیق کی اور اپنی اس کتاب میں انہیں جگہ دی، بلاشبہ مولانا قاسمی کا یہ تاریخی کارنامہ ہے جس کی عصری اہمیت اور معنویت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔

مولانا ابوالکلام قاسمی کی اس دستاویزی تصنیف پر مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی نائب ناظم امارت شرعیہ نے ایک بہتر تبصرہ کیا ہے، مفتی صاحب موصوف اس ضمن میں رقم طراز ہیں:

> ''تذکرہ علمائے بہار جلد اول ودوم'' علماء کی خدمات کو ہر سطح پر متعارف کرانے اہم رول ادا کیا ہے، ان کتابوں میں مولانا کی محنت دیدنی ہے۔ علم وتحقیق کے میدان میں ہر دم آگے بڑھنے والی میزیں سامنے لانے کا موقع ہوتا ہے۔ مولانا نے ان امکانات سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ تذکرہ علمائے بہار کی دو جلدیں علمی دنیا میں اپنا الگ مقام رکھتی ہیں۔ حالانکہ کئی جگہ پر تذکرہ میں مہ وسال کے غلط اندراج، شاعروں کے تخلص میں پھیر بدل کی وجہ سے قاری ٹھوکر کھاتا ہے۔ غالباً شاداں فاروقی مرحوم نے ان اغلاط کی ایک فہرست بھی زبان وادب میں شائع کرائی تھی، لیکن ایسی ضخیم کتاب میں چند جگہ غلطیوں کا رہ جانا امر مستبعد نہیں ہے انسانی کاموں میں ایسی بھول چوک ہوتی رہتی ہے۔ اس لئے اس سے صرف نظر کرنا چاہئے۔ البتہ غلطیوں کا یہ سلسلہ جاری نہ رہے، اس کے لئے آئندہ ایڈیشن میں تصحیح کی تجویز ضرور رکھنی چاہئے۔''
>
> علم وعمل کے پیکر مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی (ایک تاثراتی مضمون) مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی۔ (۵)

تذکرہ علمائے بہار جلد اول ودوم پر مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی کا یہ بے لوث تبصرہ صالح تنقید کے زمرے میں آتا ہے، جس میں مفتی صاحب موصوف نے تذکرہ علمائے بہار کے دونوں جلدوں کی عصری اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام قاسمی کی تحقیقی صلاحتیوں کا بھی اعتراف کیا ہے، ساتھ ہی مئودب اور مہذب انداز میں رہنمائی بھی کی ہے۔

مختصر یہ کہ مولانا ابوالکلام قاسمی کی درجنوں تصانیف میں تذکرہ علمائے بہار کی دونوں جلدوں کو اپنے موضوع اور عصری معنویت کے پیش نظر ان کی بقیہ تصانیف پر بہرحال فوقیت حاصل ہے۔ اس میں انہوں نے پہلی مرتبہ علمائے بہار کا سوانحی خاکہ پیش کرتے ہوئے ان کے علمی کارناموں پر بھی مختصر روشنی ڈالی۔ اپنے سادہ انداز بیان اور منفرد اسلوب نگارش کے ذریعہ علمائے کرام کی تحریک

کے پوشیدہ پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے اور ان کی حقیقی تصویر کی عکاسی کی ہے۔اس کتاب نے علمائے کرام سے متعلق تحقیق کے لئے ایک نیا دروازہ کھول دیا ہے۔ چنانچہ علمائے بہار کی خدمات پر مختلف حلقوں سے تحقیقی کام کا آغاز ہو چکا ہے۔جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے،ان دونوں جلدوں میں تقریباً آٹھ سو علماء بہار کا تذکرہ آچکا ہے۔کتاب کے سرسری جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ مذکورہ علماء میں سے کچھ ایسے علمائے دین بھی ہوئے ہیں، جو باضابطہ صاحب دیوان شاعر اور صاحب طرز ادیب بھی رہے ہیں۔مجموعی طور پر ادبی لحاظ سے مذکورہ دونوں جلدوں میں ساری فنی خوبیاں موجود ہیں،تاریخی اعتبار سے بھی اس کتاب کو دستاویزی حیثیت حاصل ہے۔

مولانا ابوالکلام قاسمی کے بارے میں پروفیسر عبدالمنان طرزی نے ایک منظوم خاکہ پیش کیا ہے، جس میں تذکرہ علمائے بہار کا بھی خصوصی طور پر تذکرہ ہے۔اس ضمن میں چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

وہ بہاری علماء کا تذکرہ میں لکھ گئے
مشتمل دو جلدوں پر یہ کارنامہ جانئے
قاسمی امید رکھتے حسب توفیق خدا
جائے گا دو اور جلدوں تک یہ ان کا تذکرہ
تذکرہ کی وجہ سے ہے اک حقیقت سامنے
ادباء وشعراء بھی کچھ ان عالموں میں تھے بڑے
بعض عالم تو یقیناً صاحب دیوان ہیں
بعض عالم نثر میں خود صاحب ایقان ہیں

بعض کی تخلیقیں ہیں فائنل مسودات ہی
جو کتب خانوں میں ہیں محفوظ پوری آج بھی
ایک اہم پہلو جو ہے اس تذکرے کا اور بھی
اس میں مخطوطات کی فہرست بھی دیکھی گئی

گم شدہ اور علم والے باخبر افراد کی
ہو گی دنیا کے ادب کو اس طرح پہچان بھی
رکھتے ہیں شعر وادب میں وہ جہاں عالی مقام
کچھ تو واقف ہم بھی ہو جائیں گے ان سے لا کلام
جو اشارے بھی یہاں کر گئے ہیں قاسمی
دولت علمی کی جانب گویا انگلی ہے اٹھی
کوئی دیوانہ ہو پیدا بڑھ کے منزل تھام لے
ساغر وصہبا، سبو، مینا، صراحی جام لے
کوئی تو دیوانہ ہو، کر جا کے یہ کارگراں
قاسمی نے دی زمیں وہ لائے جس کا آسماں
سیدھا سادا، پرخلوص ان کا مگر اسلوب ہے
دیدۂ ودل کو یقیناً ہر بیاں مرغوب ہے
جس طرح کوزے میں دریا کو سمو دیتا کوئی
جانتے ہیں یہ ہنر بھی بوالکلام قاسمی (۶)

مذکورہ بالا اشعار میں شہرۂ آفاق شاعر پروفیسر عبدالمنان طرزیؔ نے تذکرہ علمائے بہار کے دونوں جلدوں کی تصویر کشی نہایت دلکش اور جامع انداز میں کردی ہے۔ طرزیؔ صاحب کے انداز کے مطابق یہ تذکرہ چار جلدوں تک جائے گا۔ میری معلومات کی حد تک تذکرہ علمائے بہار کی تیسری جلد بھی زیر ترتیب ہے۔ قاسمی صاحب کا اشہب قلم ابھی بھی رواں دواں ہے۔ چوتھی جلد بھی اگر ہو جائے تو بعید از قیاس نہیں ہے۔ (۶)

مولانا ابوالکلام قاسمی کی دوسری اہم تصنیف ''مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ سے مولانا مظہر الحق عربی وفارسی یونیورسٹی تک'' ہے۔ یہ ایک خالص علمی اور تحقیقی کتاب ہے۔ جس کی اشاعت ۲۰۱۲ء میں ہوئی۔ یہ کتاب ۲۰۳ صفحات کی ضخامت پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے ابواب اور موضوعات

کو دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ مولانا قاسمی کو علوم مشرقیہ اور دینی اداروں سے بے حد دلچسپی ہے۔

یہ کتاب کل آٹھ ابواب پر مشتمل ہے جو درج ذیل ہیں۔

باب۔۱ : مدارس اسلامیہ

باب۔۲ : صوبہ بہار کے مدارس

باب۔۳ : مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ

باب۔۴ : بہار اکزامینشن بورڈ/ بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ پٹنہ

باب۔۵ : بہار طبی اسکول

باب۔۶ : ادارہ تحقیقات عربی وفارسی پٹنہ

باب۔۷ : مولانا مظہر الحق عربی وفارسی یونیورسٹی پٹنہ

باب۔۸ : متفرقات

اس کتاب کے مذکورہ بالا ابواب کے تحت جو عنوانات آئے ہیں۔ان عنوانات کے تحت کئی ذیلی عنوانات ہیں، جن کے تحت موضوعات کی وضاحت کی گئی ہے۔ویسے اس کتاب کے سلسلے میں ایک بات قابل غور ہے کہ کتاب کا جو عنوان ''مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ سے مولانا مظہر الحق عربی وفارسی یونیورسٹی تک'' ہے، اس سے قارئین کرام کو یہ مغالطہ نہیں ہونا چاہئے کہ یہ کتاب مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے قیام سے لے کر مولانا مظہر الحق عربی وفارسی یونیورسٹی پٹنہ کے قیام تک کی کہانی ہے، یا یہ کہ اس درمیان میں دیگر اسلامی اداروں کے قیام کی داستان ہے، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کتاب کے تیسرے باب میں جس کا عنوان ''مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ'' ہے۔اس باب کے ذیلی عنوانات میں چھٹا مقالہ ''مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ سے مولانا مظہر الحق عربی وفارسی یونیورسٹی تک'' کے عنوان سے باضابطہ شامل کتاب ہے، جس میں مذکورہ عنوان کے تحت تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔تاہم چونکہ کتاب کے دیگر مشمولات بھی اسی موضوع کے ضمن میں آئے ہیں، اس لئے کتاب کا عنوان بھی اسی مناسبت سے ہے۔

کتاب کے پہلے باب کا عنوان ''مدارس اسلامیہ'' ہے، جس کے تحت تین ذیلی مقالے ہیں،

جس میں پہلا مقالہ ''مدارس ومکاتب ملک وملت کے لئے رحمت'' کے عنوان سے ہے۔اس مقالہ میں مولاناابوالکلام قاسمی نے مدارس اسلامیہ کے حقیقی مفہوم کوتفصیلی سے بیان کرتے ہوئے مدارس کی تاریخ کوقدرے تفصیل سے بیان کیاہے،جس میں قرون اولیٰ میں اصحاب صفہ سے لے کرموجودہ دور کے مدارس کااجمالی جائزہ پیش کیاہے۔اس ضمن میں فاضل مصنف نے مدارس کے اغراض ومتاصدکوبھی مختصراور جامع انداز میں بیان کیاہے۔چنانچہ اس مقالے میں ایک جگہ رقم طراز ہیں:

''مدارس ومکاتب میں دین کی تعلیم دی جاتی ہے،ان میں اخلاقیات اورانسانیت کی بہترین تعلیم ہے۔فرائض وحقوق پرخصوصی تعلیم دی جاتی ہے۔ماں باپ کے حقوق، بھائی بہن کے حقوق،سماج کے حقوق،ملک کے حقوق،ہمسایہ کے حقوق،پڑوسی کے حقوق،غرض ہرطرح کے حقوق کی انہیں واقفیت ہوتی ہے۔ساتھ ہی گناہ اور جرائم کے سلسلہ میں بھی انہیں واقفیت ہوتی ہے۔گناہ اور جرائم پرغداب اورعتاب کی بھی خبرہوتی ہے۔سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انہیں ذہن نشیں کرایاجاتاہے کہ تم جوکچھ کررہے ہو،اگرچہ کوئی نہیں دیکھتاہے،لیکن اللہ تو دیکھ رہاہے،اس کی وجہ سے دل میں خشیت الٰہی پیداہوتی ہےاوراس طرح وہ برائیوں سے دوررہتے ہیں اورخلاق سے آراستہ ہوتے ہیں۔''(۷)

مذکورہ بالا اقتباس میں مولاناابوالکلام قاسمی نے مدارس اسلامیہ کی مذہبی اہمیت اورمعاشرتی افادیت کے جتنے پہلوہوسکتے ہیں،سب کچھ بیان کردیاہے۔عصری معنویت کے لحاظ سے بھی یہ مقالہ غیرمعمولی اہمیت کاحامل ہے۔

اس باب کادوسرامقالہ''مدارس کانظام تعلیم'' کے عنوان سے ہے۔اس مقالہ میں فاضل مصنف نے مدارس کے لغوی مفہوم کومدلل انداز میں بیان کرتے ہوئے مدارس کودینی تعلیم کاسرچشمہ قراردیاہے۔اس ضمن میں مدارس کے اندرتعلیمی نظام کاتاریخی حوالوں کے ساتھ جائزہ لیاگیاہے۔

چنانچہ اسلام کاپہلا مدرسہ مدینہ میں قائم کیاگیا،جس کامحل وقوع مسجد نبوی ہے،اس مدرسہ کے پہلے استاد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔اورصحابہ کرامؓ مسجد نبوی میں رہ کرحضورصلی اللہ علیہ وسلم سے دین سیکھتے تھے۔کھانے کانظام یہ تھاکہ کہیں سے کچھ ہدیہ آگیاتوروزی ورنہ روزہ۔توکل علی اللہ پرجینے والے یہ صحابہ کرام اصحاب صفہ کہلاتے تھے۔اسلام کے اس پہلے مدرسہ کے اولین طالب علم

یہی اصحاب صفہ تھے۔

تاریخ کے تمام صدیوں میں مدارس کا یہ نظام عرب کے باہر کے ملکوں میں بھی جاری رہا۔ یہاں تک کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے بعد سے یہاں بھی مدارس کا نظام قائم ہو گیا اور روایتی انداز میں یہ نظام چلتا رہا۔ یہاں تک کہ مغلوں کے زوال کے ساتھ مدارس کا نظام بھی رفتہ رفتہ معدوم ہونے لگا۔ جب ۱۸۵۷ء کے غدر کا ہنگامہ شروع ہوا اور شاملی کے میدان میں ہندوستانی علمائے کرام کا انگریزی افواج سے مقابلہ ہوا، جس کے نتیجہ میں علمائے کرام کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اس ناگفتہ صورت حال سے مجبور ہو کر اس وقت کے اکابر علماء مثلاً حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، مولانا قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی وغیرہ نے سر جوڑ کر غور کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ مادی قوت سے انگریزوں کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا ہے، بلکہ دینی مدارس قائم کئے جائیں اور مذہبی سطح پر انگریزوں کا مقابلہ کیا جائے، جس کے نتیجہ میں دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا، جو ہندوستان میں مدارس کے قیام کا نشاۃ ثانیہ تھا۔ اس طرح مدارس کے قیام سے جو افراد تیار ہوئے وہی مخلص جماعت تھی، جس نے ملک کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کرانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

رفتہ رفتہ ہندوستان میں نہ صرف یہ کہ مدارس کا جال بچھ گیا بلکہ مدارس اسلامیہ کا ایک باضابطہ نظام قائم ہو گیا۔ مدارس کے نظام کے مبادیات پر بات کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام قاسمی کہتے ہیں کہ نظام تعلیم تین چیزوں کے مجموعے کا نام ہے۔ (۱) اساتذہ (۲) نصاب تعلیم اور (۳) تربیت۔ اس طرح اساتذہ کی جملہ خصوصیات مثلاً علمی صلاحیت، فن تدریس میں مہارت، جذبۂ تدریس، اخلاقیات وغیرہ کا بیان کرتے ہوئے مروجہ نصاب تعلیم کو بیان کیا ہے۔ مزید برآں نصاب تعلیم میں درس نظامیہ اور درس عالیہ وغیرہ کی تفصیلات بیان کئے ہیں، پھر نظام تعلیم کی تفصیل بیان کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام قاسمی ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''نصاب تعلیم کا تیسرا اہم جزو تربیتی نظام ہے۔ چند گھنٹوں کی تعلیم سے طلباء میں وہ بات پیدا نہیں ہوتی ہے جو وقت کا تقاضا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ طلباء ہر وقت اپنے اساتذہ کی نگرانی میں رہیں اور انہیں ایسا ماحول ملے جہاں وہ ہر طرح کی فکر سے آزاد ہو کر

حصول تعلیم میں مشغول رہیں۔اس مقصد کے حصول کے لئے مدارس میں اقامتی نظام قائم ہے۔
یہاں طلباء ہاسٹل میں رہتے ہیں، مدرسہ ان کی کفالت کرتا ہے، کھانا کپڑا اور رہنے کا انتظام
مدرسہ کی جانب سے کیا جاتا ہے۔طلبا اساتذہ کی نگرانی میں رہ کر تعلیمی ماحول میں زندگی
گذارتے ہیں، اس طرح مل جل کر رہتے، ایک ساتھ کھانے اور ایک ساتھ رہنے کی تربیت
حاصل ہوتی ہے''(۸)

مذکورہ بالا اقتباس کو پڑھنے سے مدارس کے نظام تعلیم کا پورا نقشہ ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔
گویا مولانا قاسمی نے اس میں مدارس کے نظام تعلیم کو شرح وبسط کے ساتھ بیان کردیا ہے۔

اس باب کا تیسرا مقالہ نہایت ہی اہم ہے جس کا عنوان ''مدارس کی جانب برادران وطن کا رجحان مدارس کے لئے نیک فال'' ہے۔اس مقالہ میں مصنف نے مدارس کی معنویت اور اہمیت کو بیان کرتے ہوئے مدارس کے اس پہلو کو بیان کیا ہے، جس کے تحت مدارس کے تعلیم وتربیت سے متاثر ہو کر غیر مسلم طلبا بھی مدارس کی طرف متوجہ ہوئے اور مدارس کو اپنے تعلیم کے بنیادی ذرائع کے طور پر تصور کیا او مدارس میں باضابطہ پڑھنے لگے۔اس حقیقت کو دلیل کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے۔مثلاً آزاد ہندوستان کے پہلے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرساد نے ابتدائی تعلیم مدرسہ میں حاصل کی تھی اور وہ اردو و فارسی کے اچھے جانکار تھے۔راجا رام موہن رائے نے ابتدائی تعلیم مدرسہ میں حاصل کی تھی۔اردو کے مشہور اسکالر اور طرز نگارش کے مصنف ڈاکٹر سچیتا نند سنہا تھے، جنہوں نے مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ میں باضابطہ تعلیم حاصل کر کے فاضل کی سند حاصل کی۔چنانچہ ان کی لکھی ہوئی اردو قواعد وانشاء کی کتاب ''طرز نگارش'' آج بھی اردو قواعد میں سند کا درجہ رکھتی ہے۔یہ تو ماضی کی بات ہے، آج کی صورت حال یہ ہے کہ بہار کے ملحقہ مدارس میں غیر مسلم لڑکے اور لڑکیاں کثیر تعداد میں داخلہ لے رہے ہیں اور مسلم طلبا کی طرح وسطانیہ، فوقانیہ وغیرہ کی سند حاصل کر رہے ہیں۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ برادران وطن کا رجحان تیزی سے مدارس کی طرف ہو رہا ہے جس سے قومی یکجہتی کے جذبہ کو فروغ ملے گا، اسی لئے مدارس کے لئے یہ فال نیک ہے جس کو ابوالکلام قاسمی نے واضح کیا ہے۔

کتاب کے دوسرے باب کا عنوان ''صوبہ بہار کے مدارس'' ہے۔اس باب میں پہلے مدارس اسلامیہ کے قیام کی ضرورت واہمیت بیان کرتے ہوئے ان کے قیام کے پس منظر کو بیان کیا گیا ہے۔ مدارس اسلامیہ کی ضرورت واہمیت کے تعلق سے علامہ سید سلیمان ندوی کی رائے برمحل ہے۔ملاحظہ ہو:

''ہم کو یہ صاف کہنا ہے کہ عربی مدارس کی جتنی ضرورت آج ہے،کل جب ہندوستان کی دوسری شان ہوگی،اس سے بڑھ کر ان کی ضرورت ہوگی۔وہ ہندوستان میں اسلام کی بنیاد کے مراکز ہوں گے۔لوگ آج کی طرح کل بھی عہدوں اور ملازمتوں کے پھیر اور ارباب اقتدار کی چاپلوسی میں ہوں گے۔اور یہی دیوانے ملاّ آج کی طرح کل بھی ہوشیار ہوں گے۔اس لئے یہ مدرسے جہاں بھی ہوں ان کو سنبھالنا اور چلانا مسلمانوں کا سب سے بڑا فرض ہے۔ان عربی مدرسوں کا اگر کوئی فائدہ نہیں تو یہی کیا کم ہے کہ یہ غریب طبقوں میں مفت تعلیم کا ذریعہ ہے اور اس سے فائدہ اٹھا کر ہمارا غریب طبقہ کچھ اونچا ہوتا ہے اور اس کی اگلی نسلیں کچھ اور اونچی ہوتی ہیں اور یہی سلسلہ جاری رہتا ہے۔''(۹)

مدارس اسلامیہ کی اسی اہمیت وضرورت کے پیش نظر حکیم احمد شجاع صاحب نے شاعر مشرق علامہ اقبال کے مفکرانہ خیال کو نقل کیا ہے،جس سے مدارس اسلامیہ کے مذہبی اہمیت کی وضاحت ہوتی ہے، ملاحظہ ہو:

''مدارس اسلامیہ کی اہمیت کے سلسلہ میں علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔اگر ہندوستان کے مسلمان ان مدرسوں کے اثر سے محروم رہ گئے تو اس طرح جس طرح اندلس میں مسلماں آٹھ سو برس کی حکومت کے باوجود آج غرناطہ اور قرطبہ کے کھنڈر اور الحمراء اور باب الاخوتین کے سوا اسلام کے پیروں اور اسلامی تہذیب کے آثار کا کوئی نقش باقی نہیں ملتا۔ہندوستان میں بھی آگرہ کے تاج محل اور دہلی کے لال قلعہ کے سوا مسلمانوں کے آٹھ سو سالہ حکومت اور ان کی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا۔''(۱۰)

اسی طرح مولانا ابوالکلام قاسمی مدارس اسلامیہ کے قیام کا پس منظر بیان کرتے ہوئے اس باب میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

''انگریزی دور حکومت میں بقائے دین علماء کے نزدیک ایک نہایت ہی اہم مسئلہ تھا۔اسی بقائے دین کے جذبہ سے قیام مدارس کا آغاز ہوتا ہے۔اسی مقصد کے تحت ۱۸۶۶ء میں دیوبند میں

دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا۔ اس مدرسہ سے چند علماء وفضلاء پیدا ہے۔ پھر اس کے فارغین ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئے۔ ان علماء نے یہ محسوس کیا کہ دین کی بقاء وتحفظ کا ذریعہ یہی دینی مدارس ہیں۔ اس لئے پورے ملک میں قیام مدارس کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ملک کے ہر صوبے میں مدرسے قائم ہوئے اور دینی تعلیم کا دور شروع ہو گیا۔" (۱۱)

مذکورہ بالا اقتباس میں مولانا ابوالکلام قاسمی نے مدارس اسلامیہ کی ضرورت واہمیت اور اس کے قیام کے تاریخی پس منظر کو نہایت اختصار کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ اسی پس منظر میں ملک کے دیگر خطوں میں رفتہ رفتہ مدارس اسلامیہ کا قیام عمل میں آنے لگا، مثلاً دارالعلوم دیوبند کے بعد مظاہر العلوم سہارنپور اور دارالعلوم ندوۃ العلماء اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ اس صورت حال سے صوبہ بہار بھی محروم نہیں رہا اور تاریخی شہر عظیم آباد (پٹنہ) میں ۱۹۱۲ء میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کا قیام عمل میں آیا۔ اس مدرسہ کا تاریخی وتفصیلی جائزہ الگ سے مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کے باب میں کیا جائے گا۔

فی الحال موضوع کے تسلسل کو باقی رکھتے ہوئے صرف اس قدر بیان کر دینا کافی ہے کہ جسٹس سید نورالہدیٰ نے اپنے والد سید شمس الہدیٰ کے نام سے اس مدرسہ کو قائم کیا اور مدرسہ کے اخراجات کے لئے بڑی جائدادیں وقف کیں۔ اس مدرسہ نے قلیل عرصہ میں ترقی کے کئی مراحل طے کر لئے، یہاں تک کہ ۱۹۲۰ء میں مدرسہ کو حکومت بہار نے اپنی تحویل میں لے لیا، جس کے نتیجہ میں بہار میں مدرسے کی تعلیم کے نئے نئے پہلو سامنے آنے لگے، چنانچہ ضرورت کے پیش نظر مدارس کی تعلیم کو منظم طریقے سے آگے بڑھانے کے لئے بہار مدرسہ اکزامینشن بورڈ قائم کیا گیا، جس کے نتیجہ میں صوبہ کے دور دراز علاقوں میں مدارس کا ایک جال بچھ گیا اور تمام مدارس کو بہار مدرسہ اکزامینشن بورڈ سے ملحق کیا گیا۔

دوسری طرف صوبہ میں ایسے مدارس بھی قائم کئے گئے جن کا اپنا نظام تعلیم تھا، جن کو عرف عام میں درس نظامیہ کہا جاتا ہے۔ اس طرح کے نظام کے تحت چلنے والے مدارس بہار مدرسہ اکزامینشن بورڈ پٹنہ سے الحاق نہیں کراتے۔ اس طرح صوبہ بہار میں دو قسم کے مدارس چلتے ہیں۔ اس سلسلے میں مولانا ابولکلام قاسمی شمسی تحریر کرتے ہیں:

"آج بھی صوبہ بہار میں دو طرح کے مدرسے پائے جاتے ہیں۔ آزاد مدارس وہ ہیں جہاں درس نظامی کے مطابق تعلیم دی جاتی ہے اور ان مدرسوں کا حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ملحقہ مدارس وہ ہیں جہاں بہار مدرسہ اکزامینشن بورڈ کے نصاب کے مطابق تعلیم ہوتی ہے اور جسے حکومت ایڈ کی شکل میں تنخواہ دیتی تھی اوراب تو حکومت پوری تنخواہ دینے لگی ہے۔‘‘(۱۲)

آزاد مدارس کے سلسلہ میں مولانا قاسمی نے تفصیل پیش کرتے ہوئے تقریباً دس مدارس کا تذکرہ کیا ہے جو درس نظامی کے تحت دینی فرائض انجام دے رہے ہیں اور یہ مدارس حکومت کی امداد سے بے نیاز ہیں، آزاد مدارس کی فہرست درج ذیل ہے۔

۱۔ مدرسہ امدادیہ لہریا سرائے دربھنگہ سنہ قیام ۱۳۰۰ھ

۲۔ جامعہ رحمانی خانقاہ مونگیر، جو بہار کا مشہور ادارہ ہے جہاں دورۂ حدیث تک تعلیم دی جاتی ہے۔اس مدرسہ کو مولانا محمد علی مونگیریؒ نے ۱۹۲۷ء میں قائم کیا۔

۳۔ مدرسہ حسینیہ رانچی، یہ ادارہ ۱۳۷۷ھ میں قائم ہوا۔(۱۳)

۴۔ مدرسہ قاسمیہ اسلامیہ گیا۔ یہ ادارہ ۱۲۹۵ھ میں قائم ہوا۔

۵۔ مدرسہ تجوید القرآن جامع مسجد مونگیر جس کا سنہ قیام ۱۳۴۹ھ ہے۔

۶۔ مدرسہ جامع العلوم مظفر پور جس کا سنہ قیام ۱۳۰۷ھ ہے۔

۷۔ مدرسہ بشارت العلوم کھرما پتھرا دربھنگہ۔ اس کا سنہ قیام ۱۳۴۵ھ ہے

۸۔ مدرسہ اشرف العلوم کنہواں سیتامڑھی

۹۔ مدرسہ عربیہ خزینۃ العلوم پوپری بازار سیتامڑھی

ہر چند کہ آزاد مدارس کے سلسلے میں مولانا قاسمی کی یہ فہرست نامکمل ہے، اس لئے کہ بہت سے آزاد مدارس ایسے بھی صوبہ بہار میں ہیں، جو تعلیمی لحاظ سے اعلیٰ معیار کے حامل ہیں اور وہ اس فہرست میں شامل نہیں ہیں، مثلاً مدرسہ اسلامیہ سبل پور پٹنہ، دارالعلوم بالاساتھ سیتامڑھی، جامعہ ابن تیمیہ چندن بارا، ڈھاکہ مشرقی چمپارن وغیرہ، اس کے باوجود مولانا قاسمی کی یہ تحقیق قابل قدر ہے۔

جہاں تک صوبہ بہار میں ملحقہ مدارس کی بات ہے تو آج کی تاریخ میں ملحقہ مدارس کی تعداد تقریباً ۱۴۰۰ سے تجاوز کر چکی ہے۔ ان مدارس کے اساتذہ کو حکومت بہار گرانی بھتہ کے ساتھ پوری تنخواہ دیتی ہے۔

ملحقہ مدارس کے نصاب تعلیم میں عربی، فارسی اور دینیات کے علاوہ علوم عصریہ بھی شامل ہی اور جدید نصاب کے تحت حکومت بہار نے ملحقہ مدارس کے درجات کو کالج اور یونیورسٹی کی ڈگریوں کے مساوی قرار دیا ہے۔ جس کی تفصیل درج ذیل ہیں۔

| | | | |
|---|---|---|---|
| تحتانیہ۔ | ۴سال | مساوی | پرائمری |
| وسطانیہ۔ | ۴سال | مساوی | مڈل کلاس |
| فوقانیہ۔ | ۲سال | مساوی | میٹرک |
| مولوی۔ | ۲سال | مساوی | آئی۔اے |
| عالم۔ | ۳سال | مساوی | بی۔اے |
| فاضل۔ | ۲سال | مساوی | ایم۔اے |

..............................................

کل سترہ سال

موجودہ دور میں مدارس ملحقہ کی تعداد تقریباً ۳۵۰۰ ہے، جس میں تقریباً تیس ہزار اساتذہ تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں اور ان مدارس میں تقریباً بیس لاکھ طلبا زیر تعلیم ہیں۔ ان مدارس پر حکومت بہار کروڑوں روپے خرچ کرتی ہے۔

باب دوم میں ذیلی مضامین کے تحت دوسرے مضمون کا عنوان مدارس اسلامیہ میں سائنس کی تعلیم ہے۔ اس مضمون میں مولانا ابوالکلام قاسمی نے مدارس اسلامیہ میں سائنسی علوم کی تدریسی پر مدلل انداز میں روشنی ڈالی ہے اور تاریخی حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ سائنسی علوم تو مسلمانوں کا سرمایہ گمشدہ ہے۔ اگر تاریخ اسلام کا تعلیمی حوالے سے جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ قرون اولیٰ سے لے کر گیارہویں صدی عیسویں تک اسلامی ممالک کے دینی اداروں اور حلقہ ہائے درس میں دینی وعصری علوم کا کوئی واضح فرق نہیں تھا، بالفاظ دیگر ہم کہہ سکتے ہیں کہ دینی وعصری علوم کا الگ سے کوئی شعبہ نہیں تھا، بلکہ علوم دینیہ کے ساتھ تمام قسم کے علوم شامل ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ عہد وسطیٰ میں جب آپ اسلامی ممالک کے مدارس اور تعلیمی اداروں کا جائزہ لیں گے تو پتہ چلے گا کہ اس عہد کے مدارس اور مذہبی

اداروں میں صرف قرآن وحدیث کی تعلیم ہی نہیں دی جاتی تھی، بلکہ ان میں فلسفہ، تاریخ، ریاضی، اقلیدس، طب اور دیگر علوم وفنون کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ چنانچہ اس عہد کے فارغین میں جہاں ایک طرف قرآن وحدیث، فقہ وغیرہ علوم وفنون میں ماہر اکابر علماء، محدث، مفسر اور فقیہ پیدا ہوئے، وہیں دوسری طرف بڑے بڑے فلسفی، مورخ، طبیب اور ماہر سائنس داں بھی پیدا ہوئے۔ مثلاً امام غزالی، امام رازی، جابر بن حیان، الکندی، فارابی، المسعودی، الطبری، ابن خطیب، ابن رشد وغیرہ، اس عہد کے مشہور فلسفی، مؤرخ اور سائنس داں تھے۔

گیارہویں صدی میں علوم کو دو خانوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ دینی علوم اور عصری علوم۔ دینی علوم کے مراکز مدارس کے نام سے موسوم ہوئے اور عصری علوم کے مراکز کو اسکول، کالج اور یونیورسٹی کا نام دیا گیا۔ اس تقسیم کے نتیجہ میں مسلمانوں کی ترقی کے راہیں مسدود ہوگئیں۔ چنانچہ عہد وسطیٰ میں مسلمانوں نے فلسفہ، طب، تاریخ اور سائنس کے مختلف میدانوں میں جو شاندار مظاہرہ کیا تھا اس سے رفتہ رفتہ محروم ہوتے چلے گئے۔

ہندوستان میں مغلیہ حکومت کے زوال کے بعد انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی اور مسلمان سیاسی سطح پر مغلوب اور تہذیبی سطح پر بالکل پسماندہ ہوگئے۔ غدر ۱۸۵۷ء میں ناکامی کے بعد علماء نے دین وایمان کے تحفظ کے لئے مدارس ومکاتب قائم کئے۔ اس طرح پورے ملک میں ہزاروں مدارس قائم ہوگئے۔ شروع میں مدارس کا نصاب تعلیم درس نظامی کے تحت رکھا گیا۔ پھر بعد کے دانشوروں نے وقت اور حالات کے مطابق نصاب تعلیم کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت محسوس کی تو دینی نصاب کے ساتھ عصری علوم کے نصاب کو شامل کرنے پر زور دیا۔ چنانچہ مدارس کے نصاب میں دینی علوم کے ساتھ عصری علوم کو بھی شامل کرلیا گیا۔

مدارس کے روایتی نصاب میں عصری علوم کی شمولیت سے نصاب تعلیم میں تنوع اور وسعت پیدا ہوئی، جس کا خاطر خواہ فائدہ بھی نظر آنے لگا۔ نصاب تعلیم کی ہم آہنگی کو بہار میں بھی آزمایا گیا اور مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کا جب قیام عمل میں آیا تو یہاں بھی اسی مشترک نصاب تعلیم کو اختیار کیا گیا، جس کو درس عالیہ کے نام سے جانا جاتا ہے اور ۱۹۲۲ء میں جب بہار مدرسہ اکزامینشن بورڈ

کا قیام عمل میں آیا تو وہاں بھی اسی نصاب تعلیم کو نافذ کیا گیا۔ بعد کے وقتوں میں جب بہار مدرسہ اکزامینیشن بورڈ کا نام بدل کر بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ رکھا گیا، تو اس کے نصاب تعلیم میں مزید عصری علوم کو شامل کیا گیا۔ بعد کے وقتوں میں اس عمل کا خاطر خواہ فائدہ حاصل ہوا۔

مولانا ابوالکلام قاسمی نے مدارس اسلامیہ میں عصری علوم کی تدریس کا تاریخی پس منظر پیش کرتے وقت اور حالات کی روشنی میں کچھ قیمتی مشورے بھی دیئے ہیں، جس کے تحت ان کا کہنا ہے کہ مدارس کے نصاب تعلیم کو عصری تقاضوں سے مزید ہم آہنگ کرنے کے لئے نصاب تعلیم میں سائنس کے مختلف شعبوں کو شامل کرنا چاہئے۔ مولانا قاسمی کی اس تجویز کا خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح وسطانیہ اور فوقانیہ کے نصاب تعلیم میں آرٹ کے ساتھ سائنس شامل ہے، اسی طرح مولوی، عالم اور فاضل تک کے نصاب تعلیم میں سائنس کو مضمون کے طور پر شامل کیا جائے۔ اور فوقانیہ کے بعد نصاب تعلیم کو اس طرح مرتب کیا جائے کہ طلبا اسے بوجھ محسوس نہ کریں اور دینی علوم کے ساتھ عصری علوم سے بھی کماحقہ واقف ہو جائیں اور کالج و یونیورسیٹیوں میں جس طرح آئی اے، آئی ایس سی، بی اے، بی ایس سی وغیرہ ہے، اسی طرح مولوی سائنس، مولوی آرٹس، عالم سائنس اور عالم آرٹس وغیرہ کی بالترتیب اسناد عطا کئے جائیں۔

مولانا قاسمی اپنے اس تجویز میں مزید فرماتے ہیں کہ سائنس کی تعلیم کے لئے بہار کے اعلیٰ معیاری مدارس کو نامزد کیا جائے اور ان مدارس کو سائنس کی تدریس کے لائق بنایا جائے۔ مثلاً سائنس کے ماہر اساتذہ کی بحالی ان مدارس میں کی جائے اور سائنسی تجربات کے لئے لیباٹری کا معقول انتظام کیا جائے اور سائنس کے تقاضوں کے مطابق مذکورہ مدارس کو چست و درست کیا جائے۔

مضمون کے آخر میں مولانا قاسمی نے اس توقع کا اظہار کیا ہے مجھے ہر چند کہ اس نظام سے کوئی زیادہ خوش فہمی نہیں ہے، لیکن اگر یہ نظام نافذ ہو جائے تو اس بات کی توقع ضرور ہے کہ چند طلباء قوم کے لئے مستقبل کا سرمایہ ہوں گے۔ ان ہی میں سے بعض ایسے بھی ہوں گے جو عالم دین کے ساتھ سائنس داں بھی ہوں گے، ماہر فلکیات بھی ہوں گے، ماہر طب بھی ہوں گے، اس طرح مدارس اسلامیہ کا معیار و وقار بھی مزید بلند ہوگا اور سائنس و ٹکنالوجی کا نظام صحیح لوگوں کے ہاتھوں میں ہوگا جو دنیا میں امن آشتی کا ذریعہ ہوگا اور ایک نیا معاشرہ اور ماحول پیدا ہوگا۔ اس باب کے تیسرے ذیلی

مضمون کا عنوان ''جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کے لئے مدارس کے اقدامات'' ہے۔ اس مضمون میں مولانا قاسمی نے گذشتہ مضمون کے عنوان کے تسلسل کو باقی رکھتے ہوئے مدارس اسلامیہ پر عصری علوم اور جدید دور کے تقاضوں کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔

چنانچہ دینی علوم کے ساتھ عصری علوم کی شمولیت کا خاطر خواہ فائدہ بہار کے ملحقہ مدارس میں نظر آنے لگا ہے۔ اب تمام معیاری مدارس میں کمپیوٹر کا الگ سے شعبہ قائم کیا گیا ہے، جس کے ذریعہ مدارس کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی بہترین کوشش ہے۔ آج کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا زمانہ ہے، ان علوم پر مہارت حاصل کرنے کے بعد سائنس کے دیگر مضامین کا حصول نسبتاً آسان ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اب مدارس ملحقہ کے مولوی کے نصاب میں سائنس مضامین کو شامل کر لیا گیا ہے۔ مدارس ملحقہ کے نصاب تعلیم کو مولانا قاسمی نے اس طرح پیش کیا ہے۔

''فوقانیہ:۔ ۱۔ دینیات۔ ۲۔ عربی ادب۔ ۳۔ اردو۔ ۴۔ ہندی۔ ۵۔ فارسی۔ ۶۔ انگریزی۔ ۷۔ حساب۔ ۸۔ مطالعہ سماج۔ ۹۔ معلومات عامہ۔ ۱۰۔ اختیاری مضمون۔

مولوی:۔ (۱) دینیات۔ (۲) عربی (۳) اردو (۴) فارسی (۵) ہندی (۶) انگریزی (۷) منطق وفلسفہ (۸) اختیاری مضمون (کوئی ایک مضمون۔ تاریخ، جغرافیہ، علم سیاسیات، علم سماجیات، علم معاشیات، علم نفسیات، منطق، تاریخ اسلام، سنسکرت، بنگلہ، میتھلی۔)

عالم: (۱) دینیات، ۲۰۰ (۲) عربی ادب، ۲۰۰ (۳) انگریزی (۴) ہندی (۵) اردو کمپوزیشن (۶) پٹنہ یونیورسٹی اسٹینڈرڈ گروپ (اے) سے کوئی ایک مضمون (۷) گروپ بی سے کوئی ایک مضمون۔ (۱۴)

مذکورہ بالا خاکہ سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ بہار کے مدارس جدید دور کے تقاضوں سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنے کے لئے ہر دور میں کوشاں رہے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب مدارس سے صرف علماء وفضلاء ہی پیدا نہیں ہو رہے ہیں بلکہ ماہر کمپیوٹر، پروفیسر اور انتظامیہ کے افسران بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ عصری علوم میں مدارس اسلامیہ بہت حد تک کامیاب رہے ہیں اور انشاء اللہ یہ سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔

اس باب کے چوتھے مضمون کا عنوان ''بہار کے مدارس ومکاتب کی جدید کاری'' ہے۔ یہ مضمون بھی فکری اعتبار سے گذشتہ مضامین کا تسلسل ہے۔مولانا ابوالکلام قاسمی کا یہ مضمون خاصا معلوماتی ہے۔اس میں فاضل مصنف نے بہار کے مدارس ومکاتب کی جدید کاری کے حوالے سے نہایت ہی اہم اطلاعات فراہم کراتے ہوئے اس موضوع کا معروضی انداز میں جائزہ لیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب ہم مدارس ومکاتب کے جدید کاری کی بات کرتے ہیں تو اس کے دو واضح پہلو نظر آتے ہیں۔ایک یہ کہ مدارس کے ذمہ دار حضرات خود سے اپنے ادارے کی جدید کاری کریں یا حکومت وقت کی طرف سے جدید کاری کے انتظامات کئے جائیں۔پھر یہ کہ بہار میں دو زمرے کے مدارس ومکاتب چل رہے ہیں۔ایک وہ مدارس جو آزاد مدارس کہلاتے ہیں، جہاں درس نظامی کے نصاب کے مطابق تعلیم دی جاتی ہے۔ایسے ادارے حکومتی امداد سے بے نیاز ہوکر صرف عوامی چندہ پر توکل علی اللہ چلتے ہیں، جو اپنے محدود وسائل سے ہی اپنے ادارے کی جدید کاری کر سکتے ہیں۔

دوسرے زمرہ میں ملحقہ مدارس آتے ہیں جو پورے بہار میں کثیر تعداد میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ مدارس کلی طور پر سرکاری امداد پر منحصر ہیں، ان اداروں کا نصاب تعلیم بھی جداگانہ ہے۔ان کے نصاب تعلیم میں مذہبی علوم کے ساتھ عصری علوم کے مضامین بھی شامل ہیں، گویا کہ یہ ایک مخلوط نصاب تعلیم کا حصہ ہے۔ان اداروں میں حکومت بہار اپنے ذرائع سے جدید کاری کر سکتی ہے۔ حکومت وقت کی طرف سے جدید کاری کے بھی دو پہلو ہیں، ایک یہ کہ حکومت اپنی طرف سے کوئی نیا نظام تعلیم مسلط کردے، جیسا کہ گذشتہ برسوں میں کوشش ہو چکی ہے، جس کے خطرناک نتائج کے پیش نظر اہل علم اور دانشوروں کی طرف سے سخت مخالفت بھی ہو چکی ہے، جس کے نتیجہ میں حکومت نے قدم پیچھے ہٹا لیا۔حکومت کی طرف سے مدارس کی جدید کاری کی دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ مذہبی نصاب اور مدارس کے داخلی نظام کو برقرار رکھتے ہوئے جدید کاری کا کوئی بھی عمل مفید اور کارآمد ہو سکتا ہے۔اس سلسلے میں مولانا ابوالکلام قاسمی نے چند مفید مشورے دیئے ہیں مثلاً یہ کہ مدارس میں حکومت کی جانب سے کمپیوٹر کا شعبہ کھولا جائے ،جس کے تحت بچے دینی تعلیم کے ساتھ کمپیوٹر میں بھی مہارت حاصل کر سکیں، سائنس کی تعلیم کے لئے سائنس کے ماہر اساتذہ بحال کئے

جائیں اور اس سے متعلق لیباریٹری اور انفراسٹریکچر کا انتظام کیا جائے تاکہ مدارس کے طلبا دینی تعلیم کے متوازی عصری علوم خصوصاً سائنس کے مختلف شعبوں میں مہارت کر سکیں اور تعلیم سے فراغت کے بعد ایک مستند عالم دین کے ساتھ عصری علوم میں بھی ملک وقوم کی نمائندگی کرتے ہوئے ایک مہذب اور باشعور شہری بن سکیں۔

اس طرح مولانا ابوالکلام قاسمی نے اس مضمون کے ذریعہ مدارس اور حکومت بہار دونوں کی رہنمائی کی ہے۔

کتاب کے تیسرے باب کا موضوع مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ ہے، جس کے ذیلی عنوانات کے تحت کا چودہ مضامین ہیں، جس کا ہر مضمون مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ سے متعلق ہے، یہ چودہ مضامین مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ: تاریخ کے آئینے میں

(۲) تحریک آزادی میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کا حصہ

(۳) مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کے احاطہ میں وقف نامہ کی روشنی میں ہاسٹل کی تعمیر کے لئے راہ ہموار۔

(۴) بہار کی تعلیمی تحریک میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کا اہم رول

(۵) مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ میں تقریب پرچم کشائی

(۶) مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ سے مولانا مظہر الحق عربی وفارسی یونیورسیٹی تک

(۷) مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کی خدمات ماضی اور حال کے آئینے میں

(۸) ایک مثالی پرنسپل: مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی۔ سابق طالب علم کا تاثر

(۹) کلمات خیر مقدم وسپاس نامہ

(۱۰) کلمات خیر مقدم

(۱۱) مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کے ابنائے قدیم کے نام

(۱۲) سکریٹری رپورٹ

(۱۳) کلمات خیر مقدم وسپاس نامہ

(۱۴) مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کی تعمیر وترقی میں حصہ لینے والے حضرات کے نام

مضامین کے اس فہرست سے صاف پتہ چلتا ہے کہ مصنف نے اس باب میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کی تفصیلی تاریخ بیان کی ہے۔ یہ باب بعض جہت سے کتاب کا مغز ہے، اس لئے کہ اس باب کے چھٹے ذیلی مضمون مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ سے مولانا مظہر الحق عربی وفارسی یونیورسٹی تک'' ہے جو کتاب کا عنوان بھی ہے، جس میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کے تاریخ کا مکمل احاطہ کیا گیا ہے۔ مدرسہ کی سوسالہ تاریخ میں مدرسہ کی ترقی، عمارات کی تعمیر، تعلیمی ماحول وغیرہ کی ساری تفصیل موجود ہے۔ اس لحاظ سے یہ باب نہ صرف یہ کہ نہایت وقیع ہے، بلکہ مدرسہ کی تاریخ کے تعلق سے ایک دستاویز ہے جو مستقبل کے مؤرخ کے لئے اگر مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ کی تاریخ لکھے گا تو اس کے لئے کتاب کا یہ باب مستند حوالے کا کام کرے گا۔ کتاب کے چوتھے باب کا عنوان ''مدرسہ اکزامینیشن بورڈ/ بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ'' ہے، جس کے تحت سات ذیلی مضامین ہیں۔ پہلا مضمون مدرسہ اکزامینیشن کمیٹی کے عنوان سے ہے۔ ۱۹۲۲ء میں جب بہار مدرسہ اکزامینیشن بورڈ کا قیام عمل میں آیا تو سب سے پہلے مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے طلبا کے امتحانات کا مسئلہ درپیش ہوا۔ اب تک مدرسہ کا امتحان اس کے داخلی نظام کے تحت ہوا کرتا تھا، لیکن بورڈ کے قیام کے بعد باضابطہ شعبۂ امتحانات کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس ضرورت کی تکمیل کے لئے ایک عارضی سہ نفری امتحان کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی، جس کے ارکان میں ایک ڈائریکٹر محکمہ تعلیم بہار، ایک پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ اور ایک مدرسہ کے مجلس منتظمہ کے جوائنٹ سکریٹری تھے۔ اس کمیٹی نے بارہ ممتحن مقرر کئے، جن میں چھ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کے اساتذہ تھے اور بقیہ مدرسہ عالیہ کولکاتہ کے اساتذہ تھے۔ بورڈ کی یہ پہلی اکزامینیشن کمیٹی تھی جس کی زیر نگرانی بورڈ کا پہلا امتحان لیا گیا۔ اس مضمون کے بقیہ میں بہار مدرسہ اکزمینشن بورڈ کی تشکیل اور اس کی ارتقاء کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

چوتھے باب کے بقیہ ذیلی مضامین درج ذیل ہیں۔

۱ مدرسہ اکزامینشن بورڈ/ بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کی تشکیل

۲ بہار مدرسہ بورڈ کے اسناد پر لگائے گئے سوالیہ نشانات
۳ مدارس ملحقہ میں تعلیمی بحران
۴ مدارس ملحقہ میں تعلیمی اصلاح
۵ سکریٹری رپورٹ
۶ مدارس کی منظوری حکومت کا تاریخی کارنامہ

مذکورہ ذیلی عنوانات کے تحت بہار مدرسہ اکزامینشن بورڈ کی ارتقائی تاریخ کا بالاستعیاب جائزہ لیا گیا ہے، جس میں گرچہ بعض اطلاعات کا تکرار ہو گیا ہے، لیکن موضوع کے تقاضے کے مطابق یہ تکرار معیوب نظر نہیں آتا ہے۔ دوسرے عنوان میں بہار مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے قیام اور تشکیل کی پوری تفصیل بیان کی گئی ہے، جس میں ایک طرف بورڈ کے اندرونی نظام کی تفصیل ہے تو دوسری طرف شعبۂ امتحانات اور بورڈ کے تحتانیہ درجہ سے فاضل تک کی اسناد کی تفصیل بھی درج ہے۔ علاوہ ازیں مختلف درجات مثلاً وسطانیہ، فوقانیہ، مولوی، عالم اور فاضل وغیرہ کے نصاب تعلیم اور اس کے نصاب کی اہمیت پر بھی بات کی گئی ہے۔

تیسرے مضمون کا عنوان ''بہار مدرسہ بورڈ کے اسناد پر لگائے گئے سوالیہ نشانات'' ہے۔ اس عنوان کے تحت اس بات کا جائزہ لیا گیا ہے کہ مدرسہ بورڈ کی کون سی سند کس ملازمت کے لائق ہے، پھر ترتیب وار فوقانیہ سے فاضل تک تمام اسناد کی اہمیت کو درجہ وار تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، پھر وقتاً فوقتاً بعض حلقوں سے مدرسہ بورڈ کی اسناد پر جو اعتراضات کئے گئے، اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ ساتھ ہی ان اعتراضات کے مدلل جوابات اور اس کے حل کے ساتھ مناسب مشورے بھی دیئے گئے ہیں۔

اس باب کے چوتھے مضمون کا عنوان ''مدارس ملحقہ میں تعلیمی بحران'' ہے، جس کے تحت اس بات کی تفصیل بھی بیان کی گئی ہے، جس کے تحت بہار مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے قیام اور تشکیل کے بعد جب کثرت سے مدارس کا الحاق بورڈ سے ہونے لگا تو سرکاری ایڈ کے لالچ میں مدارس کے ذمہ دار منمانے طریقے سے اپنے ادارے میں غیر معیاری اساتذہ کی بحالی کرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مدارس میں تعلیم کا معیار انتہائی پست ہو گیا اور مدارس کے ذمہ داروں کا کام صرف طلباء کے امتحان کا فارم بھر

وانااور بورڈ سے مالی امداد حاصل کرنا رہ گیا۔

پانچویں مضمون میں اسی تسلسل کو باقی رکھتے ہوئے ''مدارس ملحقہ میں تعلیمی اصلاح'' کے عنوان کے تحت مدارس ملحقہ میں تعلیمی بحران کے بعد تعلیمی اصلاح کا ایک معروضی جائزہ پیش کیا گیا ہے، جس کے تحت مدارس ملحقہ میں وقتاً فوقتاً جو تعلیمی اصلاح کی تحریک چلی، اس کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں فاضل مصنف نے چند مفید مشورے بھی دیئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ جو افراد ملحقہ مدارس کے نظام سے جڑے ہوئے ہیں، ان کی انفرادی ذمہ داری ہے کہ مدارس کی تعلیم و تدریس کے نظام میں قابل اصلاح تبدیلی لائیں اور اسے ایک تحریک کے طور پر آگے بڑھائیں، جیسے مدارس کے مجلس منتظمہ کے اراکین، مدارس کے اساتذہ، خود مدارس کے طلبا، بہار مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے ذمہ داران اور اراکین اپنے طور پر اصلاحی کوشش کریں، تب ہی مدارس کے اندر تعلیمی اصلاح کا عمل کارگر ہوسکتا ہے۔

چھٹا مضمون ایک سکریٹری رپورٹ ہے، جسے مدرسہ کنونشن بمقام شری کرشن میموریل ہال ۱۹۸۴ء میں پیش کیا گیا تھا۔ اس کنونشن میں مولانا علی میاں ندوی اور اخلاق الرحمٰن قدوائی گورنر بہار بھی موجود تھے۔ بحیثیت سکریٹری اس رپورٹ کو مولانا ابوالکلام قاسمی نے خود پیش کیا تھا، جس میں معزز مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے ملحقہ مدارس کے احوال بیان کئے گئے تھے۔

اس باب کے آخری مضمون کا عنوان ''مدارس کی منظوری حکومت کا تاریخی کارنامہ'' ہے۔ اس مضمون کے تحت حکومت نے ملحقہ مدارس کو جو منظوری دی تھی، اور مدارس کے اساتذہ کو پوری تنخواہ دینے کا وعدہ کیا تھا، اسی کی تفصیل درج ہے۔ علاوہ ازیں حکومت کو اس کارنامہ کے لئے مبارک باد بھی دی گئی ہے۔

کتاب کے پانچویں باب کا عنوان ''گورنمنٹ طبی اسکول'' ہے، جس کے تحت طبی کالج پٹنہ کے قیام کا پس منظر اور اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے کالج کے موجودہ صورت حال کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

چھٹے باب میں ادارہ تحقیقات عربی وفارسی پٹنہ کا مختصر تعارف پیش کرتے ہوئے اس ادارہ کے

نظام کار کو بھی مختصر بیان کیا گیا ہے۔

کتاب کا ساتواں باب مولانا مظہرالحق عربی وفارسی یونیورسیٹی پٹنہ سے متعلق ہے۔اس باب میں مولانا مظہرالحق یونیورسیٹی کے قیام کا پس منظر اور اغراض ومقاصد کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، جس میں خاص طور سے یونیورسیٹی کے استحکام پر خصوصی زور دیا گیا ہے۔اس سلسلے میں فاضل مصنف نے چند مفید اور کارآمد مشورے بھی دیئے ہیں، جن پر اگر اخلاص سے عمل کیا گیا تو وہ دن دور نہیں جب یونیورسیٹی ترقی کی راہ پر گامزن ہوجائے گی۔

کتاب کے آٹھویں اور آخری باب میں ''متفرقات'' کے عنوان کے تحت پانچ ذیلی مضامین پیش کئے گئے ہیں، جس میں ملت اسلامیہ بہار اور مدارس اسلامیہ سے متعلق مختلف مسائل کا جائزہ لیتے ہوئے حکومت وقت سے ان ملی مسائل کو مجموعی طور پر حل کرنے کی گذارش کی گئی ہے۔

مجموعی طور پر مولانا ابوالکلام قاسمی کی یہ کتاب ملی اداروں کے تناظر میں مفید اور دستاویزی تصنیف ہے، جس کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔

### تین ہفتے امریکہ میں :۔

مولانا ابوالکلام قاسمی کی ایک اہم تصنیف ''تین ہفتے امریکہ میں'' ہے۔فکری وفنی اعتبار سے یہ ایک سفرنامہ ہے۔گرچہ یہ ایک مختصر کتاب ہے، لیکن عصری اہمیت اور عالمی سیاست کے تناظر میں اس کی قدر وقیمت اور بڑھ جاتی ہے۔

۱۰۴ صفحات کی ضخامت پر مشتمل یہ کتاب ۲۰۰۴ء میں اشاعت پذیر ہوکر منظر عام پر آئی۔ اپریل-مئی ۲۰۰۳ء میں مولانا ابوالکلام قاسمی نے امریکی حکومت کی دعوت پر امریکہ کا سفر کیا تھا۔ موصوف کا یہ غیر ملکی دورہ تین ہفتہ پر مشتمل تھا۔یہ سفرنامہ اسی سفر کے احوال وکوائف پر مشتمل ہے۔ اس سفر کے پس منظر کے بارے میں مصنف کے استاد مولانا صغیر احمد رحمانی سابق استاد جامعہ رحمانی مونگیر اپنے ایک تاثراتی مضمون میں رقم طراز ہیں:

> ''تین ہفتے امریکہ میں: دراصل قاسمی صاحب کا ایک سفرنامہ ہے، جس میں امریکہ کی زندگی کی جھلک ہے۔ایک غیر جانبدار سیاح کی حیثیت سے جن خوبیوں کو دیکھا اس کی تحسین کی ہے اور

خامیوں پر بھی گہری نظر ہے، اس کی شناعت وقباحت کو ذکر کرنے سے اعراض نہیں کیا ہے۔
انداز بیان اتنا دلچسپ ہے کہ پوری کتاب ختم کئے بغیر قاری کو اطمینان نہیں ہوتا۔ یہ بھی ذہن
میں رہے کہ مولانا قاسمی نے امریکہ کا سفر اس زمانے میں کیا ہے جبکہ اس کے جبر وتشدد اور ظلم
وبربریت سے افغانستان تباہ ہو چکا تھا اور عراق کے وجود کو ختم کرنے کی ہر طرح کی حکمت عملی
اختیار کر رہا تھا اور جونیئر بش پر ہر غیر جانبدار، انصاف پسند اور عدل پرور لعن وطعن کر رہا تھا اور
صدام حسین اس کی آہنی زنجیروں میں بندھا ہوا تھا قید خانہ میں بند تھا۔ پھر مقدمہ کی سماعت
اور فیصلہ پھانسی کی ڈھونگ کے بعد وہ پھانسی کے تختے پر چڑھ چکا تھا۔ اس وقت غیر تو غیر اپنوں
کو بھی یہ سفر ناگوار طبع تھا، مگر ان تمام امور کو ذہن میں رکھتے ہوئے مولانا قاسمی نے امریکہ
کا سفر کیا اور سفر نامہ کی اشاعت نے لوگوں کے ذہنوں سے خلش اور دل کے کسک کو دور کر دیا
اور امریکہ کا آئینہ قارئین وناظرین کے سامنے پیش کیا۔ (۱۵)

مولانا صغیر احمد رحمانی کے مذکورہ بالا اقتباس سے اس سفر نامے کا پس منظر اور پیش منظر شرح وبسط کے ساتھ سامنے آ گیا۔ اس نقطہ نظر سے اس سفر نامے کے عصری معنویت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اس سفر نامہ میں مولانا قاسمی نے سفر کے دوران جو حالات وواقعات پیش آئے ان کو بے کم وکاست ترتیب وار پیش کر دیا ہے۔ اس کتاب میں کل چھ ابواب ہیں، جن میں حسب ضرورت مختلف عنوانات دیئے گئے ہیں، جو درج ذیل ہیں۔

(۱) روانگی (۲) تفریح (۳) پروگرام ومیٹنگ (۴) خوبیاں وکمزوریاں (۵) مضامین (۶) فہرست

(۱) روانگی:۔ اس عنوان کے تحت اپنے وطن پٹنہ سے روانگی سے وہاں پہنچنے تک کے حالات تمام جزئیات کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ مثلاً پٹنہ ہوائی سفر کے ذریعہ کولکاتہ، وہاں کے قیام، پھر کولکاتہ سے دہلی کے لئے روانگی، پھر دہلی سے بین الاقوامی طیارہ سے اسٹرڈم، پھر وہاں سے بذریعہ طیارہ واشنگٹن تک کے سفر کے حالات تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں، جس میں سفر کی تفصیل کے ساتھ ہوائی سفر کے تجربات ومشاہدات بھی شامل ہیں۔

(۲) تفریح:۔ اس عنوان کے تحت امریکہ اندورن ملک مختلف شہروں میں سیاحت کے حالات وکیفیات بیان کئے گئے ہیں، جس میں مصنف نے ایک سیاح کی حیثیت سے امریکہ میں جو کچھ دیکھا اور اپنی آنکھوں سے جو مشاہدہ کیا، ان تمام تفصیلات کو اس باب میں مع جزئیات بیان کیا ہے۔سفرنامے کا اصل مغز یہی ہے۔

(۳) پروگرام ومیٹنگ:اس عنوان کے تحت سفر امریکہ کے دوران ایک مہمان دانشور کی حیثیت سے خصوصاً ہندوستانی مسلمان کے نمائندہ کی حیثیت سے مختلف مقامات پر جو پروگرام ومیٹنگ کا انعقاد ہوا اور اس میں مولانا نے شرکت کر کے اپنے جو تاثرات پیش کئے اور میزبان کی طرف سے جو تاثرات آئے، ان تمام باتوں کی تفصیل اس باب میں موجود ہے، جس سے حکومت امریکہ کے داخلہ اور خاجہ پالیسی کی غمازی ہوتی ہے۔

(۴)خوبیاں وکمزوریاں:اس باب کے تحت امریکہ کے اندورنی ماحول خصوصاً تہذیبی وثقافتی ماحول کا تذکرہ مصنف نے اپنے مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں تفصیل کے ساتھ کیا ہے، جس میں نہایت دیانت داری کے ساتھ مثبت ومنفی دونوں پہلوؤں کو ضبط تحریر میں لایا ہے۔مثلاً مثبت پہلو میں وہاں کے لوگوں کی وقت کی پابندی، جفاکشی، سائنسی ذہانت وغیرہ کو وہاں کی مادی ترقی کا باعث قرار دیا ہے۔وہیں منفی پہلو میں اخلاقی پستی، تہذیب کا کھوکھلا پن، عریانیت اور عورتوں کی بےحرمتی وغیرہ کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔

(۵) مضامین:اس باب کے تحت دو ذیلی مضامین میں جس میں ایک ''ملک امریکہ اور امریکہ کے مذہبی ادارے'' کے عنوان سے ہے۔اس مضمون میں پہلے امریکہ کے جغرافیائی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے اس کے حدود اربعہ کو بیان کیا گیا ہے۔پھر وہاں کی مختصر تاریخ بیان کرتے ہوئے وہاں کے سیاسی وجمہوری نظام پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ایک جمہوری وسیکولر ملک ہونے کی وجہ سے وہاں خیالات کے اظہار اور مذہب کی مکمل آزادی ہے، یہاں تک کہ وہاں تقریباً تمام مذاہب کے پیرو کار آباد ہیں اور انہیں مذہبی ادارے قائم کرنے کی مکمل آزادی ہے۔تاہم یہ تمام سرگرمیاں وہاں کے ملکی قانون کے دائرے میں انجام پاتے ہیں۔

امریکہ میں تمام بڑے مذاہب مثلاً یہودیت، عیسائیت، اسلام، ہندوازم اور سکھ پنتھ کے اپنے اپنے مذہبی ادارے ہیں۔ یہاں تک کہ تعلیمی ادارے بھی ہیں، جو اپنے طور پر تعلیمی اسناد بھی دیتے ہیں اور اسے وہاں کی حکومت قبول بھی کرتی ہے۔ تاہم مصنف کو اس بات کی شکایت بھی ہے کہ مسلمانوں کے معیاری اداروں کی وہاں سخت کمی ہے۔ بس معدودے چند ادارے ہیں جن کو انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔

اس باب کے دوسرے مضمون جس کا عنوان ''امریکہ کے چار شہروں کا دورہ'' ہے۔ جس کے تحت امریکہ کے چار بڑے مرکزی شہروں کے سفر کا بیان ہے۔ یہ شہر واشنگٹن، کلیولینڈ، سالٹ لیک سیٹی اور نیو یارک ہیں۔ اس سفر کے دوران ان چاروں شہروں کے سائنسی ترقیوں کا بیان ہے۔ اس دورہ میں مصنف کو امریکہ کے ان چار مرکزی شہروں کے مجموعی حالات کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ چنانچہ اس مضمون میں مصنف نے وہاں کے تعلیمی، تہذیبی، مذہبی اور سیاسی حالات کو قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے۔

اس کتاب کے چھٹے اور آخری باب میں ''فہرست'' کے عنوان سے ایک فہرست ہے، جس میں تین ذیلی عنوانات کے تحت امریکہ میں واقع اسلامی مراکز کی فہرست پیش کی گئی ہے۔

پہلی فہرست امریکہ میں موجود اسلامی اسکولوں کی ہے، جس میں ہر اسکول کے نام کے ساتھ اس کا تفصیلی پتہ درج ہے، لیکن یہ فہرست انگریزی میں ہونے کی وجہ سے قدرے گنجلک بھی ہے۔ دوسری خامی اس فہرست کی یہ ہے کہ نمبر شمار درج نہیں ہے، جس کی وجہ سے یہ پتہ کرنا مشکل ہے کہ ان اسکولوں کی حتمی تعداد کتنی ہے۔

دوسری فہرست امریکہ میں واقع اسلامی مراکز کی ہے۔ بعض خامیوں کے باوجود مصنف کا یہ کارنامہ قابل قدر ہے، جس سے اس قدر مجموعی تاثر تو ضرور ابھرتا ہے کہ امریکہ میں اسلام اپنی روایتی سرگرمیوں کے ساتھ زندہ اور تابندہ ہے۔

تیسری فہرست امریکہ میں واقع اسلامی تنظیموں سے متعلق ہے۔ جن کے ذریعہ امریکہ میں اسلام اور مسلمانوں سے متعلق فلاح و بہبود کی سرگرمیاں جاری ہونے کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

اس کتاب کے سلسلہ میں مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی نائب ناظم امارت شرعیہ کا تاثر بھی برمحل ہے، جس سے اس کتاب کی عصری معنویت کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ مفتی صاحب اپنے ایک تاثراتی مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''مولانا کی ایک کتاب ''تین ہفتے امریکہ میں'' خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ یہ اصلاً سفرنامہ ہے جس میں مولانا نے اپنے مشاہدہ کی روشنی میں امریکہ کے دروبست کا جائزہ لیا ہے۔ جزئیات پر روشنی ڈالی ہے، امریکہ کی خوبیوں اور خامیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ قابل تعریف چیزوں کی تعریف کی ہے اور غلط چیزوں پر نگاہ بیں ڈالی ہے۔ یہ سفرنامہ مولانا کے مشاہدہ کی گہرائی اور گیرائی کا غماز ہے۔ اور ''کونوا قوامین بالقسط'' کی عملی تفسیر۔ (١٦)

حوالہ جات:


(١) تاریخ ادب اردو (جلد دوم) پروفیسر وہاب اشرفی۔ ص۔ ١١٤٠۔ ١١٤١

(٢) مولانا ابوالکلام قاسمی اور تذکرہ علمائے بہار (ایک تاثراتی مضمون) ثناء اللہ ثنا دوگھروی۔

(٣) مولانا ابوالکلام قاسمی، ماضی و حال کے تناظر میں (ایک تاثراتی مضمون) مولانا صغیر احمد رحمانی۔ ص۔ ٨)

(٤) مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی، تذکرہ علمائے بہار کی روشنی میں ڈاکٹر کلیم عاجز

(٥) علم و فکر کے پیکر مولانا ابوالکلام قاسمی (ایک تاثراتی مضمون) مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی۔

(٦) دیدہ وران بہار (منظوم) جلد اول/ عبدالمنان طرزی۔ ص۔ ١٩٩

(٧) مدارس و مکاتب ملک و ملت کے لئے رحمت (مشمولہ مدرسہ اسلامیہ) ابوالکلام قاسمی۔ ص۔ ١٥۔ ١٦

(٨) مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ سے مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی تک/ ابوالکلام قاسمی۔ ص۔ ٢٠

(٩) معارف اعظم گڑھ ٨ ١٩٣ء مشمولہ مضامین سید سلیمان ندوی

(١٠) خون بہار مصنفہ حکیم احمد شجاع

(١١) مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ سے مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی ت/ ابوالکلام قاسمی۔ ص۔ ٢٦۔ ٢٧

(١٢) مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ سے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔/ ابوالکلام قاسمی۔ ص۔ ٢٧

(١٣) یہ مدرسہ آج کی تاریخ میں صوبہ جھارکھنڈ میں ہے لیکن اس کتاب کی تصنیف جھارکھنڈ کی تشکیل ہے۔ پہلے ہوئی تھی۔

(١٤) مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ سے مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسیٹی تک/ مولانا ابوالکلام قاسمی۔ ص۔ ٣٩۔

(١٥) مولانا ابوالکلام قاسمی۔ ماضی و حال کے تناظر میں (ایک تاثراتی مضمون) مولانا صغیر احمد رحمانی۔

(١٦) علم و فکر کے پیکر مولانا ابوالکلام قاسمی (ایک تاثراتی مضمون) مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی۔

# چند مضامین

اس کتاب میں سات مضامین کو شامل کیا گیا ہے۔مولانا کو اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں پر قدرت حاصل ہے۔ زبان صاف ستھری اور اسلامی ادب کا ایک شاہکار ہے۔قلم تکلف سے پاک ہے۔آپ پڑھیں گے،تو آپ کو یہ احساس ہوگا کہ قلم پر خود بخود مضامین آتے جارہے ہیں۔مولانا کا مخصوص طرز انشاء ہے،جس نے ہر مضمون کو جاذب نظر بنادیا ہے جو دل و دماغ دونوں کے لئے راحت بخش ہے۔ وہ پر جوش عبارت اور استعاروں کے استعمال سے پرہیز کرتے ہیں، بالکل سادہ عبارت لکھتے ہیں، جسے شاعری کی زبان میں سہل ممتنع کہیں گے۔ مضامین الگ الگ ہیں، مگر سب میں ایک ربط فکری ہے۔آپ پڑھتے جایئے ،رکنے اور ٹھہرنے کا نام نہیں لیں گے۔سارے مضامین میں اپنے اپنے عنوانات کے مطابق واقفیت کا خزانہ ہے۔''ایک ہفتہ ایران میں''ایک مضمون ہے،جس میں ایران کے حالات ،مکانات ، کھنڈرات اور اشخاص کا تذکرہ خوب کیا گیا ہے۔ پڑھنے کے بعد آپ محسوس کریں گے کہ ہم نے بھی ایران گھوم لیا۔دیگر مضامین کا بھی یہی حال ہے۔ان کے مضاین کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کا تحقیقی ذوق بالیدہ اور ہر مضمون میں فکر اور تحقیق کا پہلو نمایاں ہے۔

ہم لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ صوفیائے کرام کا تعلق صرف اردو زبان سے ہی رہا ہے اور انہوں نے صرف اردو زبان کے فروغ ہی میں حصہ لیا ہے۔اس سلسلے میں مولوی عبدالحق کی کتاب 'اردو کی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا حصہ'' بھی اہم ہے،لیکن شامل مضامین میں ایک مضمون' الشعر العربی لصوفیة ولایة بیہار' ہے،جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے صوفیائے کرام نے اردو کے ساتھ ساتھ عربی کے فروغ میں بھی حصہ لیا ہے۔مولانا کے مضامین بہت سے ہیں،طوالت سے بچنے کے لئے چند مضامین کو شامل کیا گیا ہے۔ان مضامین میں برجستگی، شستگی اور وافر معلومات ہیں۔زبان آسان اور سہل ہے، مطالعہ کے بعد ذہن پر ایک نقش ابھر کر سامنے آتا ہے،جس کو مضامین کے مطالعہ کے وقت آپ ضرور محسوس کریں گے۔

(صدر عالم ندوی)

(۱)

# موضع دوگھرا

## تاریخ وتحقیق کے آئینہ میں

صوبہ بہار کا ایک علاقہ میتھلا کے نام سے مشہور ہے جو شمالی بہار میں واقع ہے۔اس کا ایک مشہور ضلع دربھنگہ ہے، جو تین اضلاع میں منقسم ہو گیا ہے۔ دربھنگہ، مدھوبنی اور سمستی پور۔اسی دربھنگہ ضلع میں ایک بڑی بستی جالہ ہے، جس کو مرکزیت حاصل رہی ہے۔اس میں تھانہ بھی ہے اور بلاک بھی۔ پہلے جالہ میں بلاک نہیں تھا۔ جوگیارہ میں انچل آفس تھا۔ ۱۹۷۰ء میں جوگیارہ انچل آفس کو ختم کر دیا گیا، اس کے بدلے جالہ میں بلاک بنا دیا گیا۔اسی جالہ سے دکھن تقریباً ڈیڑھ کیلومیٹر کی دوری پر دوگھرا واقع ہے۔اس کے نصف کیلومیٹر اتر لتراہا، ایک کیلومیٹر دکھن راڑھی، ایک کیلومیٹر پورب چندر دیپا ونگر ڈیہہ اور ڈیڑھ کیلومیٹر پچھم کترول واقع ہے۔ان تمام گاؤں میں دوگھرا گاؤں کو مرکزیت حاصل رہی ہے اور آج بھی ہے۔اس کا ریلوے اسٹیشن جوگیارہ ہے۔ جوگیارہ سے جالہ ہوتے ہوئے ایک روڈ دکھن کی جانب راڑھی، پکٹولہ، رتن پور، بھروارہ اور سنگھوارہ ہوتے ہوئے اتر بیل کے پاس نیشنل ہائی وے سے مل جاتا ہے۔ یہ نیشنل ہائی وے پچھم میں مظفر پور سے ہو کر پورب کی جانب دربھنگہ سے پورنیہ تک جاتا ہے۔ پھر یہ روڈ مظفر پور سے لکھنؤ اور مظفر پور سے پٹنہ بھی جاتا ہے۔

بہار پر مسلمانوں کا سب سے پہلا حملہ ۵۷۶ھ/۱۱۸۰ء میں ہوا۔ منیر کے ایک شخص مومن

عارف یا عارف مومن کو وہاں کے راجا نے اذیت پہنچانی شروع کی۔ انہوں نے بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں فریاد کیا۔ چنانچہ حضرت مخدوم تاج فقیہ کو جوان دنوں مدینہ منورہ میں قیام پذیر تھے۔ عالم رویا میں دربار رسالت پناہ سے حکم ہوا کہ وہ منیر جاکر فوراً اس کا تدارک کریں۔ چنانچہ حضرت مخدوم حسب حکم روانہ ہوگئے۔ راہ میں لوگ سالار قافلہ (حضرت مخدوم قدس سرہ) کے ساتھ ہوتے گئے۔ داعیان حق کا یہ قافلہ سنہ مذکور میں منیر پر حملہ آور ہوا۔ راجا شکست کھا گیا اور اس طرح اس خطہ کو آزاد کر کے حضرت مخدوم قدس سرہ نے اپنے دو صاحبزادوں کے حوالہ کیا۔ حضرت مخدوم اسمٰعیل قدس سرہ کو شمالی بہار میں ولایت تفویض کی، تاکہ وہ یہاں تبلیغ واشاعت میں مشغول ہوجائیں، چنانچہ وہ تشریف لے آئے۔ ان کا خاندان حاجی پور کے علاقہ میں بہت پھولا پھلا اور ابھی حال تک اشاعت دین میں منہمک رہا۔ حضرت تاج فقیہ کے دوسرے صاحبزادے حضرت مخدوم اسرائیل قدس سرہ کو جنوبی بہار عطا کیا گیا اور تبلیغ واشاعت دین پر مقرر فرمایا۔ اپنے فرائض کی ادائیگی میں وہ بھی منہمک رہے۔ ان ہی کے صاحبزادے حضرت مخدوم یحیٰ منیری قدس سرہ اور ان کے فرزند ارجمند مخدوم الملک حضرت شرف الدین بہاری قدس سرہ العزیز ہوئے۔ جن کی تابانی علم وعرفان سے پورا علاقہ روشن رہا۔ اور آج بھی ان کی ضیا باریاں مردان حق آگاہ پر جاری ہیں۔ (تذکرہ بزم شمال صفحہ ۲۳/۲۲)

جنوبی بہار کی طرح شمالی بہار پر بھی مسلمانوں کے حملہ شروع ہوگئے۔ جو حملہ بھی ہوا وہ سارن کی جانب سے ہوا۔ ہر یورش میں پہلے سارن مغلوب ہوا، پھر ترہت اور پورنیہ کے وسیع وعریض علاقے زیر نگیں آتے رہے۔ محمد ابن بختیار خلجی نے ۵۹۹ھ/ ۱۲۰۲ء میں سارن کی راہ سے دربھنگہ پر حملہ کر کے ترہت کے راجپوت راجا نر سنگھ دیو کو زیر کیا۔ اور بقول الیاس رحمانی مرحوم اسی کو ضمیمہ سلطنت اسلامیہ بنا کر بنگال کے راجا لچھمن سین پر چڑھ دوڑا۔ شمالی بہار پر مسلمانوں کا دوسرا حملہ ۶۲۲ھ/ ۱۲۲۵ء میں ہوا۔ التمش نے اس پر حملہ کر کے اپنی حدود سلطنت میں شامل کرلیا۔ تیسرا حملہ علاء الدین خلجی کے عہد حکومت (۶۹۵ھ/ ۱۲۹۵ء تا ۷۱۶ھ/ ۱۳۱۶ء) میں ترہت پر ہوا۔ اور یہاں کا راجہ سکر سنگھ دیو منہزم ہوا۔ اور وہ دولت خلجیہ کا باج گزار بن گیا۔ چوتھا حملہ سلطان غیاث الدین تغلق نے کیا۔ اور یہاں کے راجہ ہر سنگھ دیو کو ۷۲۴ھ/ ۱۲۲۴ء میں مطیع وفرماں بردار بنا کر دہلی لوٹ گیا۔ اس کے

جانشیں سلطان محمد تغلق نے اسی راجہ ہر سنگھ دیو پر پھر ۷۲۶ھ/ ۱۳۲۶ء میں حملہ کیا۔ راجہ مقابلہ کی تاب نہ لاکر فرار ہو گیا۔ اس نے پہلے اپنے ہی تعمیر کردہ قلعہ ہر سنگھ پور میں پناہ لی لیکن وہاں بھی اس کی قسمت نے اسے سر چھپانے نہ دیا۔ سلطان اس قلعہ پر حملہ آور ہوا۔ راجہ بھاگ نکلا، قلعہ سلطان کے قبضہ میں آ گیا۔ سلطان نے وہاں کے قلعہ کی قلعداری حضرت شاہ صوفی قدس سرہ کو تفویض کی۔ چنانچہ یہ بزرگ بوریائے بوذر اوڑھ کر سریر سلیماں کے مالک ہوئے اور یہیں سے نظام دین ودنیا پر حکمرانی کرنے لگے۔ (تذکرہ بزم شمال صفحہ ۲۴)

جون پور کے فرماں روا سلطان ابراہیم شرقی نے ۸۰۵ھ/ ۱۴۰۲ء میں ترہت کے راجہ شیو سنگھ پر حملہ کیا اور اسے قید کر کے اپنے ساتھ لے گیا۔ ترہت کی حکومت اس کے باپ دیو سنگھ کو سپرد کر دی۔ ودیاپتی جیسا عظیم المرتبت شاعر اسی راجہ شیو سنگھ کے دربار سے منسلک تھا، جن پر میتھلی ادب جتنا بھی ناز کرے کم ہے۔ میتھلی زبان میں کرتی لتا اور کرتی کتا اور کرتی تپا اپنے عہد کی ممتاز منظوم تصانیف ہیں۔ کرتی لتا اور کرتی تپا ترہت کے کرتی سنگھ اور ابراہیم شاہ شرقی کی شجاعت کی ملی جلی داستانیں ہیں۔ (تذکرہ بزم شمال ص ۲۴)

مذکورہ بالا تاریخی حقائق سے یہ ثابت ہے کہ دربھنگہ پر مسلمانوں کا حملہ سلطان ابراہیم شاہ شرقی کے زمانہ تک جاری رہا، جس کا زمانہ ۱۴۰۲ء ہے۔ ساتھ ہی سلطان محمد بن تغلق نے ۱۳۲۶ء میں دربھنگہ پر حملہ کر کے وہاں کے راجہ کو شکست دے کر دربھنگہ پر قبضہ کر لیا۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ دربھنگہ کے راجہ کے زیر اقتدار جتنے بھی علاقے آتے رہے ہوں گے وہ سبھی مسلم بادشاہوں کے قبضہ کی وجہ سے متاثر ہوتے رہے ہوں گے۔ اس تاریخی حقائق سے موضع دوگھرا کی تاریخ کو سمجھنے میں کافی مدد ملے گی۔

اس گاؤں کا نام دوگھر تھا۔ نام کی ترکیب سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے یہاں صرف دوگھر آباد ہوئے اور انہیں دوگھروں کے آباد ہونے کے بعد اس گاؤں کی آبادی میں اضافہ ہوا۔ پہلے دوگھر کی بنیاد ہی پر اس کو دوگھر کے نام سے پکارا جانے لگا اور یہی اس گاؤں کا نام بھی ہو گیا۔ یہ دوگھر جن کی وجہ سے یہ گاؤں آباد ہوا اس سلسلہ میں کوئی پتہ نہیں چل سکا، لیکن بزرگوں نے بتایا کہ اس گاؤں میں پہلے راجپوتوں کی آبادی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ راجپوتوں ہی کے دوگھر یہاں آباد ہوئے اور پھر آبادی میں

اضافہ ہوا اور باضابطہ گاؤں کی شکل اختیار کرلیا۔

موضع دوگھرا کے پچھّم سے روڈ گزرتا ہے جو اتر میں مدھوبنی اور سیتا مڑھی سے اور دکھن میں دربھنگہ مظفر پور روڈ سے ملتا ہے۔ یہ روڈ آمدرفت کا ذریعہ بھی تھا ساتھ ہی سیلاب کے پانی کو روکنے کا ذریعہ بھی۔ بزرگوں نے بتایا کہ اس روڈ کے پچھّم جانب سے ایک ندی گزرتی تھی جو موضع کترول اور دوگھرا گاؤں سے ہوتے ہوئے پورب کی جانب جہانگیر ٹولہ کی طرف جاتی تھی اور کریا ندی میں مل جاتی تھی، اس میں کشتی چلا کرتی تھی۔ لوگوں نے یہ بھی بتایا کہ پہلے اس گاؤں میں راجپوت بستے تھے۔ وہ سیر وتفریح کے لئے کشتیوں پر سوار ہوکر کریا ندی کے ذریعہ جوگیارہ وغیرہ گاؤں میں جایا کرتے تھے۔ اسی روڈ کے دکھن دوگھرا گاؤں ختم ہونے پر ایک دوسرا روڈ موضع کترول سے چل کر پورب کی طرف جاتا ہے۔ جو دوگھرا گاؤں کو نگر ڈیہہ، چندر دیپا، قاضی بہرا وغیرہ گاؤں کو ملاتا ہے۔ دونوں روڈ کے ملنے کی جگہ پر اتر جانب ایک بڑا پیپل کا درخت تھا، وہیں پر گھاٹ تھا۔ باہر سے آنے والی کشتیاں اسی پیپل کے پیڑ کے پاس رکتی تھیں اور پیپل کے پیڑ کے ساتھ باندھی جاتی تھیں، اسی گھاٹ پر دوگھر تھا۔ اسی مناسبت سے اس گھاٹ کو دوگھر گھاٹ کہا جاتا تھا اور اسی نام سے یہ گھاٹ مشہور تھا۔ اس گھاٹ کے آس پاس یعنی موجودہ حالت میں مغل کے قبرستان سے لے کر نئے مدرسہ کے روڈ کے دکھن کے علاقہ میں ڈیہہ تھا، وہاں آبادی کے نشانات تھے۔ کھپروں کے ٹکرے، ملبے وغیرہ پائے جاتے تھے، جس سے پتہ چلتا تھا کہ یہاں پر پہلے کوئی آبادی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ یہاں سے آبادی پورب کی طرف بڑھ کر گاؤں میں مل جاتی ہو، لیکن میرے زمانہ تک یہ آبادی باقی نہیں تھی۔ آبادی وہاں سے ہٹ کر تھوری دوری پر تھی جس میں لوہار وغیرہ رہا کرتے تھے۔ اس گاؤں کی قدیم تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ پہلے یہاں غیر مسلموں کی آبادی زیادہ تھی اور مسلمانوں کی آبادی بہت کم اور یہ گاؤں دوگھر کے نام سے مشہور تھا۔

موضع دوگھرا کے قدیم باشندہ امیر اللہ صاحب کا شجرۂ نسب دستیاب ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا خاندان اس گاؤں میں راجپوتوں کے زمانہ ہی میں موضع پوند سے آکر آباد ہوا۔ پوند گاؤں نرو چھ کے قریب آج بھی موجود ہے۔ ان کے بعد دوسرے خاندان کے لوگ اس گاؤں میں آئے اور آباد ہوئے جس سے مسلمانوں کی آبادی اس گاؤں میں زیادہ ہوئی۔

راجہ مہاراجہ کوتعزیہ سے بڑی عقیدت رہتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے ہر گاؤں میں تکیہ، امام باڑہ اور کربلا کے لئے زمین خاص کیا۔ تعزیہ بنانے اور امام باڑہ وغیرہ کے انتظام کے لئے شاہ برادری کے لوگوں کو گاؤں میں آباد کیا۔ تکیہ پر خاص طور سے املی کے بڑے بڑے پیڑ ہوا کرتے تھے۔ وہیں امام باڑہ ہوتا اور تعزیہ بنانے کا کام وہیں پر انجام پاتا۔ ساتھ ہی انہوں نے اپنے خیال کے مطابق اس کو پہلام کرنے کے لئے کربلا کے لئے زمین بھی دی اور اس کے ساتھ تالاب بھی بنایا۔ دوگھرا کے جائے وقوع کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو یہ پاتے ہیں کہ دوگھرا کا تکیہ بہت ہی بڑے علاقہ میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ تالاب بھی ہے جو پرُانی کے نام سے مشہور ہے۔ تالاب کے ایک کنارے پر کربلا ہے، جس میں بڑے بڑے املی کے پیڑ ہیں۔ مستان وغیرہ اسی تکیہ پر رہتے اور تعزیہ وغیرہ بنانے کے کام کو انجام دیا کرتے تھے۔ تکیہ کے آس پاس شاہ برادری کی آبادی آج بھی موجود ہے اور تکیہ کربلا سمیت تمام زمین ان ہی لوگوں کے مصرف میں رہی، پہلے بھی رہی اور آج بھی ہے۔ گاؤں کی آبادی کو مکمل کرنے کے لئے قصاب، دھوبی اور نائی وغیرہ کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ راجہ مہاراجہ وغیرہ نے جہاں بھی گاؤں آباد کیا تو انہوں نے ہمیشہ اس بات کی کوشش کی کہ اس میں ہر پیشہ کے لوگ موجود ہوں تا کہ گاؤں کے لوگوں کا کام بخوبی چلتا رہے۔ اسی کے پیش نظر اس گاؤں میں شاہ برادری اور قریشی برادری کے لوگ بھی آئے۔ ان دونوں خاندان کے لوگ راجپوتوں کے زمانہ ہی میں اس گاؤں میں آئے اور آباد ہوئے۔

یہ گاؤں ہمیشہ سے قدرتی طور پر منقسم نظر آتا ہے۔ ایک روڈ پچھّم سے پورب کی طرف جاتا ہے۔ یہ گاؤں کو اتر اور دکھن دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ اتر میں مسلمانوں کی آبادی تھی اور آج بھی ہے۔ جب کہ دکھن میں غیر مسلموں کی آبادی تھی اور آج بھی ہے۔ کچھ غیر مسلم مسلمانوں کے محلہ میں رہتے تھے تو انہوں نے غیر مسلموں کے علاقہ میں زمین لے کر وہاں منتقل ہو گئے۔ اس طرح اب موجودہ حالت میں بھی اتر میں مسلمانوں کی آبادی ہے اور دکھن میں غیر مسلموں کی۔

دربھنگہ پر مسلمانوں کے بار بار حملہ کی وجہ سے مسلمانوں کا غلبہ بڑھا تو مختلف علاقوں سے صوفی اور بزرگان دین اس گاؤں میں آئے۔ بتایا جاتا ہے کہ نیپال کی طرف سے دو بزرگ مستان شاہ اور ملنگ شاہ

آئے جبکہ اتر سے حافظ سخاوت صاحب اس گاؤں میں وارد ہوئے۔ مستان شاہ اور ملنگ شاہ نے تکیہ کو اپنا مسکن بنایا، جبکہ حافظ سخاوت صاحب نے درمیانی مغربی حصہ کو قیام کے لئے منتخب کیا۔ مستان شاہ اور ملنگ شاہ دونوں تکیہ پر رہنے لگے۔ بزرگوں کے بیان کے مطابق دونوں کے درمیان بزرگانہ چشمک بھی ہوا کرتی تھی۔ ایک دن مستان شاہ نے ملنگ شاہ سے کہا: ایک میان میں دو تلوار نہیں رہ سکتی ہے۔ اس لئے بہتر ہے کہ تم تکیہ پر رہو اور میں دوسری جگہ چلا جاتا ہوں، چنانچہ انہوں نے بھٹوکھر تالاب کے دکھنی بھنڈ کو سکونت کے لئے پسند کیا جو اس زمانہ میں بالکل جنگل تھا، وہیں انہوں نے اپنا کٹیا بنایا اور بے خوف وخطر رہنے لگے۔ تکیہ پر ملنگ شاہ کی قبر موجود تھی، اس کو میں نے بھی دیکھا ہے۔ ساتھ ہی مستان شاہ کے کٹیا اور ان کی قبر کے نشانات آج بھی بھٹوکھر تالاب کے بھنڈ پر موجود ہیں۔

گاؤں کے بڑے بزرگوں نے بیان کیا کہ مستان شاہ نے بھٹوکھر تالاب کے بھنڈ پر اپنا کٹیا بنایا تو وہ روزانہ صبح گاؤں میں آتے۔ ایک دن وہ گاؤں سے لوٹ رہے تھے تو جھاڑی میں چھپے نوجوانوں نے ان پر حملہ کر دیا لیکن ان کی کرامت سے ان نوجوانوں کے ہاتھ اوپر اٹھے رہ گئے اور ان کے پاؤں جکڑ گئے۔ گاؤں میں ہنگامہ ہو گیا بالآخر ہندو مسلمان مستان شاہ کی خدمت میں پہنچے اور معافی مانگی۔ انہوں نے معاف کیا تو نوجوانوں کے ہاتھ پاؤں کام کرنے لگے۔ اس کے بعد سے لوگوں نے مستان شاہ کو کچھ کہنا بند کر دیا۔ بعد میں راجپوت لوگ اس گاؤں سے منتقل ہو کر قریب کے گاؤں میں چلے گئے۔ لوگوں نے بتایا کہ کچھ خاندان کے لوگ جو گیارہ بستی میں آج بھی موجود ہیں جو دوگھرا سے منتقل ہو کر وہاں گئے تھے۔ بھٹوکھر تالاب کے راستہ سے ہٹ کر جو پسماندہ برادری کے غیر مسلم تھے وہ اپنی جگہ رہے اور آج بھی موجود ہیں۔

راجپوتوں کے چلے جانے کے بعد اس گاؤں کی نشاۃ ثانیہ ہوئی اور بڑی تعداد میں مسلمان باہر سے آکر اس گاؤں میں آباد ہونے لگے۔ اس طرح جب ہم اس دوگھرا کی پرانی آبادی کا جائزہ لیتے ہیں تو اس گاؤں میں بسنے والے پرانے خاندان میں امیر اللہ خاندان، شاہ خاندان، قریشی خاندان اور حافظ سخاوت صاحب کے خاندان کا پتہ چلتا ہے۔

اس گاؤں کے بڑے رئیس حاجی عبدالعزیز وعبدالصمد گزرے۔ حاجی عبدالعزیز کے والد کا

نام نخھو میاں اور عبدالصمد کے والد کا نام بوتل میاں تھا۔ یہ خاندان پوند گاؤں سے آیا جو نروچھ کے قریب ہے۔

مذکورہ بالا خاندانوں کا جائزہ لینے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ تقریباً چار پشت سے یہ خاندان اس گاؤں میں آباد ہیں، جس کا تخمینہ تقریباً چار سو سال ہوتا ہے۔

جب مسلمانوں کا یہ خاندان آباد ہوا اور اس گاؤں کی نشاۃ ثانیہ ہوئی تو انہوں نے اس گاؤں کا نام قبول پور رکھا، لیکن قبول پور پر دوگھر غالب رہا۔ دوگھر میتھلی بھاشا کے زیر اثر تھا۔ زبان پر بھاری بھی تھا۔ قیاس سے پتہ چلتا ہے کہ جب مسلمانوں کی آبادی اس گاؤں میں ہوئی تو فارسی ترکیب کے مطابق اس دوگھر کو دوگھرہ میں بدل دیا۔ ''ہ'' کا استعمال متروک ہوکر اب 'الف' کا استعمال ہو رہا ہے۔ اس طرح اب یہ گاؤں موضع قبول پور عرف دوگھرا کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس گاؤں کا سرکاری نام یہی ہے اور یہی نام رجسٹری آفس اور ۱۸۶۰ء کے سروے وغیرہ میں درج ہے، لیکن یہ نام کب پڑا اور کس نے رکھا، اس سلسلہ میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا، لیکن قیاس سے پتہ چلتا ہے کہ حافظ سخاوت صاحب اس گاؤں میں تعلیمی اعتبار سے فائق تھے، جنہوں نے باہر سے آکر اس کو اپنا مسکن بنایا اور وہ عوام وخواص میں بہت مقبول تھے۔ اس لئے گمان غالب ہے کہ انہوں نے ہی لوگوں کے مشورہ سے اس کا نام قبول پور رکھا ہوگا، تاکہ اس سے مسلمانوں کی آبادی کی شناخت ہو سکے۔

موضع قبول پور عرف دوگھرا کا رقبہ پچھم سے پورب کی طرف پھیلا ہوا ہے۔ پچھم میں کترول سے لے کر پورب میں جہانگیر ٹولہ تک اس کا رقبہ ہے، جب کہ اتر میں کربلا کے نیچے تک اور دکھن میں شرن ساہو کے تالاب کے بعد تک اس کا رقبہ ہے۔

دوگھرا گاؤں میں بہت سے تالاب اور کنویں تھے۔ تالاب میں پرانی، بگہی، بھٹوکھر، شرن ساہو کا پوکھر، دوگھر گھاٹ کا پوکھر قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے بگہی کی کھدائی انگریزوں کے زمانہ میں ہوئی، بقیہ تالاب پہلے سے موجود تھے۔ جہاں تک کنویں کی بات ہے تو اس گاؤں میں بہت سے کنویں تھے۔ حافظ اسحٰق صاحب کے گھر کے پاس بھجنی مسمات کا کنواں، عبدالرحمٰن صاحب کے گھر کے پاس شریفیہ مسماۃ کا کنواں، حافظ عبدالقادر کے مکان کے آگے کنواں، شریف صاحب کے گھر

کے پاس کنواں، چوری فروش محلہ میں کنواں، قریشی محلہ میں کنواں، سندر پور محلہ میں کنواں، مشرقی مسجد کے بغل میں کنواں، مغربی مسجد کے بغل میں کنواں، اس کے علاوہ غیر مسلموں کے محلہ میں بھی کئی کنویں تھے۔ سنار محلہ میں بغیر منڈ کا کنواں جو بہت مشہور تھا۔ حبیب سردار کے گھر کے پاس اور ڈاکٹر صغیر صاحب کے گھر کے پاس کنواں میرے زمانہ میں کھودا گیا۔ اب موجودہ حالت میں تمام کنویں ختم ہو چکے ہیں۔ ان کے بدلے چاپا کل کا استعمال ہونے لگا ہے۔

اس گاؤں میں ۴؍قبرستان ہیں۔ سب سے بڑا قبرستان لتراہا کے علاقہ میں واقع ہے۔ اس لئے لتراہا قبرستان کے نام سے مشہور ہے۔ یہ گاؤں کی پچھّم روڈ کے پار ابھی بھی واقع ہے۔ اس قبرستان کی زمین کو حاجی عبدالعزیز، عبدالمجید بھگت جی اور عبدالصمد صاحب وغیرہ نے وقف کیا۔ دوسرا قبرستان مغل قبرستان کے نام سے مشہور ہے جو دوگھرگھاٹ اور پُرانا رن کے قریب واقع ہے، تیسرا قبرستان تکیہ پر ہے جو پرانی تالاب کے پچھّم بھنڈ پر واقع ہے اور چوتھا قبرستان تربنا قبرستان ہے، چونکہ اس میں تاڑ کے پیڑ بہت تھے، اس لیے اسی نام سے مشہور ہے۔ اس کو حبیب سردار مرحوم کے آباء واجداد نے وقف کیا تھا۔ یہ چاروں قبرستان ابھی بھی موجود ہیں۔

دوگھرا مسلمانوں کی بڑی آبادی ہے۔ اس لیے اس میں مسجدوں کی تعداد بھی زیادہ ہے۔ ابتداء میں صرف ایک مسجد تھی، جو مشرقی محلہ میں واقع ہے، لیکن کسی معاملہ میں مسلمانوں کے درمیان تفرقہ ہو گیا جس کی وجہ سے ایک دوسری مسجد مغربی محلہ میں بنائی گئی۔ یہ دونوں مسجدیں اپنی جگہ قائم ہیں۔ گرچہ ان دونوں کی تعمیر جدید ہوئی ہے۔ مشرقی مسجد کی تعمیر جدید ۱۹۷۹ء میں ہوئی، جبکہ مغربی مسجد کی تعمیر ۱۹۸۶ء میں ہوئی۔ اس کے بعد کئی مسجدیں تعمیر کی گئیں۔ سندر پور محلہ مشرقی مسجد سے دور تھا، جس کی وجہ سے اس محلہ کے لوگوں کو مسجد میں نماز ادا کرنے میں دشواری ہوتی تھی۔ چنانچہ اسی محلہ میں وارث سردار کا ایک کھلیان تھا جس کو انہوں نے مسجد کے لئے وقف کر دیا۔ مسجد کی تعمیر ۱۹۷۹ء میں مکمل ہوئی۔ اس میں پنج وقتہ نماز کا اہتمام ہوتا ہے۔ اسی طرح حافظ عبدالجلیل صاحب نے اپنے گھر کے پاس مسجد ریاض الجنۃ کی تعمیر کرائی، جو ۱۹۹۸ء میں مکمل ہوئی، اس میں محلہ کے لوگ نماز پڑھتے ہیں۔ اسی طرح برموتر میں ۷؍دسمبر ۲۰۱۶ء میں مسجد ابوہریرہ کی بنیاد ڈالی گئی،

جو تکمیل کے مرحلے میں ہے۔ان میں سے مسجد ابو ہریرہ اور مسجد ریاض الجنۃ میں جمعہ کی نماز نہیں ہوتی، بقیہ مسجدوں میں جمعہ کی نماز ہوتی ہے۔

اس گاؤں کی آبادی پورب کی طرف پھیل گئی اور سرہا (مدنی نگر) پر مسلمانوں کی نئی آبادی بسی جس میں کچھ تو گاؤں کے لوگ تھے جو گنجائش کم ہونے کی وجہ سے گاؤں سے نکل کر وہاں چلے گئے اور انہوں نے اپنا گھر بنایا اور کچھ وہ لوگ ہیں جو قریب کی بستی راڑھی سے اس محلہ میں آ کر آباد ہو گئے ہیں۔ اصل وجہ یہ ہے کہ راڑھی غیر مسلموں کی بستی تھی اور یہ مسلمان جو وہاں چند گھر تھے ان غیر مسلموں کی آبادی میں گھٹن محسوس کرتے تھے۔ جب انہیں سہولت ہوئی تو انہوں نے راڑھی کو چھوڑ کر دوگھرا کے اسی محلہ میں اپنا گھر بنالیا۔اس طرح یہاں بہت سے گھر ہو گئے۔گاؤں کی مسجد بہت دور تھی، اس لیے اس کی ضرورت محسوس کی گئی کہ اس محلہ میں مسجد کی تعمیر کی جائے۔ چنانچہ ماسٹر ذاکر حسین صاحب نے مسجد کی تعمیر کے لئے زمین وقف کی اور مسجد کی تعمیر کا کام ۲۰۰۱ء میں شروع ہوا۔'سرہا' نام مسلم آبادی کے اعتبار سے اچھا نہیں لگتا تھا۔اس لئے میں نے اس محلہ کا نام شیخ مدنی کے نام پر مدنی نگر رکھا۔اسی مناسبت سے یہ مسجد مدنی نگر کی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔

دوگھرا گاؤں سے ریلوے اسٹیشن تقریباً تین کیلومیٹر کی دوری پر ہے، جو جوگیارہ کے نام سے مشہور ہے۔جوگیارہ اسٹیشن سے روڈ جالہ ہوتے ہوئے لتراہا، دوگھرا، راڑھی، پکٹولہ، برہم پور، رتن پور، بھرواره، سنگھوارہ سے گزر کر اتر بیل چوک پر دربھنگہ۔مظفر پور نیشنل ہائی وے ۵۷ سے مل جاتا ہے۔یہ روڈ ہمیشہ سے ہے، اس لئے ہمیشہ اس گاؤں میں آمدورفت کی سہولت رہی۔اسی روڈ سے لوگ بیل گاڑی، ٹم ٹم وغیرہ کے ذریعہ اتر میں جوگیارہ، پوپری وغیرہ گاؤں جاتے، اسی طرح اسی روڈ کے ذریعہ دکھن میں بھرواڑہ، سنگھواڑہ وغیرہ گاؤں کا سفر کرتے۔

یہ گاؤں سیلابی علاقہ کبھی نہیں رہا۔اس لئے اس میں آمدرفت کی سہولت ہمیشہ رہی۔اس علاقہ میں سیلاب عام طور پر پچھّم سے آتا ہے۔اس کا پانی مرکھیا چوڑ میں گرتا ہے۔مرکھیا سے نہر کے ذریعہ جالہ ہوتے ہوئے دوگھرا گاؤں کے اتر پورب سے ہو کر سیلاب کا پانی جہانگیر ٹولہ کی طرف بگہی پوکھر ہوتے ہوئے، ادھوارا ندی میں گر جاتا ہے۔پچھّم میں کترول کی جانب سے جو ندی تھی، وہ ندی بند ہوگئی

ہے۔اس لئے ادھر کا پانی کنٹرول کے نہر سے ہوتے ہوئے پکٹولہ سے گزر کر جہانگیر ٹولہ کی طرف چلا جاتا ہے۔اس طرح یہ گاؤں سیلاب سے پوری طرح محفوظ ہے۔اس کے باوجود سواری کا کوئی انتظام نہیں تھا۔زیادہ تر لوگ پیدل سفر کیا کرتے تھے۔دربھنگہ، مظفر پور، سیتامڑھی، مدھوبنی لوگ پیدل جاتے تھے۔یا پھر بیل گاڑی کے ذریعہ سفر کرتے تھے۔بس، ٹیکسی وغیرہ کا کوئی انتظام تھا ہی نہیں۔ پیدل سفر کرتے یا جوگیارہ اسٹیشن سے ٹم ٹم کے ذریعہ دوگھرا آتے۔جب بس کے چلنے کا رواج ہوا تو تقریباً ۱۹۷۰ء میں ایک بس ڈمڑیا گھاٹ سے مظفر پور ہوتے ہوئے جالہ آنے جانے لگی۔کچھ دنوں کے بعد بس بند ہوگئی، پھر چالو ہوئی،اس طرح بسوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔مظفر پور سے دربھنگہ سے بس آنے جانے لگی۔اب تو بہت سی بسیں چلتی ہیں، بہت سی بسیں جالہ میں رک جاتی ہیں، بہت سی بسیں پوپری جاتی ہیں۔اس طرح اب آمدورفت میں بہت سہولت ہوگئی ہے۔

بنیادی اسکول کے تالاب کے پچھمی بھنڈ پر برج کیشور آشرم بھی ہے،جس میں سماجی خدمت کے کام ہوتے تھے۔اس کو سوامی دامودر سنگھ نے ۱۹۴۸ء میں قائم کیا۔ساتھ ہی انہوں نے مغربی بھنڈ پر ۱۹۴۸ء میں کھادی بھنڈار بھی قائم کیا، جو ابھی بھی باقی ہے۔۱۹۴۸ء ہی میں بنیادی اسکول سے کچھ ہٹ کر اتر میں انہوں نے ایک ہاٹ لگایا۔یہ ہاٹ بنیادی اسکول اور لتراہا قبرستان کے درمیان میں واقع ہے۔اس میں شروع ہی سے ہفتہ میں دو دن جمعرات اور اتوار کو ہاٹ لگتا ہے۔یہ ہاٹ آج بھی باقی ہے۔تقریباً ۱۹۷۰ء میں مغل قبرستان کے دکھن مویشیوں کے لئے ہاٹ لگایا گیا، جس میں جانوروں کے خرید وفروخت کا کام ہوتا تھا۔ساتھ ہی عام ہاٹ بھی تھا،جس میں سبزی اور ضرورت کی چیزیں فروخت ہوتی تھیں،لیکن مویشی ہاٹ نہیں چل سکا وہ بند ہوگیا۔البتہ عام ہاٹ آج بھی ہے۔یہ ہفتہ میں دو دن منگل اور سنیچر کو لگتا ہے۔اس میں عام ضرورت کے سامان ملتے ہیں۔

دوگھرا میں پوسٹ آفس بھی ہے، جو دوگھرا پوسٹ آفس کے نام سے جانا جاتا ہے۔یہ ۱۹۵۱ء میں قائم ہوا۔اس کے پوسٹ ماسٹر، ماسٹر امیر الدین صاحب اور پوسٹ مین حافظ انوار الحق صاحب تھے۔ان کے بعد جناب عبدالحنان صاحب پوسٹ مین ہوئے،ان کا بھی پرموشن ہوگیا تو وہ دربھنگہ چلے گئے۔ان کی جگہ پر محمد مطیع الرحمٰن، پھر محمد عباس پوسٹ مین ہوئے۔محمد عباس کے انتقال کے

بعد ان کے لڑکے آفتاب عالم پوسٹ مین مقرر ہوئے، جبکہ ماسٹرامیرالدین صاحب پوسٹ ماسٹر کے انتقال کے بعد ان کے بڑے لڑکے محمد فضل عالم کی بحالی پوسٹ ماسٹر کی جگہ پر ہوئی، وہ اب تک اس پوسٹ پر کام کر رہے ہیں۔

دوگھرا ایک پنچایت ہے۔ ۲۰۰۸ء تک اس پنچایت میں دوگھرا گاؤں کے علاوہ چندر دیپا، قاضی بہیرا اور سوریا کا چک ملکی شامل تھا، لیکن ۲۰۰۸ء تک اس کی آبادی خود اتنی ہوگئی کہ اب دوگھرا، چک ملکی اور چندر دیپا اس پنچایت میں شامل ہیں۔

ابتدائی دور میں اس پنچایت کے مکھیا اچھے لال مہتو ہوئے، ان کے بعد عبدالمتین انصاری مکھیا منتخب ہوئے، جو 1978ء تک رہے۔ ان کے بعد 1978ء میں حافظ عبدالجلیل صاحب مکھیا منتخب ہوئے، جو 1998ء تک رہے۔ پھر حافظ فخر عالم صاحب 2001 سے 2002 تک، سرفراز عالم 2004، سے 2006ء تک، نور عالم 2006 سے 2011 تک، سرفراز عالم، 2011 سے 2016 تک مکھیا رہے اور 2016ء سے حسرت فردوس موجودہ وقت ۲۰۲۰ء تک مکھیا ہیں۔

انگریزوں کے زمانہ میں کشتی کا رواج بہت زیادہ تھا۔ ہر بڑے گاؤں میں پہلوان ہوتے جو صبح سویرے نوجوانوں کو کشتی کی تعلیم دیتے اور مشق کراتے۔ دوگھرا میں بھی کشتی کا رواج تھا۔ نقوی شاہ اور ان کے لڑکے غفار شاہ اچھے پہلوان تھے۔ غفار شاہ کے دور کو ہم نے بھی دیکھا۔ کربلا پر ان کا ایک باغ تھا، جس میں آم کے درخت وغیرہ لگے ہوئے تھے، اسی میں ان کا اکھاڑہ تھا، اسی میں کشتی کی تعلیم دیتے اور مشق کراتے تھے۔ پہلوانوں کا دنگل ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ دوگھرا بازار پر کشتی کا دنگل ہوا، جس میں غفار شاہ پہلوان اور دبکی پہلوان کا مقابلہ ہوا۔ دبکی پہلوان ان کے شاگرد تھے، لیکن استاد سے مقابلہ کے لئے تیار ہو گئے۔ غفار شاہ نے دبکی پہلوان کو شکست دی۔ اس طرح کا دنگل دیگر علاقہ میں بھی ہوا کرتا تھا، لوگ اس میں خوب دلچسپی لیا کرتے تھے۔

عید اور بقرعید کے دن ظہر کی نماز کے بعد عام طور پر شکار کا رواج تھا۔ لوگ کتا پالتے تھے اور اس کو شکار پکڑنے کا عادی بناتے تھے۔ ان ہی کتوں کو لے کر لوگ شکار کے لئے نکلتے اور خوب شکار کھیلتے۔ بھٹوکھر تالاب، چھھوری تالاب اور نگہہ پر عام طور سے شکار کھیلنے کے لئے جایا کرتے تھے۔

ان دنوں بھٹوکھر کے دکھن بھنڈ پر جنگل تھا۔اسی طرح پورا نگہہ جنگل سے بھرا پڑا تھا۔جبکہ چھوری تالاب کا بھنڈ قدرے صاف تھا اور شکار کے لائق تھا۔

محرم کے موقع پر دس دنوں تک تعزیہ بنانے کا کام چلتا،اس درمیان لاٹھی بھانجنا،جھڑنی کھیلنا اور کرتب دکھانا بہت عام تھا۔ہندو مسلمان میں ایکتا اور محبت کا ماحول تھا۔غیر مسلم بھی اس میں حصہ لیتے اور تعزیہ کو اپنے دروازے پر بلانا فخر کی بات سمجھتے تھے۔اس لئے خاص طور پر نویں اور دسویں محرم کو تعزیہ لے کر لوگ غیر مسلم کے محلہ میں بھی جاتے۔ان کی عورتیں عام طور پر عقیدت میں ان پر پانی ڈالتیں اور بتاشا وغیرہ لٹاتیں۔دسویں محرم کو تعزیہ کو ''رَن'' پر لے جاتے جو موجودہ مغل قبرستان اور روڈ کے نیچے نشیبی زمین میں واقع ہے جہاں پر دوگھر گھاٹ کا پانی گرا کرتا تھا۔اب یہ روڈ ہے جو کنترول سے آکر دوگھرا ہوتے ہوئے نگرڈیہہ کی طرف جاتا ہے۔لوگوں نے بتایا کہ کرتب دکھانے میں اور جھڑنی کھیلنے میں سندر لال کو بہت مہارت تھی۔لوگ اس کو بہت پسند کرتے تھے۔ہنگا کو رومال میں باندھ کر دانت سے پکڑ کر اس کو گھمانے میں سندر لال کو بہت مہارت تھی۔بہت بہت دیر تک اس کو دانت سے پکڑ کر گھمایا کرتے تھے۔آزادی کے بعد ایسا ماحول پیدا ہوا کہ نہ تو وہ لوگ رہے اور نہ اس طرح کا سکون کا ماحول اور نہ جانے کہاں وہ دن چلے گئے۔ہمارے زمانے میں عالم سردار اور صمید کلکتہ سے کچھ کرتب سیکھ کر آئے۔یہ دونوں حضرات نے اپنے بہت سے شاگرد بنائے۔بنوٹ،گتہ وغیرہ چلانا،انہوں نے نوجوانوں کو خوب سکھایا،ساتھ ہی طرح طرح کے فن کا مظاہرہ بھی کر کے لوگوں کے دل کو موہ لیا کرتے تھے۔وہ دور بھی ختم ہوگیا اور اب تو یہ محرم اور تعزیہ کی پرانی قدریں بھی دھیرے دھیرے ختم ہوتی جارہی ہیں۔

دوگھرا کی تاریخ کو آپ نے پڑھا،اس میں تعلیم کا رواج شروع ہی سے رہا۔اس لئے اس گاؤں میں بزرگوں کی تشریف آوری ہمیشہ ہوتی رہی ہے۔حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ ہر سال اس گاؤں میں تشریف لاتے تھے اور ان کی تشریف آوری پر جلسہ اور جلوس کا اہتمام کیا جاتا۔لوگ ان سے مرید بھی ہوا کرتے تھے۔مولانا مونگیری اس گاؤں میں قیام فرماتے۔اس سے گاؤں کا ماحول ہمیشہ پاک صاف رہا۔خاص طور پر شرک و بدعت سے یہ گاؤں پاک رہا۔کبھی بھی اس میں اس

طرح کا کام نہیں ہوا جو شریعت کے خلاف ہو۔ بڑے بزرگ انہیں کے مرید تھے۔اس گاؤں میں لیاقت شاہ اور چنگل شاہ بھی تشریف لاتے تھے۔ لوگوں نے بتایا کہ یہ دونوں حضرات بھی اپنے وقت کے بزرگوں میں سے تھے۔لیاقت شاہ پوپری کے رہنے والے تھے۔جبکہ چنگل شاہ جدوپٹی کے باشندہ تھے۔لیاقت شاہ کی قبر پوپری میں ہے،جبکہ چنگل شاہ اپنے مریدوں کے حلقہ میں مہنار ضلع مظفر پور موجودہ ضلع ویشالی میں تشریف لائے ہوئے تھے،یہیں ان کی طبیعت خراب ہوئی اور وصال کر گئے،ان کی قبر مہنار میں ہے اور آج بھی باقی ہے۔اس گاؤں میں مولانا قاری محمد عثمان صاحب اکثر تشریف لاتے تھے۔شادی بیاہ،میلاد یا کسی بھی خاص موقع پر لوگ ان کو دعوت دیتے، ان کو لانے کے لئے سواری کا انتظام کیا جاتا۔لوگ بہت ہی عقیدت اور محبت کے ساتھ ان کو لاتے، ان کی تقریر سے لوگ بہت متاثر ہوتے،آپس میں میل محبت کی تعلیم دیتے۔لوگوں کو آپس میں ملاتے۔اس طرح بہت اچھا ماحول پیدا ہوتا۔اس طرح گاؤں میں ایک مرکزیت تھی۔ہم لوگوں کے زمانہ میں محمود الحسن انصاری صاحب نے جناب پروفیسر اسرار الحق صاحب کو مدعو کیا۔انہوں نے بہت سے لوگوں کو مرید کیا جو ابھی تک ان ہی سے منسلک ہیں۔

مدرسہ قاسم العلوم حسینیہ کے قیام کے بعد اس گاؤں میں بہت سے جلسے ہوئے،جس میں بڑے بڑے علمائے کرام تشریف لائے۔حضرت مولانا محمد سالم قاسمی اور مولانا منت اللہ رحمانی جیسے اکابر علماء اس گاؤں میں تشریف لا چکے ہیں۔مدرسہ کی جانب سے جب یہ سلسلہ بند ہوگیا تو انجمن آواز نو کے نوجوانوں نے ایک عظیم الشان جلسہ کا پروگرام بنایا،جو دو دنوں تک جاری رہا۔اس میں حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب،مولانا مطلوب احمد صاحب،مولانا شاہین جمالی صاحب اور بہت سے علمائے کرام تشریف لائے۔اس کا اسٹیج نئے مدرسہ کے آنگن میں بنایا گیا،جبکہ مائک اور لائٹ کا انتظام پورے گاؤں میں تھا۔پورے علاقہ سے لوگ جلسہ میں شرکت کے لئے آئے، جلسہ بہت کامیاب رہا اور اس کا اچھا اثر علاقہ پر پڑا۔پھر ۲۰۱۲ء میں المعہد لتحفیظ القرآن الکریم کی جانب سے ایک بڑے جلسہ کا انعقاد کیا گیا،جس میں اس ادارہ سے حفظ مکمل کرنے والے حفاظ کی دستار بندی کی گئی۔اس کا اسٹیج حافظ عبدالجلیل صاحب کے گدام کے پاس بنایا گیا اور پورے گاؤں

میں مائک اور لائٹ کا انتظام تھا۔ اس جلسہ میں بھی بڑے بڑے علمائے کرام تشریف لائے اور دور دراز گاؤں سے لوگ جلسہ میں شرکت کے لئے آئے۔ اس جلسہ کا بھی لوگوں پر بہت اچھا اثر پڑا۔ ۲۰۱۷ء مولانا جابر حسین قاسمی کی کوشش سے ایک بڑا جلسہ ہوا، اس میں بڑے بڑے علماء تشریف لائے، اللہ کا فضل ہے، یہ سلسلہ جاری ہے۔

موضع دوگھرا ایک بڑی آبادی پر مشتمل ہے، جس میں ہندو اور مسلمان دونوں بستے ہیں، ان کی سماجی، معاشی اور تعلیمی جائزہ کی سخت ضرورت ہے تاکہ اس گاؤں کے سلسلہ میں مزید حالات روشنی میں آسکیں۔

**معاشی حالت:** دوگھرا کے باشندوں میں سے پہلے اکثر زمیندار تھے۔ حاجی عبدالعزیز، عبدالمجید بھگت اور عبدالصمد زمیندار تھے۔ حاجی عبدالعزیز مہاراجہ دربھنگہ کے جیٹھ رعیت تھے۔ مال گزاری وصول کیا کرتے تھے۔ گاؤں کی زمین کی نگرانی کا کام انہیں کے ذمہ تھا۔ حاجی عبدالعزیز کے پاس تقریباً ایک سو بیگہا زمین تھی۔ یہی حال عبدالمجید اور عبدالصمد کا بھی تھا۔ حاجی عبدالعزیز کا ایک بیٹھک تھا جو بنگلہ کہلاتا تھا، یہ بنگلہ نہایت ہی عالیشان تھا۔ چاروں طرف سے کمرے تھے۔ یہی بنگلہ ان کا پنچایت گھر بھی تھا، لوگ اس میں بیٹھتے تھے، مقدمات کے فیصلے ہوتے تھے۔ سماجی کاموں کا خاکہ بنتا تھا اور مال گزاری وصول کرنے کا کام بھی ہوتا تھا۔ بنگلہ سے متصل ان کا چمڑا کا گدام تھا، یہ بنگلہ نیم چوک پر تھا، جہاں پر موجودہ حالت میں آفتاب اور مختار کی دکان ہے۔ چونکہ اس گاؤں میں زمیندار لوگ رہتے تھے، اس لئے اس میں کاشت کاری کا کام ہوا کرتا تھا۔ زیادہ تر لوگ کھیتی باڑی سے جڑے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ بہت سے لوگ کلکتہ جوٹ میل میں کام کرتے تھے۔ کچھ لوگ کلکتہ میں ہی کپڑے کا کاروبار کرتے تھے۔ بہت سے لوگ کپڑے بُنا کرتے تھے۔ اس طرح اس گاؤں میں زیادہ خوشحالی نہیں تھی۔ عام لوگ غربت کی زندگی گزارتے تھے۔ کلکتہ جوٹ مل میں کام کرنے والے پریشان رہتے تھے، ان کی تنخواہ بہت کم ہوتی تھی، اس طرح ان کی آمدنی بھی بہت کم ہوا کرتی تھی۔ کچھ لوگوں کو چھوڑ کر عام لوگ غربت کی زندگی گزارتے تھے۔ کھانے پینے میں موٹا جھوٹا کھاتے تھے۔ میری پیدائش آزادی کے بعد ۱۹۵۱ء میں ہوئی۔ ہوش سنبھالا تو یہاں کی معاشی حالت کو دیکھا، سستی کا زمانہ تھا۔ گیہوں دس روپے من تھا۔ چاول ایک روپیہ میں چار سیر، چینی چودہ آنہ، اس

کے باوجود لوگوں کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ ان کو خرید سکیں، گنتی کے چند لوگوں کے پاس پیسے تھے، بقیہ پوری آبادی غریب لوگوں پر مشتمل تھی، روزانہ کماتے تھے اور کھاتے تھے۔ البتہ الوا (شکرقند) ایک روپیہ میں ایک من ملتا تھا۔ زیادہ تر لوگ الوادال کھاتے تھے۔ تقریباً ۱۹۸۰ء کے بعد حالات میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ نئی نسل کے لڑکوں نے کلکتہ کے جوٹ مل اور ریڈی میڈ کے کام کو چھوڑا اور دہلی، بمبئی کا رخ کیا تو اس گاؤں کی حالت بدل گئی۔ اللہ کا فضل رہا کہ اس گاؤں میں خوشحالی آئی۔ موجودہ حالت میں نئی نسل کے لڑکوں نے مختلف کاموں کو پیشہ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ تعلیم کی روشنی آئی تو بہت سے پڑھے لکھے نوجوان نکلے، جنہوں نے اپنی صلاحیت کی بنیاد پر سرکاری نوکریاں حاصل کر لیں۔ بہت سے نوجوانوں نے دیگر علوم وفنون میں کام کرنا شروع کیا۔ انجینئر بن گئے، عالم دین اور خطیب بن گئے، وکیل ہو گئے اور پروفیسر بن گئے۔ بہار سے باہر جا کر کام کرنا شروع کیا۔ اس طرح اس گاؤں کا نقشہ ہی بدل گیا۔ تقریباً ۲۰۰۰ء کے بعد ایک تیسری کھیپ پیدا ہوئی۔ انہوں نے بمبئی میں رہ کر عرب جانے میں کامیابی حاصل کر لی۔ اب تک تقریباً تین سو سے زیادہ نوجوان عرب ملک جا چکے ہیں۔ وہاں مختلف کاموں میں لگے ہوئے ہیں، ان کی آمدنی میں اضافہ ہوا ہے۔ اس لئے ان کے گھر کی معاشی حالت میں بہت حد تک بہتری آئی ہے۔ جن گھروں میں غربت ومفلسی تھی، اللہ کا فضل ہے کہ ان گھروں کے بچوں نے جوان ہونے کے بعد اپنے گھروں کو سنبھال لیا ہے اور اب خوشحالی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ کسی موقع پر مسجد وغیرہ چندہ کرنے کی ضرورت پیش آئی، تو گاؤں سے پانچ ہزار روپے بھی وصول نہیں ہو پاتے تھے، اس کے برعکس جب ۱۹۹۰ء میں چندہ کرنے کی ضرورت پیش آئی تو چند دنوں میں صرف مشرقی محلہ میں پچاس ہزار روپے وصول ہوئے، اس سے اندازہ لگتا ہے کہ اب لوگوں کے گھروں میں روپے ہیں، یہ اللہ کا فضل ہے۔ یہ گاؤں غریب ضرور رہا لیکن مکانات شروع ہی سے اچھے بنے ہوئے نظر آئے، جس کی وجہ سے باہر کے لوگ مکانات دیکھ کر بہت مالدار گاؤں سمجھتے تھے۔ اس گاؤں میں پھوس کے گھر بہت کم تھے، زیادہ تر مکانات کھپڑا پوش تھے۔ بہت ہی سلیقہ سے بنے ہوئے تھے، آج بھی یہ حالت برقرار ہے، بلکہ اب تو پختہ اینٹ کے گھر بننے لگے ہیں اور زیادہ تر گھر اینٹ اور کھپڑے کے بنے ہوئے ہیں۔ بہت سے گھر چھت دار بھی

ہیں۔ مجموعی اعتبار سے موجودہ حالت میں اس گاؤں کی معاشی حالت بہت اچھی ہے۔

غیر مسلم محلہ کا بھی حال کچھ اسی طرح کا تھا۔ راجپوتوں کے چلے جانے کے بعد یہاں چماڑ، دوساد، تیلی، ساہو، مہتو وغیرہ ذات کے لوگ رہ گئے تھے۔ ان میں سے کچھ مال دار تھے۔ ان کے پاس کافی زمین تھی، بقیہ کی حالت خراب تھی، وہ مزدوری کیا کرتے تھے اور اپنی زندگی گزارتے تھے۔ اس محلہ میں اچھے ساہو، اور بٹک ساہو مالدار تھے۔ ان کے پاس بہت زمین وجائیداد تھی، بڑے پیمانہ پر کاشتکاری ہوتی تھی۔ چمار، دوساد وغیرہ ان کی کھیتی باڑی سے منسلک تھے، لیکن موجودہ حالت میں دوساد، چمار میں سے اکثر لوگ کام کاج کے لئے دہلی، پنجاب وغیرہ چلے گئے۔ کھیتی باڑی کا کام سست پڑ گیا۔ مزدور نہ رہنے کی وجہ سے جن کے پاس زمین ہے، وہ پریشانی کے حالت میں رہتے ہیں۔ جنہیں کھیتی باڑی خود کرنے کی صلاحیت ہے، وہ ابھی بھی کاشتکاری کرتے ہیں۔

مجموعی اعتبار سے پہلے کے مقابلے میں مسلم اور غیر مسلم دونوں میں خوشحالی آئی ہے، لیکن غیر مسلموں کے مقابلے میں مسلمانوں میں خوشحالی کا زیادہ اثر دیکھنے کو ملتا ہے۔ خدا اس سلسلہ کو برقرار رکھے اور آگے کی طرف بڑھائے۔

**سماجی حالت:** دوگھرا میں ہمیشہ سے ہندو اور مسلمان دونوں کی آبادی رہی ہے۔ ابتداء میں ہندوؤں کی آبادی زیادہ تھی اور مسلمانوں کی آبادی کم، لیکن نشاۃ ثانیہ کے بعد مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہوگئی اور ہندوؤں کی تعداد کم ہے۔ ان دونوں کے درمیان ہمیشہ بھائی چارہ کا ماحول قائم رہا۔ ہندو مسلمان مل جل کر رہتے تھے، آپس میں میل محبت کا ماحول تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے غم وخوشی میں شریک ہوتے۔ ایک دوسرے کے تہوار میں حصہ لیتے۔ محرم کا زمانہ ہوتا تو بڑی تعداد میں غیر مسلم اس میں حصہ لیتے۔ تعزیہ کو غیر مسلموں کے دروازے پر بھی گھمایا جاتا۔ رن پر مسلمانوں کے ساتھ بڑی تعداد میں غیر مسلم مرد وخواتین بھی موجود ہوتیں۔ محرم میں جھڑنی کھیلنے کا بڑا رواج تھا۔ سندر داس اس میں بہت مشہور تھے۔ مسلمانوں کے ساتھ خوب جھڑنی کھیلا کرتے تھے۔ ہینگا جس سے کھیت برابر کیا جاتا ہے اس کو دانت سے پکڑ کر گھماتے اور کرتب بازی کرتے۔ مسلمان بھی غیر مسلموں کے تہوار میں شامل ہوتے۔ تعزیہ کے زمانہ میں مٹی لانے کا رسم

غیر مسلموں کے علاقہ میں انجام دیا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ ۱۹۶۱ء تک جاری رہا۔ ۱۹۶۲ء میں کسی معاملہ میں ہندو اور مسلمان کے درمیان تنازع ہو گیا، اس نے خوفناک شکل اختیار کرلی۔ آپس میں صلح ومصالحت کی کوشش کی گئی لیکن باہر کے شر پسندوں نے گاؤں کے ماحول کو پراگندا کرنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ یہ گاؤں کے صلح پسند ہندوؤں پر غالب رہے اور مصالحت کو ناکام بنا دیا۔ اسی موقع پر گاؤں کے سربراہ مکھیا عبدالمتین صاحب، حافظ محمد اسحٰق صاحب اور حافظ عبدالجلیل صاحب کو گرفتار کرلیا گیا اور یہ تینوں دربھنگہ جیل بھیج دیئے گئے۔

تقریباً چھ ماہ جیل میں رہنے کے بعد ان تینوں حضرات کی ضمانت پر رہائی ہوئی۔ گاؤں کا ماحول کشیدہ رہنے لگا۔ شر پسند عناصر اس سے فائدہ حاصل کرنے کے چکر میں ہمیشہ رہے۔ آخر کار ۱۹۷۲ء میں مہاویری جھنڈا کے موقع پر معمولی بات پر ہنگامہ شروع ہو گیا اور فرقہ وارانہ فساد کا رنگ دے دیا گیا۔ مسلمانوں نے صبر وتحمل سے کام لیا، اسی موقع پر گاؤں کے حکیم محمد نصیرالدین شہید کر دیئے گئے۔ ان کی قبر تکیہ قبرستان میں تھی، شاید اب وہ مسمار ہو گئی ہے۔ حکیم نصیرالدین باضابطہ حکیم نہیں تھے، حکیموں کی صحبت نے انہیں حکیم بنا دیا تھا۔ وہ شاعری بھی کرتے تھے اور عاصی تخلص کرتے تھے۔

اس فساد کے بعد گاؤں کے ہندو اور مسلمانوں نے آپسی اتحاد ختم ہو جانے پر افسوس کیا۔ علاقہ کے کچھ فرقہ پرست لوگ اس گاؤں کے چوک کو اپنا اڈہ بنائے ہوئے تھے اور بار بار گاؤں کے ماحول کو خراب کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ جب حافظ عبدالجلیل صاحب مکھیا ہوئے تو انہوں نے اس جانب خصوصی توجہ دی اور ان پر شکنجہ کسا۔ اس طرح پھر گاؤں اپنی پہلی حالت میں آ گیا۔ اب ہندو اور مسلمان آپس میں مل جل کر رہتے ہیں لیکن جب شیشہ ٹوٹ جاتا ہے، تو پھر اس کا پورے طور پر جڑنا مشکل ہو جاتا ہے، جڑ بھی جائے تو خراش باقی رہتا ہے، پھر بھی جو ماحول ہے وہ غنیمت ہے۔ سبھی لوگ میل محبت کے ساتھ رہتے ہیں اور آپسی میل محبت کے ساتھ اس گاؤں کو ترقی دینے میں مشغول ہیں۔ اللہ کرے یہ میل ومحبت باقی اور برقرار رہے۔

دوگھرا گاؤں میں مسلمانوں کی مختلف برادریوں کے لوگ بستے ہیں اور سب مل جل کر رہتے

ہیں اور گاؤں کا ماحول بہتر رہتا ہے۔

**تعلیمی حالت:** دوگھرا میں تعلیم کا رواج ابتداء ہی سے نظر آتا ہے۔ امیر اللہ خاندان کے لوگ جب اس گاؤں میں آباد ہوئے، پھر دوسرے خاندان کے لوگ اس گاؤں میں آئے تو ان لوگوں نے نماز پڑھنے کے لئے مسجد کی تعمیر کی۔ مشرقی جامع مسجد اسی وقت کی یادگار ہے۔ اس کی بعد میں تعمیر جدید کی گئی ہے۔ مسجد کی تعمیر سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے اندر دینی جذبہ تھا اور ان حضرات نے تعلیم کے لئے ضرور کوئی سلسلہ قائم کیا ہوگا، لیکن اس کا کوئی ثبوت فراہم نہیں ہوسکا کہ اس زمانہ میں کون تعلیم دیا کرتے تھے۔ حافظ سخاوت صاحب نے نیپال میں تعلیم حاصل کی اور حافظ ہوکر آئے تو انہوں نے اس گاؤں میں درس وتدریس کا سلسلہ جاری کیا۔ حافظ سخاوت صاحب حافظ تھے، انہیں فارسی کا بھی ذوق تھا۔ مغربی محلہ کے بنگلہ کے پاس ان کا مکتب تھا، وہیں وہ تعلیم دیا کرتے تھے۔ مولانا عبدالاحد جالوی ان کے پہلے شاگردوں میں سے تھے۔ ان کے علاوہ بہت سے لوگوں نے ان سے تعلیم حاصل کی اور حافظ ہوئے۔ حافظ یعقوب صاحب، حافظ حامد رسول صاحب، حافظ فرید صاحب، حافظ اسحٰق صاحب، حافظ عبداللطیف صاحب، حافظ عبدالحلیم صاحب، حافظ عبدالحفیظ صاحب، حافظ خلیل صاحب اور حافظ عبدالحفیظ صاحب (ماسٹر عبدالحنان کے بھائی) اور مولانا عطا مولیٰ کے نام قابل ذکر ہیں۔ بتایا گیا کہ حافظ خلیل صاحب نے مبارک پور میں بھی تعلیم حاصل کی۔ حافظ فرید صاحب نے بھی مغربی محلہ میں اپنے گھر کے پاس مکتب قائم کیا، جس سے مغربی محلہ میں علم کا فروغ ہوا۔ اس گاؤں میں علم کو فروغ دینے میں مولانا نواب صاحب کا اہم رول ہے۔ یہ جالہ کے رہنے والے تھے، ان سے چار پشت کے لوگوں نے تعلیم حاصل کی۔ پہلے ان کا مکتب مقصود فرید کے گھر کے پاس تھا، اس میں درس وتدریس کا کام ہوتا تھا۔ جب اس زمین کو حاجی عبدالعزیز صاحب نے فروخت کردیا تو یہ مکتب علی حسن صاحب کے مکان کے پاس غفور صاحب کی زمین میں منتقل کیا گیا۔ یہاں مولانا نواب صاحب کے علاوہ جالہ کے ماسٹر سلیمان صاحب، ماسٹر اسمٰعیل صاحب اور گڑڑی کے ماسٹر یونس صاحب تعلیم دیا کرتے تھے۔ یہ انتظام راج دربھنگہ کی طرف سے تھا، جس کا انتظام حاجی عبدالعزیز صاحب کیا کرتے تھے۔ پھر لوگوں کا خیال ہوا کہ باضابطہ تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ تو بدھو میاں نے اس

کے لئے زمین دیا، جس پر ابھی ماسٹر محمد علی شمسی کا مکان بنا ہوا ہے۔ وہاں اچھے ڈھنگ سے مکتب چلتا رہا۔ اس میں مذکورہ بالا اساتذہ تعلیم دیتے تھے۔ پھر جب وہ زمین فروخت ہوگئی تو یہ مکتب حاجی عبدالعزیز کے بنگلہ میں منتقل ہوگیا اور یہیں تعلیم وتعلم کا کام ہوا کرتا تھا۔ ان اساتذہ نے دوگھرا کی آبیاری کی۔ لوگوں میں علم کا ذوق پیدا کیا اور یہی ذوق آگے بھی کام آیا۔ مولانا نواب صاحب کے مکتب میں مجھے بھی پڑھنے کا موقع ملا، وہ ہر جمعرات کو اپنے گھر جالہ جایا کرتے تھے۔ جمعرات کو جاتے اور سنیچر کی صبح میں واپس آتے۔ مکتب کے طلبا جمعرات کو ان کا بستر، کھڑاؤن اور جلاون وغیرہ لے کر جالہ جاتے، مجھے یاد ہے کہ میں بھی دو مرتبہ جمعرات کے دن ان کا کھڑاؤن لے کر جالہ گیا تھا۔

مولانا نواب صاحب اور حافظ فرید صاحب کا مکتب جاری ہی تھا کہ ۱۹۵۶ء میں اللہ نے ملت کا درد رکھنے والے ایک عالم دین کو دوگھرا کی سرزمین پر بھیج دیا۔ وہ عالم دین تھے مولانا انیس الرحمٰن قاسمی، جو موضع بستوارہ کے رہنے والے تھے اور برہم پور ہائی اسکول میں استاد تھے۔ دوگھرا اپنے سسرال میں رہنے لگے تھے۔ انہوں نے گاؤں کے لوگوں سے صلاح ومشورہ کر کے ۱۹۵۶ء میں ایک مدرسہ قائم کیا، جس کا نام مدرسہ قاسم العلوم حسینیہ رکھا، جو حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی طرف منسوب ہے۔ یہ مدرسہ حاجی عبدالعزیز صاحب کے بنگلہ پر قائم ہوا۔ بنگلہ کے قریب ہی عبدالمجید بھگت جی کا ایک کھیت تھا، جس میں گنّا بہت ہوتا تھا۔ انہوں نے اس زمین کو مدرسہ کے لیے وقف کر دیا۔ اس زمین پر مدرسہ کے لیے باضابطہ عمارت کی تعمیر کی گئی۔ ابتداء میں بنگلہ پر ہی درس وتدریس کا سلسلہ شروع ہوا۔ اللہ نے اس کے فیض کو عام کیا۔ گاؤں اور علاقہ کے لوگوں نے اس سے بہت فائدہ حاصل کیا، اس سے علم کی روشنی پھیلی اس نے علاقہ کی تمام بستیوں کو منور کر دیا۔ اس مدرسہ سے قابل ذکر اور قابل قدر علمائے کرام پیدا ہوئے جن کی تعداد بے شمار ہے۔

اس مدرسہ میں مولانا عبدالحفیظ صاحب، مولانا عبدالحکیم صاب، مولانا وجیہ صاحب، ماسٹر امیر الدین صاحب، مولانا صغیر احمد رحمانی، مولانا عبدالحمید نیپالی، مولانا محمد ہارون صاحب، مولانا ابوبکر قاسمی صاحب وغیرہ نے تدریسی خدمات انجام دیئے۔ اس مدرسہ کے طلبہ دارالعلوم دیوبند اور

دیگر بڑے مدارس میں تعلیم حاصل کرنے جاتے تھے۔ اساتذہ بھی طلبہ پر محنت کرتے تھے اور طلبہ میں بھی دلچسپی تھی۔ موجودہ دور کے تمام علماء اسی مدرسہ کے فیض یافتہ ہیں، بلکہ علاقہ کے علماء نے بھی اسی ادارہ میں تعلیم حاصل کی۔ یہ مدرسہ بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ سے فاضل تک ملحق ہے۔

موجودہ حالت میں مدرسہ زبوں حالی کا شکار ہے۔ جس تیزی سے اس نے ترقی کی اور اس کا فیض جاری ہوا۔ اسی تیزی سے بعد کے ذمہ داروں نے اس کو انحطاط زدہ بنا دیا۔

دوگھرا گاؤں کے پچھم میں مین روڈ پر ۱۹۴۸ء میں دامودر سنگھ (جو جوگیارہ کے رہنے والے تھے) نے تالاب کے بھنڈ پر بنیادی اسکول قائم کیا۔ یہ تالاب اور اسکول آج بھی باقی ہے۔ مومن لیڈر عبدالقیوم انصاری نے اردو مکتب کو حکومت سے منظور کرایا تو اردو مکتب کا قیام دوگھرا میں بھی ہوا۔ حافظ فرید صاحب کی اہلیہ بتولن اس اسکول میں ٹیچر کی حیثیت سے کام کرتی تھیں۔ یہ اسکول ان کے دروازے پر ہی چلتا تھا، پھر مکھیا عبدالمتین صاحب کے زمانہ میں اسکول کے لئے باضابطہ عمارت بنانے کی اسکیم منظور ہوئی تو اس کے لئے بڑا ڈبڑا کے دکھنی بھنڈ پر جناب کبیرالدین صاحب کی زمین تھی جس کو انہوں نے حکومت سے بندوبست کرایا تھا۔ اس کو اسکول کی عمارت بنانے کے لئے دیا۔ اسی زمین پر اسکول کی عمارت تعمیر کرائی گئی جو ابھی بھی اسی زمین پر قائم ہے۔ ابھی ۲۰۱۳ء میں اس کی دومنزلہ عمارت بن کر تیار ہے۔ کچھ کام باقی ہے۔ بڑے اچھے انداز پر یہ مکتب چل رہا ہے۔ ۲۰۰۸ء میں کستوربا گاندھی گرلس اسکول کی منظوری ملی۔ اس کو دوگھرا گاؤں کے لئے منظور کیا گیا۔ اس کی عمارت بنیادی اسکول کے پورب میں تعمیر کرائی گئی۔ یہ اسکول رہائشی ہے، اس میں ایک سو لڑکیاں تعلیم حاصل کرتی ہیں، یہ سبھی ہاسٹل میں رہتی ہیں۔ لوگوں نے بتایا کہ اس میں دوگھرا گاؤں کی صرف ایک مسلمان لڑکی رہتی ہے۔

۱۹۹۰ء میں دوگھرا پرناہاٹ کے پچھم میں دوگھراہائی اسکول قائم کیا گیا۔ لوگوں نے بتایا کہ دوگھرا کے ساتھ لسترا ہا جوڑنے کے سلسلہ میں لوگوں میں اختلاف ہو گیا۔ تنازع کو ختم کرنے کے لئے دوگھرا کے ساتھ لسترا ہا کو بھی شامل کر دیا گیا اور اسکول کا نام دوگھرا لسترا ہا ہائی اسکول رکھا گیا۔ دو گاؤں کے نام پر اسکول کا نام رکھے جانے کی وجہ سے اس کی منظوری نہیں مل سکی لیکن درس وتدریس کا سلسلہ جاری ہے۔

اس کے علاوہ ۲۰۱۰ء میں کھادی بھنڈار کے نزدیک روڈ کے پچھّم ڈاکٹر بدرالدجیٰ اور دستگیر عالم نے صلاح ومشورہ کے بعد ایک پبلک اسکول قائم کیا، جو دوگھرا پبلک اسکول کے نام سے چل رہا تھا اور اب اس اسکول کا نام بدل کر سینٹ میری پبلک اسکول ہوگیا ہے۔ اس میں تقریباً ۲۰۰ طلبا وطالبات تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اسکول کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ ابھی درجہ اول سے درجہ پنجم تک کی تعلیم ہوتی ہے۔ ہائی اسکول تک کا پروگرام ہے۔ اسی اسکول کی بلڈنگ میں میں نے سوشل ایسوسی ایشن فار ایجوکیشنل اینڈ ڈیولپمنٹ (سفید) کے زیر اہتمام مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی کا Knowledge Resource Centre منظور کرایا، جو سفید انسٹی چیوٹ آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کے نام سے چل رہا تھا، جو ابھی بند ہوگیا ہے۔

دوگھرا میں دینی تعلیم کا رواج زیادہ رہا ہے۔ شعبہ حفظ کے طلبا کی تعلیم کے لئے گاؤں کے نوجوانوں نے انجمن آوازنو کے زیر اہتمام المعہد لتحفیظ القرآن الکریم نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ یہ ادارہ مسجد ریاض الجنۃ میں چل رہا ہے۔ اس ادارہ میں صرف حفظ کی تعلیم ہوتی ہے۔ کئی لڑکوں نے حفظ کی تعلیم مکمل کی ہے۔ رمضان میں دوگھرا کی مسجدوں میں اس ادارہ سے فارغ حفاظ کرام نے تراویح سنایا۔ لوگوں نے اس موقع پر مسرت اور خوشی کا اظہار کیا۔

دوگھرا میں شاہ کوچنگ سینٹر بھی ہے۔ اس میں طلبا وطالبات کے لئے کوچنگ کا انتظام ہے۔

دوگھرا میں تعلیم کی طرف لوگوں کی توجہ بہت زیادہ ہیں۔ بہت سے طلبا دربھنگہ، پٹنہ، دہلی، دیوبند وغیرہ میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ لڑکیاں اور لڑکے آٹو کے ذریعہ جالہ، راڑھی میں اچھے ٹیچروں کے پاس کوچنگ کرنے کے لئے صبح وشام کے وقت جاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ سال ۲۰۱۳ء میں کئی لڑکیوں نے میٹرک امتحان میں فرسٹ ڈویزن سے پاس کیا اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ اس طرح جہاں مدرسہ تعلیم کی طرف لوگوں کا رجحان ہے، اسی کے ساتھ عصری تعلیم کی طرف بھی گارجین کی توجہ ہے۔ توقع ہے کہ آئندہ یہ رجحان اور بڑھے گا اور یہ گاؤں تعلیم کے میدان میں مزید مرکزیت حاصل کرے گا۔

خدا آباد رکھے اس چمن کو

# (۲)

# ایک ہفتہ ایران میں

## ملک ایران

ایران جنوب مغربی ایشیا کا ایک ملک ہے جس کا مطلب آریوں کی سرزمین ہے۔ یہ نام عرف عام میں استعمال کیا جاتا ہے جب کہ اس کا سابق نام فارس تھا، اور موجودہ فارسی نام جمہوری اسلامی ایران ہے۔ یہ مشرق وسطی میں واقع ہے۔ اس کی شمال میں ارمینیا، آذر بائجان اور ترکمانستان، جنوب میں خلیج فارس اور خلیج عمان، مشرق میں پاکستان وافغانستان اور مغرب میں ترکی اور عراق واقع ہے۔ اس ملک کا پوربی اور بیچ کا علاقہ بنجر اور غیر آباد جنگلوں پر مشتمل ہے، جس میں کہیں کہیں کھجور کے باغات ہیں، مغرب میں ترکی اور عراق کے سرحدوں پر پہاڑی سلسلے ہیں، شمال میں بحیرۂ قزوین کے اردگرد زرخیز پٹی کے ساتھ ساتھ کوہ البرز واقع ہے۔

زمانہ قدیم میں ایران فارس کے نام سے مشہور اور ایک وسیع وعریض سلطنت پر مشتمل تھا۔ زمانے کے ساتھ ساتھ اس پر کئی اقوام حملہ آور ہوئیں اور اپنی تہذیب وتمدن کے اثرات ایرانی سرزمین پر چھوڑ گئیں۔ یہ عربوں، سلجوق، ترکوں، منگولوں، افغانوں وغیرہ کے قبضے میں رہا تاہم ایرانیوں نے اپنی انفرادیت اور شناخت ہمیشہ برقرار رکھی۔

آثار قدیمہ کے لحاظ سے یہاں سولہ ہزار سال پہلے آباد انسانی بستیوں کا سراغ ملا ہے۔ چھٹی صدی عیسوی میں یہاں ترقی یافتہ معاشرہ وجود میں آیا جو شہروں پر بھی مشتمل تھا۔ ایران میں کئی شاہی خاندانوں نے حکومت کی۔ ان میں سب سے پہلا قابل ذکر شاہی خاندان خامشی

(250 تا 559) ہے۔اس کی بنیاد سائرس اعظم نے رکھی تھی۔250 تا 300 قبل مسیح تک اس پر یونانیوں کا قبضہ رہا پھر پارتھی آئے اور بعدازاں ان کی جگہ ساسانیوں نے لے لی۔

ساتویں صدی عیسوی میں مسلمانوں نے ساسانیوں سے حکومت چھین لی۔وقت کا دھارا آگے بہتا رہا، ایران سلجوقی ترکوں، منگولوں اور تیمور لنگ کے قبضے میں رہا۔صفوی دور حکومت (1502ء تا 1736ء) میں ایرانی معاشرہ کئی بنیادی تبدیلیوں سے گزرا۔بعدازاں ایران پر افغانوں کا غلبہ رہا جن سے 1921ء میں ایک فوجی افسر، رضا خان نے اقتدار چھینا اور پہلوی سلطنت کی بنیاد رکھی۔

1941ء میں رضا خان کا بیٹا محمد رضا تخت شاہی پر بیٹھا اور تاریخ میں شاہ ایران کے لقب سے مشہور ہوا۔شاہ ایران اپنے باپ کی اصلاحات کا منصوبہ جاری رکھنا چاہتا تھا تاہم اس ضمن میں اسے اپنے وزیر اعظم، محمد مصدق کی طرف سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔مصدق کی طاقت کے سامنے بے بس پا کر شاہ ایران ملک سے فرار ہو گیا تاہم سی آئی اے نے 1953ء میں مصدق حکومت کا تختہ الٹ دیا۔اس طرح شاہ ایران اپنے ملک کے سیاہ وسفید کا مالک بن گیا۔

رفتہ رفتہ ایران امریکی ''برکات'' سے مستفید ہونے لگا مگر اس پر مذہبی طبقہ چراغ پا ہو گیا۔ انہوں نے شاہ ایران کے مغرب نواز اقدامات پر کڑی تنقید کی، اس پر حکومت اور علماء کے درمیان رسہ کشی شروع ہوئی۔شاہ ایران نے طاقت سے مذہبی طبقے کو ختم کرنے کی کوشش کیں، تو عوام بھی اس صورت میں آیت اللہ خمینی نے ایرانیوں پر زور دیا کہ وہ شاہ ایران کی آمرانہ حکومت کا خاتمہ کر کے اسلامی اصول وقوانین پر مبنی حکومت قائم کریں۔امام خمینی کی تحریک نے جلد ہی ایران میں مقبولیت حاصل کر لی۔دو سال کے زبردست تصادم کے بعد آخر کار 1979ء میں شاہ ایران ہجرتت کرنے پر مجبور ہو گیا۔

چونکہ شاہ ایران کا سب سے بڑا حمایتی امریکہ تھا، اس لئے قائم شدہ اسلامی حکومت اور امریکہ کے درمیان شروع سے ہی ٹھنی رہی۔ایران کو پس پردہ روس اور چین کی حمایت حاصل ہے اور رہی جس کی وجہ سے ایرانی حکومت نے امریکہ اور اسرائیل کی جارحانہ اور ناجائز پالیسیوں کے

خلاف آواز بلند کرتی رہی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ مخالفت بڑھتی چلی گئی۔

ایران کی آبادی 60 ملین کے قریب ہے ملک میں مختلف اقلیتیں بھی آباد ہیں۔ پارسی عیسائی اور یہودیوں کا وجود بھی ہے۔ 98 ہزار عیسائی' 26 ہزار یہودی 91 ہزار زردتشت کے ماننے والے ہیں۔ کثیر المذاہب والے ملک میں مذہبی تنگ نظری کام نہیں آتی۔ ایران کا تہذیبی ورثہ صدیوں پرانا ہے۔ سینکڑوں برس تک فارسی سنٹرل ایشیائی ممالک کے علاوہ برصغیر پر چھائی رہی۔ قطب الدین ایبک سے لے کر اورنگ زیب تک دردباری زبان فارسی ہی رہی۔

دکن کے نظام الملک آصف جاہ اول نے بھی فارسی کو برقرار رکھا۔ عہد وسطی میں ایرانی کلچر نے سارے ہندوستان پر اپنے گہرے نقوش مرتب کیے۔ ایرانی آرٹسٹوں' فنکاروں' شاعروں' ادیبوں نے اپنے کمال فن کے جوہر دکھلائے اور زندگی کے ہر شعبہ پر عمیق اثرات مرتب کئے۔ ڈیریس اول قبل مسیح کے زمانے میں حدود سلطنت مشرق میں دریائے سندھ تا مغرب میں یونان تک ــــــ پھیلے ہوئے تھے۔ سامانی سلطنت کے زوال کے بعد ساتویں صدی عیسوی کے وسط میں اسلام ایران میں پھیلتا چلا گیا۔ ایرانی عوام سامانی حکومت سے بیزار ہو گئے تھے۔ انہیں اسلامی نظریات میں چین اور سکون ملا۔ حضرت امام روح اللہ خمینی کی قیادت میں یکم اپریل 1979ء میں اسلامی جمہوریہ کا قیام عمل میں آیا۔ آیت اللہ خمینی کی عظیم رہنمائی کا آفتاب ان کی وفات جون 1989ء تک چمکتا رہا۔

ایران کے صدارتی انتخاب میں عوام براہ راست حصہ لیتے ہیں صدر کو چار سال کے لیے منتخب کیا جاتا ہے وہ ریاست کا عاملانہ سربراہ ہوتا ہے۔ وہ مجلس پارلیمنٹ کی رضامندی سے اپنی کابینہ کی تشکیل کرتا ہے۔ مجلس کے 270 اراکین کو خفیہ رائے وہ کے ذریعہ چار سال کے لئے منتخب کیا جاتا ہے۔ اقلیتوں کے نمائندے بھی پارلیمنٹ میں ہوتے ہیں 12 رکنی محافظوں کی کونسل مجلس کے بنائے ہوئے قوانین کا اسلامی شریعت کی روشنی میں جائزہ لیتی ہے ملک کا مذہبی رہنما اسلامی اسکالر کا تقرر کرتا ہے۔ عدالت عالیہ کی جانب سے دیگر 6 مفتیوں کا تقرر کیا جاتا ہے۔ جب تک یہ 12 اراکین منظوری نہ دیں اس وقت تک کسی بھی قانون کو منظوری نہیں ملتی۔ عدلیہ سپریم کورٹ اعلیٰ عدلیہ کونسل اور ماتحت عدالتوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ رہنمائے ملک کی جانب سے چیف جسٹس کا تقرر کیا جاتا ہے

اسلامی قوانین میں انفرادی حقوق کی ضمانت دی گئی ہے۔ سارے ایران کو 24 صوبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ 195 ٹاؤن اور 500 ہزار اضلاع ہیں۔ ہر صوبہ میں ایک گورنر ہوتا ہے جو نظم ونسق کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ ہر ٹاؤن میں ایک نائب گورنر ہوتا ہے ہر ضلع میں ایک مقیم کو متعین کیا جاتا ہے۔ ایران کا سب سے بڑا صوبہ خراسان ہے جو تین لاکھ تیرہ ہزار کلومیٹر تک پھیلا ہوا ہے۔ ایران کے دستور کے آرٹیکل 30 کے مطابق ثانوی درجہ تک تعلیم کا مفت انتظام کیا گیا ہے۔ ایران میں اسکولوں کی تعداد 70 ہزار کے قریب ہے۔ 4,88,000 اساتذہ درس تدریس سے وابستہ ہیں۔ کم وبیش ۱۱ ملین طلباء تعلیمی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ ملک میں 24 جامعات ہیں 27 اعلیٰ تعلیمی ادارے ہیں۔ 87-1986ء کے اعداد وشمار کے مطابق جامعات کے طلباء کی تداد 67,97,1 ہے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں کام کرنے والے ملازمین کی تعداد 14,341 ہے۔

ایران بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے۔ ملک میں صنعتی ترقی بھی ہو رہی ہے۔ معاشی منصوبہ بندی پر عمل کی جا رہا ہے۔ ایران حکومت ملک کو معاشی طور پر خود کفیل بنانا چاہتی ہے۔ عوام کو روزگار کے ذرائع فراہم کرتی ہے۔ لوگوں کے معیار زندگی کو بلند کرنے کی جانب توجہ دیتی ہے۔ ملک کی معیشت کو تین شعبوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ عوامی شعبہ میں ہم صنعتیں، بیمہ کمپنیاں، ترسیل وابلاغ عوامی، ذرائع حمل ونقل ہیں۔ امداد باہمی کے تحت اشیاء کی پیداوار تقسیم اور خدمات وابستہ ہیں۔ نجی شعبہ میں اقتصادی فلاح وبہبود کے کام انجام دیئے جاتے ہیں۔

ایران کے قدرتی وسائل میں تیل اور قدرتی گیس شامل ہے۔ خلیج فارس کے علاوہ قم میں تیل کے ذخائر دریافت ہوئے ہیں۔ تیل ہی ملک کے زرمبادلہ کا اہم ذریعہ ہے۔ اسے بیرونی ممالک کو بھیجا جاتا ہے۔ ملک میں خام تیل کی اوسط پیداوار یومیہ 2.5 ملین بیرول ہے۔ بیرونی ممالک کو دو ملین بیرل تیل برآمد کیا جاتا ہے۔ قدرتی گیس ایل برز کی پہاڑیوں اور خراسان میں پائی گئی ہے۔ یہ بھی ایران کا ایک قیمتی اثاثہ ہے۔ ایران کے کیمیکل کارخانے شیراز بند خمینی ابدانمز گ میں قائم کئے گئے ہیں۔ کاروں اور ٹرکٹروں کے کارخانے بھی ہیں۔ پارچہ بانی کی صنعتیں بھی ہیں۔ اس کے علاوہ شیشہ، سگریٹ، کاغذ کے کارخانے بھی ہیں۔

ایران تہذیب وثقافت کی دولت سے مالا مال رہا ہے۔ اسلام کی آمد کے بعد ایرانی قلم کاروں نے عربی میں اپنی تخلیقات کیں لیکن نویں صدی عیسوی کے بعد سے فارسی کا چلن بڑھنے لگا۔ فارسی ادب نے عالمی سطح پر اپنا ایک خاص مقام بنالیا۔ حافظ شیرازی، شیخ سعدی، جلال الدین رومی، عمر خیام عہد آخر کے شعرائے کرام ہیں۔ فارسی میں رباعی جیسی صنف سخن کی اختراع کی گئی اسے ہمہ گیر مقبولیت ملی گیارہویں صدی سے فارسی نثر بھی سرسبز شاداب ہوتی رہی اس میں نہ صرف فلسفیانہ بلکہ سائنسی علوم بھی پیش کئے گئے۔ شیخ سعدی کی گلستان وبوستان کی نثر نے ساری دنیا میں دھوم مچادی یہ دو کتابیں صدیوں تک درسی نصاب میں شامل رہیں۔ صفوی حکمرانوں کی سرپرستی میں فن تعمیر کو عروج حاسل ہوا۔ گنبدوں اور میناروں نے شہرت حاصل کی۔ صفوی عہد میں اصفہاں صدر مقام تھا۔ وہ محلوں مسافر خانوں سے بھرا ہوا تھا۔ ساری عمارتیں ایرانی آرٹ کا حسین نمونہ ہے۔ ایرانی آرٹ کی خوبصورتی نزاکت اور حسن آگرہ کے تاج محل میں دیکھا جاسکتا ہے۔ فن تعمیر کے بعد خوش نویسی Calligraphy کو جلا ملی۔ قران کریم نقش طرز میں لکھی گئیں۔ اس طرز کو ایرانی نثر ادا بن مذہ نے اختراع کیا تھا۔ نستعلیق طرز تحریر بھی بہت مقبول ہوا اسے افغانستان، پاکستان، ہندوستان میں شہرت دوام حاصل ہوئی۔ ایرانی غذاؤں کا تو دنیا میں جواب نہیں۔

ایران رقبہ کے لحاظ سے دنیا کا سولہواں بڑا ملک ہے۔ تاریخی، تمدنی، سیاسی اور آثار قدیمہ کے لحاظ سے نہایت ہی اہمیت کا حامل ہے۔

ایران دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں سے ایک ہے۔ اس ملک کی تاریخ ہزاروں سال پر محیط ہے۔ یورپ اور ایشیا کے وسط میں ہونے کی وجہ سے اس کی تاریخی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ ایران اقوام متحدہ، غیر وابستہ ممالک کی تحریک، اسلامی کانفرنس تنظیم (او آئی سی) اور تیل برآمد کرنے والے ممالک کی تنظیم (اوپیک) کا بانی رکن ہے۔ اس ملک میں تیل کا بڑا ذخیرہ ہے جس کی وجہ سے بین الاقوامی سیاست میں اس ملک کا اہم رول رہا ہے اور آج بھی ہے۔

## ملک ایران کا سفر

ایران ایک اہم ملک ہے۔ یہاں بڑے بڑے شاعر اور ادیب پیدا ہوئے۔ مولانا جلال

الدین رومی، مولانا جلال الدین دوانی، شیخ سعدی شیرازی، فریدالدین عطار، عمرخیام، فردوسی، حافظ شیرازی اوراس قسم کے سینکڑوں اہم اصحاب علم وفضل ہیں جوایران میں پیدا ہوئے اوراپنے علم و فضل سے پوری دنیا کومتاثر کیا۔اسی ملک کے خراسان میں بڑے بڑے علماءاورمشائخ پیدا ہوئے جیسے امام محمدابن اسمعیل البخاری، امام مسلم نیشاپوری صاحب الصحیح المسلم، امام محمد الغزالی الطوسی، شیخ الحرمین الجوینی، شمس الایمہ السرخسی، امام رازی، امام بیھقی، البیرونی، الخوارزمی اور جامی وغیرہ۔۔ شیخ سعدی کی کتاب گلستاں وبوستاں ہندوستان کے تعلیمی اداروں کے نصاب تعلیم میں داخل ہے اور بچپن ہی سے طلباان کتابوں کوپڑھتے ہیں۔میں نے بھی بچپن میں گلستاں اور بوستاں کو بہت ہی شوق سے پڑھااوراعلی تعلیم کے دوران ایران کے ادیبوں اورشاعروں کی کتابوں کامطالعہ کیا۔اسی زمانے سے ایران کاایک نقشہ ذہن میں بنااورگھومتارہا۔

مدرسہ اسلامیہ شمس الہدی، پٹنہ میں تقرری کے بعدفارسی زبان اورایران کے لوگوں سے ملاقات کاموقع آتارہا۔ان کے جلسوں میں شرکت کرتارہا،لیکن اس رابطہ میں اضافہ اس وقت ہوا جب میں نے 1997 میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدی کے پرنسپل کاعہدہ سنبھالا، ایران کلچرسوسائٹی کے ڈاکٹریٹراوردیگرحضرات پٹنہ یونیورسیٹی میں آئے، توان کی میٹنگ میں شرکت کاموقع ملتا۔ایک مرتبہ پرشین ٹیچرس ایسوسی ایشن کاجلسہ پٹنہ میں ہوا۔اور پٹنہ یونیورسیٹی کے فارسی ڈیپارٹمنٹ میں جلسہ بھی ہوا، اس موقع پر پرشین ٹیچرس ایسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری پروفیسرعبدالودوداظہر دہلوی سے بھی قربت حاصل ہوئی۔اوران کے واسطہ سے اس سیمینارکاایک سیشن مدرسہ اسلامیہ شمس الہدی پٹنہ کے ہال میں بھی کرایا۔اس میں ایران کلچرسوسائٹی کے ڈائرکٹرکریم نجفی بھی اورفرزوہ نے بھی شرکت کی۔ساتھ ہی اس وقت کے وزیرتعلیم کومیں نے دعوت دی انہوں نے میری دعوت کوقبول کرکے اس سمینار میں شرکت کی۔ان کی آمدسے اس جلسہ کامزیدوقاربلندہوا۔میں نے اس موقع پر اپنی مختصرتقریرمیں فارسی زبان وادب کاصوبہ بہار کے مدارس سے کیارشتہ ہے، اس پرروشنی ڈالی۔ اوراس حقیقت کوپیش کیاکہ فارسی زبان کی تعلیم مدارس میں دی جاتی ہے۔درجہ سوم سے فاضل تک فارسی زبان نصاب تعلیم میں شامل ہے۔یہ زبان ہندوستان کی سرکاری زبان رہی ہے۔ساتھ ہی

ہمارا ثقافتی رشتہ اس زبان سے ہے۔اس لئے ہم اہل مدارس اس زبان سے والہانہ محبت کرتے ہیں۔ صوبہ بہار میں مدارس ملحقہ کا ایک جال بچھا ہوا ہے۔ان میں سے بہار مدرسہ بورڈ سے ملحق تقریباً ۴۰۰۰ مدارس ہیں جہاں فارسی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ان کے علاوہ مدارس نظامیہ بھی ہیں۔ اس طرح مدارس میں فارسی زبان کی تعلیم کے لئے ایک مربوط نظام ہے۔اس موقع پر مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے اساتذہ،طلبا سبھوں نے بھی فارسی زبان میں اظہار خیال کیا جس کی وجہ سے بہت اچھا معیار قائم ہوا۔اس جلسہ میں میں نے یہ تحریر بھی پیش کی۔مدارس کے اساتذہ اور طلبا کو اہل زبان سے فارسی بولنے اور سننے کا موقع نہیں ملا۔اس لئے یہ لکھنے پر قدرت ضرور رکھتے ہیں،لیکن بولنے پر قدرت نہیں رکھتے ہیں،جس طرح یونیورسیٹی کے اساتذہ وطلبا کو ایران سفر کے لئے موقع فراہم کرایا جاتا ہے،اس طرح اس Exchange پروگرام کو بھی جوڑا جائے۔پروفیسر عبد الودود اظہر دہلوی کی تقریر نے اس اہمیت کو مزید اجاگر کیا۔اس طرح صوبہ بہار کے مدارس کو ایران کلچر ہاؤس کے آفیسران کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔یہ سلسلہ آگے بڑھتا رہا۔ایران کلچر سوسائٹی کے آفیسران سے ملاقات کا موقع بار بار ملتا رہا اور رابطہ مضبوط ہوتا رہا۔

یہاں اس واقعیت کا اظہار کو خاص اہمیت حاصل ہے کہ بحیثیت پرنسپل میری یہ خواہش کہ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کی اہمیت تو مسلم ہے ہی،اس کچھ کمی آئی ہے،اس کمی کو دور کیا جائے اور اس کی علمی حیثیت کو مزید آگے بڑھایا جائے،اسی جذبہ کے تحت میں نے اس پروگرام کو مدرسہ کا حصہ بنایا،جس سے اس کی ماضی کی روایت ٹوٹ سکے۔میں نے مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ میں سیمینار کرائے، مشاعرے کرائے،جلسے کرائے جس میں صوبہ بہار کے علماء شعراء مسلم تنظیموں کے ذمہ داران،مدارس کے اساتذہ دانشوران،قائدین ملک وملت کو شریک کرایا جس کی وجہ سے اس مدرسہ کا وقار بلند ہوا۔میں نے مدرسہ کے ہال کو جو شادی کے لئے بک کیا جاتا تھا،اس پر پابندی عائد کی،اور اس کو مزین کرایا۔پھر کانفرنس ہال بنایا۔اس جذبہ کے تحت میں نے مدرسہ کے ہال میں رابطہ ادب اسلامی کا سیمینار کرایا۔ مدرسہ کے احاطہ میں پیام انسانیت کا عظیم الشان جلسہ کرایا جس میں حضرت مولانا سید ابوالحسن ندوی تشریف لائے۔ساتھ ہی ملک کے بڑے بڑے جید اور اہم علمائے کرام تشریف لاتے جس کی وجہ

سے بہت اچھا ماحول پیدا ہوا۔ یوم آزادی کے موقع پر ۱۵ اگست کو مشاعرہ کا اہتمام کرایا۔ تاکہ طلبا اس سے استفادہ کریں اور ان میں ادبی ذوق پیدا ہو۔ امریکن سینٹر کے نمائندے مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ میں آئے تو میں نے خود انگریزی میں خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ اور طلبا سے بھی انگریزی زبان میں تقریر کرائی۔ اسی طرح جب فارسی کا جلسہ ہوا تو اس میں اساتذہ طلبا سبھوں نے فارسی زبان کا استعمال کیا۔ اس طرح طلبا کی تربیت کے لئے بھی ہمہ جہت ترقی کے مواقع فراہم کئے گئے۔ اللہ کا فضل رہا کہ میں اس میں کامیاب رہا، طلبا میں جرأت پیدا ہوئی۔ ان میں بیداری آئی اور ان کا حوصلہ بلند ہوا۔ اور ان کو اس کا احساس ضرور ہوا کہ ہمارے اندر بھی اس کی صلاحیت ہے۔ ساتھ ہی آنے والے مہمانوں نے بھی اس کا اعتراف کیا۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی وہ جلسہ بھی تھا۔ جلسہ میں ایران کلچر ہاؤس کے ڈائرکٹر ڈاکٹر کریم نجفی اور ان کے کانسلر علی رضا قزوہ اور پروفیسر عبدالودود اظہر پٹنہ میں تشریف لائے۔ اور انہوں نے اس موقع پر مدرسہ اسلامیہ شمس الہدی پٹنہ میں باضابطہ پروگرام کا خاکہ پیش کیا۔ اس موقع پر شاندار جلسہ ہوا۔ اس موقع پر میں نے فارسی زبان کی اہمیت اور مدارس کے ساتھ اس کے مضبوط رشتہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اس موقع پر بھی طلبا نے فارسی زبان میں تقریر کی جس کی وجہ سے ایک اچھا اثر پیدا ہوا۔ اور ایران کلچر سوسائٹی کے ڈائرکٹر اور کانسلر نے بھی فارسی زبان کے رشتہ سے مدارس کی اہمیت کا اعتراف کیا۔ اسی موقع پر مدرسہ اسلامیہ شمس الہدی پٹنہ کے ہال میں انجمن ادبی بیدل کا افتتاح بھی ہوا۔

ایک دن میں اپنے نوتعمیر مکان کو دیکھنے کے لئے نیو عظیم آباد کالونی گیا۔ مکان کی بنیاد کو دیکھ رہا تھا کہ میرے موبائیل پر فون آیا انہوں نے بتایا کہ میں قاری یسین ایران کلچر ہاؤس دہلی سے بول رہا ہوں، آپ کے لئے ایک پیغام ہے وہ یہ کہ ہندوستان کے علمائے کرام کا ایک وفد ایران جا رہا ہے۔ آپ اس وفد کے ساتھ ایران جائیں گے۔ چونکہ ایران کے سفر پر جانے سے پہلے ڈیپارٹمینٹل پرمیشن کی ضرورت پڑتی ور اس میں بہت وقت لگتا ہے۔ اس کا اندازہ ۲۰۰۲ء میں امریکہ جاتے وقت بھی ہو چکا تھا، اس لئے میں نے ان سے سوال کیا کہ سفر کب ہوگا۔ انہوں نے جو وقت بتایا وہ وقت بہت قریب کا تھا، اتنے کم دنوں میں محکمہ تعلیم سے اجازت نامہ جاری ہونا مشکل تھا۔ اس لئے میں نے ان سے یہ کہ کر معذرت کر لیا کہ آئندہ کوئی شکل ہو تو اس میں مجھے شامل کیا

جائے، اوراس کی اطلاع بذریعہ دعوت نامہ مجھے دی جائے، تاکہ میں اس دعوت نامہ کے واسطے سے میں محکمہ تعلیم سے اجازت حاصل کرسکوں۔ انہوں نے اس کو سمجھا۔ جنوری کی کسی تاریخ میں سفر کی اطلاع دی۔ میں نے دعوت نامہ ارسال کرنے کے لئے ان سے درخواست کی۔ چنانچہ میل پر انہوں نے دعوت نامہ بھیج دیا۔ اس دعوت نامہ کو پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔

پھر میں نے اپنے پاسپورٹ کی کاپی ایران کلچر ہاؤس کو فراہم کرایا۔ تاکہ ویزا جاری ہو سکے۔ میں نے ایران جانے کے لئے تیاری شروع کردی۔ سفر کے لئے محکمہ تعلیم میں اجازت نامہ کے لئے مکتوب ارسال کیا۔ اور اجازت نامہ کے لئے کوشش شروع کی۔ بہت کوشش کے بعد بھی وقت پر مکتوب جاری نہیں ہوسکا چونکہ آخری تاریخ آچکی تھی اور سفر کرنا ضروری تھا، اس طرح اجازت کی امید پر میں نے سفر کا ارادہ کرلیا۔ اور مورخہ ۱۴۔۱۔۲۰۱۱ کو دہلی کے لئے روانہ ہوگیا۔ موخہ ۱۵۔۱۔ ۲۰۱۱ کو میں ایران کلچر ہاؤس پہنچ گیا۔

ایران کلچر ہاؤس نئی دہلی میں ایک روڈ پر ایک وسیع رقبہ میں واقع ہے۔ اس کے اندر دفتر، پارک، لائبریری وغیرہ ہے۔ یہ ایرانی سفارتخانہ کے تحت واقع ہے۔ اس کی خدمات ہر جگہ نمایاں ہیں۔ نئی دہلی میں واقع ایران کلچر ہاؤس کی سرگرمیاں مزید نمایاں ہیں۔ یہ ہندوایران تہذیب و ثقافت کو فروغ دینے میں کوشاں ہے۔ ڈاکٹر کریم نجفی کلچرل کاؤنسلر، ڈاکٹر علی رضا قزوہ دوسرے کلیدی عہدہ پر فائز ہیں۔ ان کے زمانے میں کلچرل ہاؤس تہذیب وثقافت اور ادبی، علمی وشعری مرکز کا گہوارہ ہوگیا ہے۔ اور علم وادب اس طرح موجودہ وقت میں تہذیب وثقافت میں اس کا اہم رول ہے۔ خاص طور پر ہندوستان میں فارسی زبان وادب کے فروغ میں اس کا اہم رول ہے۔ اس ادارہ نے ہندوایران دوستی کو بھی مستحکم کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ایران ہندوستان کا بہترین دوست ہے۔ ایران کے ساتھ ہندوستان کے تعلقات بہت خوشگوار ہیں۔ دعوت نامہ سے یہ بات میرے علم میں آئی کہ مجمع جہانی تقریب بین مذاہب اسلامی کے سربراہ آیت اللہ شیخ محمد علی تسخیری کی دعوت پر ہندوستان کے علماء کا ایک وفد مورخہ ۱۶ر جنوری کو ایران کیلئے روانہ ہوگا۔ اسلامی انقلاب کے بعد جمہوری اسلامی ایران میں علوم وفنون کی نشاۃ ثانیہ اوراس کی اشاعت وفروغ اور کھوئی ہوئی

اقدار کی واپسی کے سلسلے میں خاص دلچسپی کا مظاہرہ کیا جارہا ہے اور وحدت اسلامی کیلئے یہ تنظیم کوشاں ہے۔ اسی تنظیم کی دعوت پر علمائے کرام کا یہ وفد ایران میں منعقد ہونے والے سیمینار میں شرکت کیلئے روانہ ہوگا جو سیمینار ایران کے شہر تہران کے ساتھ دیگر شہروں میں بھی منعقد ہوگا۔

**ایران کلچر ہاؤس میں**: پروگرام کے مطابق میں دہلی پہنچا تو مورخہ ۱۵ رجنوری ۲۰۱۱ کو ایران کلچرل ہاوس میں وفد میں شامل علمائے کرام کے نام معلوم ہوئے اور مغرب کے بعد منعقد جلسہ میں تمام حضرات سے ملاقات ہوئی۔ ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:۔

(۱) مولانا محمد رفیق قاسمی، جماعت اسلامی ہند، دہلی

(۲) مولانا عطاء الرحمن قاسمی۔ صدر شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ دہلی

(۳) مولانا محمد ذاکر وحیدی۔ تنظیم ائمہ مساجد ہند دہلی

(۴) مولانا محمد فرقان قاسمی امام وخطیب شاہی سنہری مسجد ومعاون کل ہند ائمہ مساجد دہلی

(۵) مولانا حاتم ذکی الدین۔ صدر تنظیم بہرہ بروڈا

(۶) مولانا محمد نور الدین سکریٹری الدعوۃ العویہ احمد آباد

(۷) مولانا محمد سید اطہر زہدی صدر جامعہ عربیہ تحفیظ القرآن دھلی

(۸) مولانا محمد اعجاز عرفی قاسمی صدر تنظیم علمائے حق دھلی

(۹) مولانا میر ارشد قاسمی صدر جامعہ عربیہ فیض سبحانی ومعاون جمعیت علماء ہند، شہر سورت

(۱۰) مولانا انور علی قاسمی صدر شوری اسلامی ہند، نئی دہلی

(۱۱) مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی پرنسپل مدرسہ اسلامیہ شمس الہدی پٹنہ (بہار)

(۱۲) مولانا عبدالعزیز خان معاون جماعت اسلامی مغربی بنگال وصدر تنظیم اتحاد دہلی

(۱۳) مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی معاون مسلم پرسنل لا بورڈ

(۱۴) ڈاکٹر طارق عمیر عثمانی صدر درسگاہ مرکز اسلامی ومدیر ماہنامہ دار السلام پنجاب

(۱۵) مولانا افروز علی قاسمی صدر جمعیت ملت اسلامیہ ومدیر ماہنامہ نعرۂ تکبیر دہلی

(۱۶) مولانا مفتی حمزہ اشرفی نظامی صدر حیدری فیڈریشن ممبئی

(۱۷) مولانا سعود عالم قاسمی صدر سنی تھائیلوجی، علی گڑھ مسلم یونیورسیٹی، علی گڑھ

(۱۸) مولانا حکیم عبدالحلیم قاسمی صدر ریکس کمپنی دہلی

(۱۹) مولانا شیر محمد جعفری امام جمعہ وصدر تنظیم اہل بیت، ممبئی

(۲۰) مولانا افروز مجتبیٰ نقوی صدر سازمان جوانان امامیہ ہند، دہلی

نام کی فہرست سے واضح ہے کہ اس وفد میں ہندوستان کے مختلف صوبوں سے تعلق رکھنے والے علمائے کرام ہیں اور ان کا تعلق مختلف تنظیموں اور اداروں سے ہے۔ رات کی میٹنگ ایران کلچرل ہاوس نئی دہلی میں منعقد ہوئی اور اس میٹنگ میں ایران کیلئے سفر اور ان کے مقاصد پہ گفتگو ہوئی، ساتھ ہی وفد میں شریک علمائے کرام اور ایران کلچر ہاوس نئی دہلی کے آفیسران کے ساتھ تعارف بھی ہوا۔

دن کا کھانا کھایا۔ علامہ خمینی کے نمائندہ سے ملاقات کی۔ ان کو میں نے صوبہ بہار کے مدارس بالخصوص مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کی فارسی زبان میں خدمات سے روشناس کرایا، انہوں نے بھی خوشی اور مسرت کا اظہار کیا اور اپنی نصیحتوں سے نوازا۔ ہم ان کے بھی ممنون ہیں۔ کلچر ہاؤس کے کتب خانہ کو دیکھا۔ کتب خانہ کو دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔

**ملک ایران کے لئے روانگی:** دوسرے دن مورخہ ۱۶ رجنوری کو ۲ بجے دن میں ایران کیلئے فلائٹ کا وقت تھا۔ اس لئے ناشتہ کے بعد دس بجے دن میں ایران کلچر ہاوس نئی دہلی سے ہماری روانگی ہوئی۔ روانگی سے پہلے ڈاکٹر کریم نجفی، ڈاکٹر علی رضا قزوہ اور دیگر آفیسران حاضر ہوئے اور اجتماعی تصویر لی گئی اور پھر ایرانی روایت کے مطابق ڈاکٹر نجفی نے قرآن کو سر پر اٹھا کر رکھا اور اس کے نیچے سے قرآن کے سائے میں وفد کے ہر فرد کو گزار کر گاڑی میں سوار کرایا۔ یہ منظر نہایت ہی حسین اور دلکش تھا اور اسی وقت سے اس کا مظاہرہ ہونے لگا کہ اسلامی تعلیمات کو ایران کے لوگوں نے کس طرح اپنی زندگی کے ساتھ وابستہ کیا ہے۔ یہ اس کا پہلا مشاہدہ تھا۔ تقریباً ساڑھے دس بجے علمائے کرام کا یہ قافلہ ایران کلچر ہاوس نئی دہلی سے ملک ایران کیلئے روانہ ہوا۔

**تہران کے لئے فلائٹ:** دہلی اور تہران کے وقت میں دو گھنٹے کا فرق ہے۔ ہمارے فلائٹ کا وقت دو بجے تھا لیکن مہان ایئر لائنس کا فلائٹ مورخہ ۱۶ رجنوری کو ایک گھنٹہ تاخیر سے دو بجے

کے بجائے تین بجے روانہ ہوا۔ ہوائی جہاز میں بھی اسلامی انداز نمایاں تھا۔ ایر ہوسٹیس کو عریانیت سے دور پایا۔ ٹی۔ وی کا اعلان اللہ کے نام سے شروع ہوا اور درمیان میں بھی کسی طرح کا کوئی غیر شرعی منظر نظر نہیں آیا۔ تقریبا تین گھنٹے سفر کے بعد امام خمینی انٹرنیشنل ہوائی اڈہ پر جہاز اترا۔ باہر نکلنے میں تقریبا ایک گھنٹہ وقت لگ گیا۔ سامان لیکر ہوائی اڈہ کے باہری حصہ میں آیا، گھڑی پر نظر پڑی تو چھ بج کر دس منٹ ہو رہے تھے۔ مغرب کی اذان میری کانوں میں گونجی۔ بہت ہی سہانا موسم تھا اور بہت ہی خوبصورت منظر۔ امام خمینی ہوائی اڈہ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، اسلامی انقلاب کے بعد امام خمینی کے نام پر بنایا گیا ہے۔ ہوائی اڈہ بہت ہی خوبصورت ہے اور ہر طرف خوبصورتی کے آثار نمایاں ہیں۔

**تہران میں:** جب میں باہر نکلا تا کہ بس کے ذریعہ تہران شہر جاؤں، باہر نکلتے ہی ہوا کا تیز جھونکا چلتا ہوا محسوس ہوا، ساتھ ہی ساتھ ہلکی ہلکی بوندا باندی بھی ہو رہی تھی اور برف باری بھی۔ بتایا گیا کہ ایران میں بہت برف باری ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں دہلی میں بھی اس کا علم ہوا تھا کہ ایران میں بہت سردی پڑتی ہے۔ اس کے مطابق گرم کپڑوں کو پہننے کا بھی پہلے سے اہتمام کرلیا تھا۔ وہاں کے موسم کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ واقعی ایران میں بہت برف باری ہوئی تھی۔ جب ہوائی اڈہ سے باہر نکلا تو اردگرد درختوں اور پارکوں کو برف سے ڈھکا ہوا پایا۔ ایسا بتایا گیا کہ درجہ حرارت مائنس ۵ ہے۔ شام کا اندھیرا آگے کی طرف بڑھ رہا تھا، لیکن قمقموں کے لائٹ کی جگمگاہٹ او سنسان راستے پہ گاڑی کی سرسراہٹ بہترین سماں پیدا کر رہی تھی۔ اسی درمیان ہمارے رفیق سفر شیر محمد جعفری ہماری رہنمائی کیلئے بس میں کھڑے ہو گئے۔ یہ کئی برسوں تک ایران میں رہ کر تعلیم حاصل کر چکے تھے۔ اسلئے ایران سے پوری واقفیت تھی۔ انہوں نے بتایا کہ امام خمینی ہوائی اڈہ سے تہران سیٹی تقریبا ۴۵ کیلومیٹر ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے یہ بتایا کہ یہ روڈ جس سے ہم لوگ گزر رہے ہیں یہ شاہراہ انقلاب ہے۔ امام خمینی جب فرانس سے ایران تشریف لائے تو تقریبا ۸۵ لاکھ لوگوں نے اسی شاہراہ پر ان کا استقبال کیا تھا۔ ہماری گاڑی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ بالآخر تہران شہر میں داخل ہوئی۔ ہر طرف روشنی کی جگمگاہٹ میں برف سے ڈھکا ہوا پارک، درخت اور مکانات سامنے آنے لگے۔ اس جگمگاتی روشنی کے بیچ نہایت ہی خوبصورت تحریر میں سڑکوں کے کنارے مختلف طرح کے ہدایات، شعراء کے اشعار

، پند ونصائح اور خوبصورت فارسی رسم الخط میں دکانوں کے نام، کبھی کشادہ روڈ، کہیں مختصر سڑک غرض مختلف خوبصورت راستوں سے گزرتے ہوئے ہماری بس ایک ہوٹل کے پاس آکر رکی۔ اس ہوٹل کا نام ہوٹل امیر تھا۔ ہم لوگ بس سے اترے اور ہوٹل کی لابی میں داخل ہوئے، ہوٹل امیر نہایت ہی صاف ستھرا ہوٹل ہے، جو خیابان طالقانی، بین ایرانشہر وفرصت پلاک ۸ ۷ ۲ میں واقع ہے۔ ہوٹل کی لابی میں تھوڑی دیر بیٹھے۔ پھر ہوٹل کے کمرہ میں اپنے رفیق سفر مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی کے ساتھ داخل ہوئے، سامان رکھا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ ہوٹل کا کمرہ بڑا اور صاف ستھرا تھا۔ ائیر کنڈیشن ہونے کی وجہ سے بہت آرام ملا۔ فریش ہونے کے بعد کھانا کھانے کیلئے ہوٹل کے کینٹین میں گئے جہاں طرح طرح کے کھانے تھے۔ کھانا کھایا، نماز ادا کیا اور کچھ دیر لوگوں سے گفتگو کے بعد آرام کیا۔

مورخہ ۱۷؍جنوری کو تقریب بین مذاہب یونیورسیٹی میں ہم لوگ کا پروگرام تھا۔ صبح ساڑھے آٹھ بجے ناشتہ کیا پھر ہم لوگ ہوٹل کی لابی میں جمع ہوئے۔ وہاں سے بس کے ذریعہ تقریب بین مذاہب یونیورسیٹی کیلئے روانہ ہوئے۔ اس یونیورسیٹی کے قیام کو تقریباً تیرہ سال ہوئے ہیں۔ یہاں بے آزار شیرازی مسؤل کل، ڈاکٹر احمد ازہانی شیرازی اور مولانا اسحاق مدنی سے ملاقات ہوئی، یونیورسیٹی کے ہال میں میٹنگ کا انعقاد کیا گیا۔ یہ تینوں ایران کے بڑے عالم اور دانشور ہیں۔ مولانا اسحاق مدنی فقہ حنفی کے صدر اور انچارج ہیں۔ ساتھ ہی صدر ایران کے مشیر خاص بھی ہیں۔ انہوں نے اپنی تقریر میں یہ بتایا کہ اس یونیورسیٹی میں فقہ شافعی، حنفی اور فقہ امامیہ کی تعلیم ہوتی ہے۔ اس میں شیعہ اور سنی تمام طلبا مل جل کر رہتے ہیں اور تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ایران کے مدارس کے نظام تعلیم پر میرے سوال کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ ایران میں کچھ مدارس کو حکومت امداد دیتی ہے اور کچھ مدارس آزادانہ طور پر چلتے ہیں، وہ حکومت سے امداد حاصل نہیں کرتے۔ جو مدارس حکومت کے ذریعہ امداد یافتہ ہیں ان کے فارغین براہ راست سرکاری ملازمت حاصل کرتے ہیں اور جو آزاد مدارس ہیں ان کے فارغین کے لئے اہلیتی ٹسٹ کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ اس میں پاس ہونے کے بعد انہیں سرکاری ملازمت ملتی ہے۔ ہر شہر میں دونوں طرح کے مدارس موجود ہیں۔

مولانا اسحاق مدنی نے پاکستان میں تعلیم حاصل کی اور پھر مدینہ یونیورسیٹی میں۔ پاکستان میں

تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے وہ اردو زبان بولتے تھے اور انہوں نے اپنی تقریر اردو زبان میں ہی کی۔ جب کہ ڈاکٹر زہانی شیرازی نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کے حوالے سے وحدت اسلامی پر زور دیا کہ مسلکی اختلاف کی وجہ سے زیادہ مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کی کتاب ''الانصاف فی بیان سبب الاختلاف'' کا حوالہ دیتے ہوئے مسلکی اختلافات کے سلسلے میں اس کتاب سے رہنمائی حاصل کرنے پر زور دیا۔ اس سلسلے میں میں نے یہ معلومات فراہم کرایا کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی یہ کتاب نہایت ہی اہم کتاب ہے اور اس کتاب کا اردو میں بھی ترجمہ ہوگیا ہے جس کا نام جادہ اعتدال ہے۔ مسلکی اختلاف کو ختم کرنے کے سلسلے میں حضرت شاہ صاحب نے جو رہنمائی فرمائی ہے وہ نہایت ہی اہم ہے اور ہمارے لئے مشعل راہ بھی ہے۔ خلاصہ یہ کہ مسلمانوں کے درمیان اتفاق واتحاد قائم کرنے پر زور دیا گیا اور آپسی انتشار کی وجہ سے پیدا ہونے والے فسادات پر گفتگو ہوئی۔ ہر ایک نے اتحاد اسلامی پر زور دیا۔

اس یونیورسیٹی کی لائبریری بہت خوبصورت ہے اور اس میں تمام مذاہب کی کتابیں دستیاب ہیں۔

ہوٹل امیر کے رستوران میں دن کے کھانے کی دعوت کے سلسلہ میں خبر موصول ہوئی۔ یہ دعوت مجمع جہانی تقریب بین مذاہب اسلامی کے سربراہ آیت اللہ محمد علی تسخیری کی جانب سے تھی۔ انہیں کی دعوت پہ ایران کا سفر ہوا تھا۔ ایران میں ان کی شخصیت بہت ہی اہم ہے۔ اس تنظیم کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہے۔ اس کا مقصد مسلمانوں کے مختلف فرقوں اور مختلف مسلک کے ماننے والے لوگوں کو آپس میں قریب کرنا اور اسلامی وحدت کو فروغ دینا ہے۔ چنانچہ یہ انٹرنیشنل تنظیم ہے اور اس کے ذریعہ اتفاق واتحاد، اخوت و بھائی چارگی کو فروغ دیا جاتا ہے۔ اس ادارہ کے قیام کا مقصد مسلمانوں کو قریب کرنا، آپسی تفریق ختم کرنا اور اتحاد کے لئے نقطہ کو تلاش کرنا ہے۔ چنانچہ کھانے سے پہلے شیخ تسخیری کا مختصر خطاب ہوا، انہوں نے ایران کے خوش گوار ماحول، دینی فضا اور اسلامی انقلاب کے بعد ایران کے حالات کو غور سے دیکھنے اور ساتھ ہی آپسی اخوت وبھائی چارگی کو عام کرنے کی ذمہ داری سے علمائے کرام کو روشناس کرایا۔ شیخ تسخیری کی تقریر نے سبھوں کو متاثر کیا۔ میں نے بھی ان کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے ایران کے سفر کیلئے ہندوستانی وفد کو مدعو کیا اور اس طرح اخوت اسلامی

کے جذبے کومزید مستحکم کیا، ساتھ ہی ہندوستان اور ایران کی دوستی کومزید مستحکم کیا۔اس موقع پر پریس کے لوگوں کو اپنا مقالہ بھی حوالہ کیا جو اسلامی اتحاد اور اخوت اسلامی کے موضوع پہ تھا۔اس کے بعد کھانے کا دور شروع ہوا اور پرتکلف دعوت کا اہتمام کیا گیا۔

تہران میں قیام کے دوران تہران یونیورسیٹی کے شعبہ الٰہیات میں حاضری کا موقع ملا۔ہوٹل امیر سے بس کے ذریعہ ہم لوگ روانہ ہوئے۔راستہ میں امریکی سفارت خانہ کی عمارت بھی نظر آئی جس کو انقلاب کے بعد بند کردیا گیا ہے۔اس طرح مختلف روڈ سے ہماری بس گزری۔ہوا میں خنکی تھی۔ایران میں برف باری ہوئی تھی۔اس کا اثر ہر جگہ ظاہر تھا۔پارک برف سے ڈھکا ہوا، پیڑ پودے پر خزاں کے آثار، درخت پتیوں سے خالی، برف سے شاخیں ڈھکی ہوئی۔اسی بیچ جگہ جگہ نہایت ہی خوشخط تحریر میں فارسی زبان میں ہدایات، ضرورت کے مطابق قرآنی آیات، احادیث کے ٹکڑے، بزرگوں کے اقوال اور شعراء کے اشعار نظر آئے۔ساتھ ہی فارسی رسم الخط میں دکانوں کے نام اور ضروری ہدایات مزید حسن پیدا کررہے تھے۔اسی بیچ ہماری بس ایک روڈ کے کنارے رکی۔سامنے تہران یونیورسیٹی کا شعبہ الٰہیات نظر آیا۔بس سے اتر کر سیڑھی سے اوپر چڑھے اس وقت ہلکی دھوپ نکل آئی تھی۔سامنے سیڑھی کے پاس ہم لوگ پہنچے کہ شعبہ الٰہیات کے ڈائرکٹر محمد علی رضا رضوان طلب نے بڑھ کر خیر مقدم کیا اور سامنے لگے ہوئے البم میں شہدائے کرام کا تعارف کرایا جو اسلامی انقلاب کے دوران شہید ہوئے تھے۔پھر ہم لوگ کانفرنس ہال میں گئے اور وہاں جلسہ کا انعقاد کیا گیا۔شعبہ الٰہیات کے اسٹاف مہدی صاحب نے قرآن کی تلاوت کی۔پھر ڈاکٹر امام صدر شعبہ الٰہیات نے خیر مقدم کیا۔انہوں نے بتایا کہ اس شعبہ کے قیام کو ۷۶ سال ہوئے ہیں۔بہت سے دانشوران اور اساتذہ کا تعلق اس شعبہ سے رہا ہے اور شعبہ الٰہیات کے سلسلے میں تفصیلی گفتگو کی۔انہوں نے اپنی تقریر میں علماء اور دانشوران کو اپنی ذمہ داری کی طرف متوجہ کیا اور دشمنوں کی سازش سے ہوشیار رہنے پر زور دیا اور مسلمانوں کو آپس میں تعلقات کو بڑھانے اور اس کو مضبوط کرنے پر زور دیا۔ساتھ ہی دوست ملک ہندوستان کے علماء کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا۔ان کے بعد ڈاکٹر رضوان طلب نے یونیورسیٹی کے سلسلے میں مزید معلومات فراہم کرایا۔اس موقع پر میں

نے اپنا مختصر تعارف کراتے ہوئے مدرسہ اسلامیہ شمس الہدی کے قیام، اس کے نصاب تعلیم اور صوبہ بہار میں مدارس کے نظام پر تفصیلی گفتگو کی۔ میں نے انہیں یہ بھی بتایا کہ ہندوستان بالخصوص صوبہ بہار کے مدارس میں ابتدائی درجات سے فاضل (M.A) تک کے نصاب میں فارسی زبان وادب شامل ہے۔صوبہ بہار میں تقریبا چار ہزار مدارس ہیں جن میں باضابطہ فارسی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ ماحول میسر نہیں ہونے کی وجہ سے طلباء فارسی زبان میں گفتگو کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔میری اس گفتگو سے وہ بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے یہ کہا کہ فارسی زبان وادب کی فروغ کیلئے اساتذہ فراہم کرانے کیلئے وہ اپنی سطح سے بھی کوشش کریں گے تاکہ ریفریشر کورس وغیرہ کے ذریعہ طلباء کو تکلمی زبان میں مہارت پیدا کرائی جائے اور وہ فارسی زبان بولنے پر قادر ہوسکیں۔اس موقع پر شعبہ الہیات کے دیگر اساتذہ اور ہندوستانی وفد میں شریک دیگر علماء نے بھی اظہار خیال کیا۔واپسی کے وقت ڈاکٹر رضوان طلب نے جامع تفاسیر نور کا سی۔ڈی تحفہ میں پیش کیا۔

تہران میں قیام کے دوران جماران حاضری کا بھی موقع میسر آیا۔یہ وہ جگہ ہے جہاں اسلامی انقلاب کے بانی شیخ علامہ آیت اللہ خمینی کی رہائش گاہ اور میوزیم واقع ہے۔جماران جانے کیلئے بس کے ذریعہ ہم لوگ روانہ ہوئے۔جماران شہر سے دور اور پہاڑ کی بلندی پر واقع ہے۔اس علاقہ میں برف باری کا بہت زوردار اثر نظر آیا۔روڈ پر برف جمی ہوئی تھی۔ساتھ ہی ساتھ مکانات کے چھت ،درخت کی ٹہنیاں، پارک کی گھاس پھوس سبھی برف سے ڈھکے ہوئے تھے۔اسی برف کے اوپر سے ہماری بس گزر رہی تھی۔جماران کے راستے ہی میں ایک جگہ تجریس بھی ہے جہاں رضا شاہ پہلوی کے محلات واقع ہیں۔رضا شاہ پہلوی کی حکومت ہی کے دوران انقلاب آیا اور بالآخر شاہ پہلوی کو ملک چھوڑ کر فرار ہونا پڑا، اور پھر ملک میں انقلاب برپا ہوا، اور شیخ آیت اللہ خمینی کی قیادت میں نئی حکومت قائم ہوئی۔بہر حال ہماری بس آگے بڑھتی رہی اور پہاڑ کی بلندی پر ہم لوگ چڑھتے رہے۔برف سے ڈھکا ہوا پہاڑی سلسلہ بہت حسین اور خوبصورت منظر پیش کرر ہا تھا، راستہ کے کشادہ نہیں ہونے کی وجہ سے ڈرائیور نے بس کو روک دیا اور ہم لوگ وہاں سے پیدل چلے۔سردی بہت، راستے پر برف جمی ہوئی۔بچتے بچاتے ایک عمارت کے پاس پہنچے۔وہاں بیگ وغیرہ جمع کر لیا گیا۔روڈ سے گزر کر

اندر گئے تو امام خمینی کے مکان کے اندر پہنچے۔ یہ سن کر بہت حیرت ہوئی کہ یہ ان کا اپنا مکان نہیں بلکہ ان کے ایک دوست نے ان کو یہ مکان ان کی رہائش کیلئے دے دیا تھا۔ آج بھی وہ مکان میوزیم کے طور پہ محفوظ ہے۔ پھر وہاں سے اس عمارت کے اندر گئے جہاں وہ لوگوں سے ملتے اور تقریر کرتے تھے۔ اس کے بعد امام خمینی میوزیم میں داخل ہوئے۔ اس میوزیم میں امام خمینی اور ان کے رفقاء کو مختلف انداز میں دکھایا گیا ہے۔ امام خمینی کی تحریر اور دیگر چیزوں کو میوزیم میں محفوظ کیا گیا ہے۔ وہاں مختلف گوشوں سے گزر کر جب کاؤنٹر کے پاس پہنچے تو تاثرات کے رجسٹر پر میں نے اپنے تاثرات لکھے جس میں ایران کے آمد پر خوشی، اسلامی انقلاب کے آثار پر مسرت اور امام خمینی میوزیم کے حسین منظر اور ہندوستان وایران دوستی کو مزید مستحکم ہونے کے سلسلے میں تذکرہ کیا اور اس پر اپنا دستخط کر دیا۔ اس طرح تاریخی سفر ثابت ہوا۔ اسی میوزیم میں موسسہ الامام خمینیؒ بھی ہے جس کے ذریعہ امام خمینی اور ان کی تحریک کے سلسلے میں ریسرچ کا کام ہوتا ہے اور اس ادارہ کے ذریعہ بہت سی کتابیں بھی شائع کی گئی ہیں۔ امام خمینی کی رہائش گاہ نے یہ ثابت کر دیا کہ سچے انقلابی کی زندگی ایسی ہی ہوتی ہے۔

امام خمینی کی ولادت ۱۳۱۲ھ/۲۱ ستمبر ۱۹۰۲ء میں خمین شہر میں ہوئی۔ ان کا گھر علم و فضل اور تقویٰ سے آراستہ رہا۔ ان کی عمر چھ مہینے سے زیادہ نہیں ہوئی کہ ان کے والد آیت اللہ سید مصطفیٰ الموسوی ڈاکوؤں اور بدمعاشوں کے ہاتھوں شہید کر دئے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ حکومت کی جانب سے بھیجے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے بچپن کے ایام اپنی والدہ سیدہ ہاجر کے ساتھ گزارے۔ ان کا گھر بھی علم و فضل وتقویٰ سے آراستہ تھا۔ ابتدائی تعلیم شہر خمین میں حاصل کی پھر قم چلے آئے اور یہاں کے علمائے کرام، فضلائے عظام اور مجتہدین سے علوم وفنون اور اخلاق اور عرفان کو حاصل کیا یہاں تک کہ وہ ایک جید عالم بن کر لوگوں کے سامنے آئے۔

امام خمینی نے ابتدا ہی سے انقلابی ذہن پایا تھا اور اسی اعتبار سے انہوں نے تعلیم ہی کے درمیان سے اپنے آپ کو ڈھالا اور تحریک اسلامی کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا اور یہاں تک کہ وہ انقلاب اسلامی کے ایک بڑے محرک بن کر سامنے آئے۔ انہوں نے ایران میں ۱۹۷۴ء میں انقلاب کیلئے کوشش شروع کی جس کے نتیجے میں انہیں بار بار ملک بدر کیا گیا۔ یہاں تک کہ مختلف ملکوں میں وقت گزارنے

کے بعد وہ فرانس آئے اور فرانس میں رہتے ہوئے ہی ایران میں انقلاب کیلئے راستہ ہموار کرلیا۔ یہ ان کی انتہائی مقبولیت کی علامت ہے۔ یہاں تک کہ ۱۹۷۹ء میں جب انقلاب مکمل ہو گیا تو وہ ایران تشریف لائے اور لوگوں نے ان کا خیر مقدم کیا اور ان کے ذریعہ ایران میں اسلامی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ ان کی وفات ۱۹۸۹ء میں ہوئی اور بہشت زہرہ میں دفن کئے گئے۔

تہران میں قیام کے دوران وفد کا پروگرام Islamic Culture & Relation Organization کے لئے بھی طے ہوا۔ مختلف شاہراہوں سے ہماری بس گزری۔ پہاڑوں کے درمیان پُر پیچ اور شاندار روڈ، خوبصورت پارک، درختوں کے جھنڈ جس پر خزاں کے آثار نمایاں تھے برف باری کی وجہ سے تمام درخت کے پتے جھڑ چکے تھے اور پتے کی جگہ برف نے اپنا ٹھکانہ بنالیا تھا۔ اس طرح تقریباً آدھا گھنٹہ کا راستہ طے کرنے کے بعد ہم لوگ اسلامک کلچرل آرگنائزیشن کے دفتر پہنچے۔ کانفرنس ہال میں جلسے کا اہتمام کیا گیا۔ وہاں محمد خرم شاد سے ملاقات ہوئی جو اس تنظیم کے صدر ہیں اور ان کے ساتھ میٹنگ ہوئی۔ خرم شاد نے تحریک اسلامی کی تاریخ پر تفصیلی گفتگو کی، انہوں نے کہا کہ انقلاب کے بعد اس ملک کی بنیاد علم اور تزکیہ پر رکھی گئی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ایران حکومت نے تعلیم کو عام کرنے کے لئے بڑے بڑے ادارے قائم کئے ہیں، یونیورسٹیاں اور مدارس قائم کئے گئے ہیں۔ دینی واسلامی علوم وفنون کے ساتھ سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم پر زور دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس ملک میں جہاں بڑے بڑے دینی مدارس، حوزہ علمیہ اور اسلامک ریسرچ سینٹر ہیں جس میں اسلامی علوم وفنون کی تعلیم دی جاتی ہے وہیں ان علوم وفنون پر ریسرچ کا کام بھی ہوتا ہے۔ ساتھ ہی بڑی بڑی یونیورسیٹیاں ہیں جن میں سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جتنے بھی جدید آلات ہیں سبھوں کو ہمارے ملک کے سائنسدانوں نے بنالیا ہے اور سب سے بڑی اور اہم بات یہ ہے کہ علماء کے ساتھ سائنس اور ٹکنالوجی کے ماہرین کو بھی ہم نے تزکیہ کے ساتھ جوڑنے کی پوری کوشش کی ہے۔ ان میں دینداری ہے، تقوی ہے، پرہیز گاری ہے، انسانیت کی قدر ہے، حقوق کی رعایت ہے اور ان کا مزاج دینی اور اسلامی ہے۔ اس طرح بہت اچھا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تقریر کے بعد مختلف علمائے کرام نے اظہار خیال کیا۔ میں نے بھی اس موقع پر اپنی تقریر میں کہا کہ ایران

کے سلسلے میں کتابوں میں جو کچھ پڑھا یہاں اس کا مشاہدہ کیا۔اسلامی تحریک کے حوالے سے میں نے کہا کہ مولانا جمال الدین افغانی سے لیکر مولانا مودودی تک کی تحریکات کا میں نے کتابوں میں مطالعہ کیااوراس کی عملی تطبیق کا ایران میں آکر مشاہدہ ہوا۔میں نے اس موقع پہ اس کا بھی اظہار کیا کہ ڈاکٹر کریم نجفی،ڈاکٹر علی رضا قزوہ اورایرانی کلچر ہاوس نئی دہلی کا بہت بہت شکریہ کہ انہوں نے ہندوستان کے صوبہ بہار کو بھی اس وفد کے ساتھ جوڑااورانہوں نے ایران کے سفر کیلئے موقع فراہم کرایا۔

تہران میں Glassware and Ceramics Museum of Iran میں بھی حاضر ہوا۔ یہ جمہوریہ اسلامی ایوینیو سے تین تیر اسٹریٹ میں واقع ہے۔اس میں شیشے اور مٹی کے مختلف قسم کے برتن،اور خوبصورت ظروف ہیں جس کا تعلق پرانے زمانے سے ہے،جونہایت ہی حسین وخوبصورت ہیں۔اس میوزیم میں لائبریری بھی ہے ساتھ ہی اس میں ایجوکیشن کورس بھی چلائے جاتے ہیں۔

تہران کے قبرستان بہشت زہرہ میں امام خمینی کا مزار ہے۔اس کے پاس سے ہماری بس گزری۔ ہم لوگوں نے اس کی خواہش ظاہر کیا کہ بس کو روک دیا جائے تا کہ بانی انقلاب علامہ خمینیؒ کے مزار پر فاتحہ خوانی کی جائے لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے ایسا نہیں ہوسکا اور دوسرے موقع کے لئے اس پروگرام کوملتوی کر دیا گیا۔پھرقم جاتے ہوئے بھی بہشت زہرہ کے پاس سے گزرے اس روز بھی وقت کی کمی تھی اسلئے بہشت زہرہ میں امام خمینی کے مزار پر فاتحہ خوانی کا موقع میسر نہیں آیا،البتہ بس پر ہی ہم لوگوں نے امام خمینی کیلئے فاتحہ خوانی کر دی۔البتہ ان کے مزار پر حاضر نہ ہونے کا افسوس رہا۔

**مشہد**:مشہد ہمارے پروگرام میں شامل نہیں تھا۔ہوٹل امیر میں شیخ آیات اللہ کی جانب سے دن کے کھانے کی دعوت تھی۔پروگرام کے اختتام پر ہندوستانی وفد کی جانب سے ان کی خدمت میں درخواست کی گئی کہ مشہد کو ہمارے پروگرام میں شامل نہیں کیا گیا ہے،مشہد ایک اہم شہر ہے ایران پہنچ کر مشہد نہیں جانا ایران کا سفر نامکمل سمجھا جائے گا۔اس لئے ہم لوگ مشہد بھی جانے کے خواہش مند ہیں۔انہوں نے کہا کہ اس موضوع پر حکومت سے گفتگو کروں گا۔چنانچہ ان کی کوشش بارآور ثابت ہوئی اور ہم لوگوں کے پروگرام میں مشہد کو شامل کر دیا گیا۔اس کے لئے صرف ایک دن کا موقع نکالا گیا۔تہران سے مشہد ایک ہزار کیلومیٹر کی دوری پر ہے۔یہ صوبہ خراسان کا مرکزی

مقام ہے اور عظیم زیارت گاہ بھی ہے۔ صنعت وتجارت کے اعتبار سے بھی اس کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ماضی میں یہ صوبہ بہت بڑا تھا، افغانستان، تاجکستان، ترکمانستان اور ازبکستان بھی خراسان میں شامل تھے۔ قدیم خراسان کے مقابلے میں موجودہ خراسان بہت چھوٹا ہے۔ موجودہ صوبہ میں مشہد کے علاوہ سولہ چھوٹے بڑے شہر واقع ہیں۔

مشہد یعنی شہادت کی جگہ، چونکہ یہاں امام رضا کی شہادت کا واقعہ پیش آیا تھا، اس لئے اس کو مشہد کہتے ہیں۔ اس سے پہلے اس کا نام نوقان تھا۔ امام رضا ۲۰۰ھ/۸۱۵ء میں مامون کی دعوت پر خراسان تشریف لائے تھے۔ نیشاپور کے محلہ بلاش آباد میں ان کا قیام ہوا تھا۔ نیشاپور اور طوس میں ان کے درس کا سلسلہ رہا اور ہزاروں افراد نے ان سے استفادہ کیا اور حدیث کی سماعت کی۔ مامون رشید اس زمانہ میں مروٗ میں مقیم تھا۔ اور وہیں اس کو خلافت ملی، چھ برس تک بغداد سے دور اس کو یہاں رہنا پڑا۔ مامون کو جو ایرانی کنیز کے بطن سے تھا، اس کو اس علاقہ سے خاص مناسبت تھی۔ امام رضا نیشاپور سے اس کے پاس مروٗ گئے۔ مامون کو ان سے دلی تعلق تھا، اس نے ان کی ولی عہدی کا اعلان کیا اور اپنی بیٹی ام حبیبہ سے عقد کیا۔ بعد میں کچھ حالات بگڑ گئے۔ کہا جاتا ہے کہ انگور میں زہر دے دیا گیا۔ اور ۱۷ صفر ۲۰۳ھ/۸۱۸ء کو آپ کی شہادت واقع ہوگئی۔ مقبرہ ہارون رشید کے اندر تدفین عمل میں آئی۔ اس طرح مشہد ایران کا محترم اور مقدس شہر بن گیا۔ مسلمان اس کی زیارت کے لئے آتے ہیں۔

امام رضا کی شہادت کے سلسلہ میں جس واقعہ کا تذکرہ عام طور پر کیا جاتا ہے۔ مورخ اسلام اکبر شاہ نجیب آبادی نے زہر کھلانے کے واقعہ کی تردید کی ہے۔

مشہد وادی کشف رود میں واقع ہے، کشف رود طوس کے قریب واقع چشمۂ گیلاس سے نکل کر مشہد سے دوسو کیلو میٹر دور مہری رود میں جا کر ملتا ہے۔ اس کے قریب کی پہاڑیاں آٹھ سے نو فٹ تک بلند ہیں۔

**مشھد کا سفر:** ایران کے دوسرے شہر مشہد کا سفر ہوا۔ مشہد تہران سے تقریبا ایک ہزار کیلومٹر دور ہے۔ اسلئے ہوائی جہاز کے ذریعہ وہاں کا پروگرام طے ہوا۔ صبح میں ناشتہ کے بعد تقریبا

سات بجے ہم لوگ ہوائی اڈہ کیلئے روانہ ہوئے۔ڈومیسٹک ہوائی اڈہ عمر آباد ہوائی اڈہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ ہوائی اڈہ بھی بہت خوبصورت ہے۔ہم لوگ مہان ایرویز کے فلائٹ سے روانہ ہوئے۔ ہوائی اڈہ بہت خوبصورت ہے اور ہر جگہ اسلامی انقلاب کے آثار نظر آتے ہیں۔کہیں بھی عریانیت کا نام ونشان نہیں۔سادہ اور اچھا ماحول نظر آیا۔ہوائی جہاز کے اندر داخل ہوئے وہاں بھی ایرہوسٹیس وغیرہ میں لباس کی پابندی نظر آئی۔ساتھ ہی ہر قسم کے اعلان سے پہلے ٹی۔وی کو بسم اللہ اور اللہ کے نام سے شروع کیا گیا اور تمام اعلانات میں اسلامی احکامات کی حوالہ سے گفتگو کی گئی۔اس طرح ایک اچھا اثر ذہن پر پڑا۔ناشتہ کیا اور تھوڑی ہی دیر کے بعد فلائٹ کے مشہد ہوائی اڈہ پر پہنچنے کا اعلان ہو گیا۔فلائٹ سے باہر آئے تو گلاب کا پھول پیش کر کے استقبال کیا گیا۔ یہ پدیدہ ٹوریزم کی جانب سے پیش کیا گیا۔آگے بڑھے تو ایک اور گروپ سے ملاقات ہوئی۔ یہ حضرات دارالعلوم تعلیم القرآن و السنۃ کے مہتمم حضرت مولانا سید ابراھیم فاضل الحسینی اور اس مدرسہ کے اساتذہ تھے۔ یہ حضرات ہم لوگوں سے ملاقات کیلئے مشہد ہوائی اڈہ پر تشریف لائے تھے۔ان میں سے مولانا حسینی کے ساتھ اکثر اساتذہ اردو بھی بولتے تھے۔انہوں نے پاکستان میں تعلیم حاصل کی اسلئے اردو زبان سے واقف تھے۔ان کی تشریف آوری کی وجہ سے بہت اچھا محسوس ہوا۔ یہ حضرات مشہد میں اس ادارہ کو چلاتے ہیں۔ یہ اہل سنت والجماعت کا مدرسہ ہے۔ یہ دارالعلوم بہت بڑا ہے،انہوں نے بتایا کہ اس ادارے کے چلانے میں کسی طرح کی کوئی دشواری نہیں ہے۔ یہ تمام حضرات آستانہ رضوی تک ہمارے ساتھ رہے۔ان حضرات سے ملاقات کی وجہ سے مزید خوشی حاصل ہوئی۔وقت کی کمی کی وجہ سے وہاں جانے کا موقع نہیں مل سکا جس کا افسوس ہے۔مشہد میں علامہ جوادی آملی کے ریسرچ سینٹر میں ہم لوگوں کا پروگرام تھا۔ یہ سینٹر موسسہ جوادی آملی کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ریسرچ سینٹر بہت بڑا اور عظیم الشان ہے۔اس میں قرآن واحادیث کے علاوہ دیگر اسلامی علوم وفنون پر ریسرچ کا کام ہوتا ہے اور خاص بات یہ کہ اس میں تمام مسلک کے علماء کے خدمات حاصل کئے گئے ہیں۔جلسہ میں علامہ موصوف کے علاوہ ان کے صاحبزادے اور دیگر علماء بھی موجود تھے۔ان کے ساتھ بہت تفصیلی گفتگو ہوئی۔اس کے بعد ہم لوگ آستانہ رضوی کیلئے روانہ ہوئے۔آستانہ رضوی سے منسلک اسلامی

ریسرچ سینٹر پہنچے۔اس کا پورانام بنیاد پژوھشھای اسلامی آستان قدس رضوی ہے۔یہ سینٹر بہت بڑااور بہت ہی اہم ہے۔اس کے ذریعہ بہت سی کتابیں شائع کی گئی ہیں جس میں ہر مسلک کی کتابیں ہیں۔ اس سینٹر میں بھی ہر مسلک کے علماء کو ریسرچ میں لگایا گیا ہے۔ ہر ایک اپنے اپنے مسلک کے مطابق ریسرچ کرتے ہیں۔ پھر آستانہ قدس رضوی پر حاضری ہوئی۔ یہ حضرت امام علی رضاؒ کا روضہ ہے۔ یہ حضرت امام موسیٰ کاظم کے فرزند ہیں اور یہ حضرت امام حسینؓ کے پانچویں پشت میں ہیں۔ یہ نہ صرف ایران بلکہ دنیا میں عظیم الشان یادگاروں میں سے ایک ہے۔ایرانی فن تعمیر کا بے نظیر شاہکار ہے۔اس کے بلند وعالیشان دروازے اور مرصع اور مزین رقبہ میں پھیلی ہوئی عمارت قابل دید ہے۔سونے کے گنبد اور روشنی سے منور دالان اور رنگا رنگ نقش ونگار نے حسن میں مزید اضافہ کردیا ہے، جس کو دیکھنے کے بعد آنکھیں خیرہ رہ جاتی ہیں۔ یقیناً یہ ایرانی فن تعمیر کا ایک بے مثال شاہکار ہے۔ یہ پورا رقبہ تاریخی اور صناعی لحاظ سے قابل دید ہے۔ مشہد سے تقریباً ۲۵ کیلو میٹر کی دوری پر طوس واقع ہے۔ حضرت امام غزالیؒ کا مزار طوس میں ہے۔ مزار پر حاضری اور زیارت کا پروگرام مکمل تھا لیکن چند مجبوریوں کی وجہ سے وہاں جانے کا موقع نہیں مل سکا جس کا بہت افسوس رہا۔ آستانہ قدس رضوی میں لنگر بھی چلتا ہے۔ اس میں کھانے کا انتظام ہے۔ دن کے وقت کھانے کیلئے ہم لوگوں کو اسی میں مدعو کیا گیا۔ ہم لوگوں نے دوپہر کا کھانا وہیں کھایا۔ اس میں کسی طرح کی تخصیص نہیں تھی۔ کھانا بہت عمدہ تھا۔ لنگر خانہ کی عمارت کئی منزلہ ہے۔ ایک وقت میں ہزاروں افراد کھانا کھاتے ہیں۔ ٹیبل کرسی کا انتظام ہے۔ صفائی ستھرائی کا خاص اہتمام ہے۔ اجتماعیت کا پورے طور پر مظاہرہ ہوتا ہے۔

آستانہ قدس رضوی کا احاطہ بہت بڑا ہے۔ اس کے ایک جانب مارکیٹ بھی ہے، جس میں طرح طرح کے سامان ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ آستانہ ہی کا مارکیٹ ہے۔ اس مارکیٹ میں مناسب قیمت پر سامان ملتے ہیں جس سے زائرین فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ آستانہ کی زیارت وفاتحہ کے بعد ہم لوگ بھی مارکیٹ گئے اور سبھوں نے سامان کی خریداری کی۔

**قم کا سفر:** تیسرے شہر قم کا بھی سفر ہوا۔ یہاں ہم لوگ ہوٹل ایشیاڈ میں ٹھہرے۔ یہاں علامہ مرعشی کے کتب خانہ کو دیکھا۔ یہ کتب خانہ بہت بڑا ہے۔ اس کی عمارت نہایت ہی شاندار ہے۔

کتب خانہ کے گیٹ کے اندر علامہ آیت اللہ مرعشی نجفی کا مزار ہے۔اس میں ۳۵ ہزار قلمی کتابیں ہیں۔اس کا شمار دنیا کے مشہور کتب خانہ میں ہوتا ہے۔یہ کتب خانہ علامہ آیت اللہ مرعشی نجفی نے قائم کیا۔یہ ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۷ء میں نجف میں پیدا ہوئے اور ۱۹۹۰ء میں قم میں وفات پائی۔یہ ایران کے مشہور عالم اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔انہوں نے بہت تلاش کے بعد نادر مخطوطات کو منہ مانگی قیمت دے کر حاصل کیا۔کتب خانہ میں تمام جدید ترین سہولیات فراہم ہیں۔کتب خانہ کے متولی علامہ سید محمود مرعشی سے ملاقات ہوئی جو علامہ مرعشی نجفی کے صاحبزادے اور وہاں کے بہت مشہور عالموں میں سے ہیں۔اس لائبریری کا مشاہدہ کرنے کے بعد ایران میں اسلامی علوم وفنون کے ساتھ لوگوں کی دلچسپی اور حکومت کے تعاون کا مظاہرہ ہوتا ہے۔میرے ذریعہ سوال کرنے پر انہوں نے بتایا کہ اس لائبریری کا خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری سے بھی رابطہ ہے۔شہر قم میں امام علی رضاؑ کی بہن فاطمہ کے روضہ پر بھی حاضری ہوئی، جو معصومہ قم کے لقب سے مشہور ہیں۔یہ روضہ بھی نہایت ہی آراستہ اور مزین ہے اور شان وشوکت کے اعتبار سے بہت عظیم ہے۔خوبصورت بیل بوٹوں کے ذریعہ نقش ونگار بنا کر اس کے حاشیوں کو مزین کیا گیا ہے، جو ایرانی نقاشی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔قم ایک علمی اور تاریخی جگہ ہے۔یہاں بہت سے تعلیمی ادارے ہیں جس میں ایران کے علاوہ دیگر ممالک کے طلباء بھی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔یہاں ایک ہندوستانی طالب علم سے ملاقات ہوئی جس نے بتایا کہ ہندوستان کے بہت سے طلباء یہاں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

**ایران کا ماحول:** ایران کا ماحول بہت بہتر ہے۔ان تمام شہروں کو قرآن واحادیث اور اکابر کے اقوال سے سجایا گیا ہے، جس سے شہر کے حسن میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔ایران میں بڑے بڑے تعلیمی ادارے، مدارس اسلامیہ (حوزہ علمیہ) قائم کئے گئے ہیں۔ساتھ ہی ریسرچ سینٹر کا بھی قیام عمل میں آیا ہے، جس میں اسلامی علوم وفنون کے علاوہ سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں بھی اہم کام ہو رہا ہے اور نہایت ہی اہم بات یہ ہے کہ سائنس داں، انجینئر وغیرہ دینی مزاج رکھتے ہیں، ساتھ ہی تقوی اور پرہیز گاری سے آراستہ ہیں اور انسانیت کے جذبہ سے سرشار ہیں۔میں نے صوبہ بہار اور ہندوستان کے مدارس کے خدمات سے انہیں واقف کرایا اور بہار کے مدارس

اور یونیورسیٹیوں میں فارسی زبان کی تعلیم سے انہیں روشناس کرایا۔توقع ہے کہ یہ تعلقات مزید استوار ہونگے۔فارسی زبان وادب، اسلامی وحدت اور اخوت اسلامی کے سلسلے میں ایران کا کام مشعل راہ ثابت ہوگا۔میں نے دہلی میں واقع ایران کلچر ہاؤس کے عہدہ داران بالخصوص ڈاکٹر کریم نجفی اور ڈاکٹر علی رضا قزوہ کا بھی شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے ایران کے سفر کیلئے موقع فراہم کرایا۔

ایران ایک مالدار ملک ہے۔اس میں تیل کا بڑا ذخیرہ ہے۔گرچہ اس ملک پر طرح طرح کی پابندیاں عائد ہیں پھر بھی اس ملک میں خوشحالی کے آثار پورے طور پر نمایاں ہیں۔

ایرانی کھانے میں چاول کو خاص اہمیت حاصل ہے۔اس کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے۔چلو کباب مشہور ہے۔چلو کے معنی چاول ہیں یعنی چاول اور کباب۔چاول کو کباب کے ساتھ کھانے کا عام رواج ہے۔اس میں دال یا شوربہ کا استعمال نہیں کیا جاتا ہے۔طرح طرح کے کباب کھانے میں استعمال کئے جاتے ہیں۔بڑے جانور کا کباب،خصی کا کباب،مرغ کا کباب،مچھلی کا کباب وغیرہ۔ ہندوستانی انداز کی روٹی نظر نہیں آئی۔روٹی کا استعمال ہوتا ہے لیکن وہ روٹی پتلی اور سخت ہوتی ہے۔سلاد اور سوپ کا استعمال کثرت سے کیا جاتا ہے۔

ایران میں عریانیت نہیں ہے۔انقلاب کے بعد پردے پہ خاص توجہ دی گئی ہے۔اب ہر طرف اسلامی شعار کے مطابق کپڑے استعمال کئے جاتے ہیں جس کی وجہ سے حسن میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔

ایران کے شہروں میں پوسٹر،ایڈس،تصاویر وغیرہ نظر نہیں آئے۔البتہ ان کی جگہ پر قرآن، احادیث، بزرگان دین کے اقوال اور شعراء کے اشعار موقع کے اعتبار سے تحریر کئے گئے ہیں جو خوبصورت فارسی رسم الخط میں ہیں،جس سے عبرت،نصیحت اور اخلاقیات کا درس ملتا ہے۔

ٹی۔وی پر بھی عریانیت کا مظاہرہ نہیں ہے۔ایسا کوئی سیریل نظر نہیں آیا جس سے اخلاق پر برا اثر پڑتا ہو۔اس میں انسانیت اور اخلاقیات پر مبنی سیریل دکھائے جاتے ہیں۔نیوز ریڈر میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی جس سے عریانیت کا مظاہرہ ہوتا ہو۔

ایران خوبصورت ملک ہے۔پہاڑوں کی کثرت ہے۔پہاڑوں کے درمیان سے گزرتا ہوا

روڈ، دونوں جانب پارک اور سردی کے زمانے میں برف سے ڈھکی ہوئی گھاس، پیڑ پودوں پر پتے کی جگہ برف کا بسیرا، نہایت ہی خوبصورت منظر پیش کرتا ہے، جس کی وجہ سے دل و دماغ میں فرحت اور مسرت کا احساس ظاہر ہوتا ہے۔

ایران کی کرنسی ایرانی ریال اور تومان ہے۔ اس کی قیمت عام مارکیٹ میں بہت ہی کم ہے۔ ہندوستان کے قریبی ملک نیپال سے بھی کم۔ ۱۰ ریال کا ایک تومان اور ۱۰۰ ریال کا دس تومان ہوتا ہے۔ ہندوستانی روپئے کے اعتبار سے ایک روپیہ ۲۵ تومان اور ۱۰۰ روپیہ پچیس سو تومان کے برابر ہے۔ اگر ایرانی تومان کا حساب کیا جائے تو ۱۰۰ تومان چار ہندوستانی روپیہ کے برابر ہے۔ اس طرح وہاں کے سامان کی قیمت بھی اسی انداز پر ہے۔ ہوٹل امیر کی لسٹ کے مطابق کافی، چائے اور کیک کی قیمت اس طرح ہے۔۔۔ کافی ایک گلاس ستائیس ہزار تومان، چائے پینتالیس سو تومان اور کیک چودہ ہزار تومان۔

ایران ایک خوبصورت ملک ہے۔ اس کے ہر شہر میں خوبصورتی کے آثار نمایاں ہیں۔ صفائی ستھرائی پر خصوصی توجہ ہے۔ کہیں بھی کوڑا کچڑا نظر نہیں آیا۔ ہر طرف صفائی ستھرائی کی وجہ سے شہر میں خوبصورتی ہی خوبصورتی نظر آئی۔

ایران کے بازاروں میں فوٹ پاتھ پر دکان لگانے کا رواج نہیں ہے۔ دکانیں سلیقہ سے بنائی گئی ہیں۔ اس سے خوبصورتی کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

موجودہ حالت میں ایران میں مساجد پر مینار بنانے کا رواج نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایران کے تینوں شہروں میں کسی بھی مسجد پر اونچے مینار کو نہیں دیکھا۔ البتہ مسجدوں میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا۔ مشہد میں امام رضا کے آستانہ پر ہزاروں لوگوں کو نماز پڑھتے اور تلاوت کرتے ہوئے دیکھا۔ مغرب کی نماز کے وقت ہم لوگ معصومہ قم کے مزار پر پہنچے تو وہاں مغرب کی نماز ہو رہی تھی۔ ہزاروں افراد کو مغرب کی نماز کو جماعت کے ساتھ پڑھتے ہوئے دیکھا۔ البتہ ان دونوں جگہوں پر بھی کوئی مینار نہیں دیکھا جس کے ذریعہ مسجد کی شناخت ہو سکے۔

مشہد میں امام علی رضاؑ اور قم میں معصومہ قم فاطمہ کے آستانہ کو روضہ اور حرمین کے نام سے

پکاڑتے ہیں جس سے التباس کا احساس ہوتا ہے۔ ایران جیسے وسیع الظرف وحدت اسلامی کے علمبردار ملک کو اس پر توجہ کی ضرورت ہے۔

امام خمینیؒ کے مکان میں جو ابھی ایک میوزیم کی شکل میں ہے اس میں کسی نے ایک تصویر رکھ دی ہے۔

یہ تصویر وہاں پہلے نہیں تھی۔ کسی نے اس کے بارے میں من گھڑت باتیں بیان کردی۔ شاید ایسا اسلئے ہے کہ وہاں کوئی ماہر گائیڈ نہیں ہے۔ امام خمینی سبھی مسلک کے لوگوں کیلئے محترم ہیں۔ وحدت اسلامی کے علمبردار ملک کیلئے اس پر خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔

ایران نے سائنس اور ٹکنالوجی کو یونیورسیٹی اور دیگر تعلیمی اداروں سے جوڑا ہے اور اس میں کافی ترقی کی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ سائنس اور ٹکنالوجی کے ماہرین کو تقوی، طہارت اور انسانی قدروں سے جوڑا ہے اس کیلئے یہ ملک قابل ستائش ہے اور سبھوں کیلئے مشعل راہ ہے۔ ایران وحدت اسلامی کا علمبردار ہے اور اس نے تمام لوگوں کو اسلامی وحدت سے جوڑنے کی کوشش کی ہے ساتھ ہی اس کیلئے ساتھ مل بیٹھ کر اتفاق واتحاد کیلئے کوئی نقطہ تلاش کرنے کی اہمیت پر زور دیا ہے خاص طور پر ایسے وقت میں جب کہ ملت اسلامیہ منتشر ہے اور فروعی اختلاف میں الجھ کر اپنی طاقت کو گنوا رہی ہے جبکہ اس کے پاس وحدت کلمہ کی بنیاد پر وحدت اسلامی کو آگے بڑھانے کیلئے پوری گنجائش موجود ہے ساتھ ہی اس کے پاس رہنمائی کیلئے قرآن اور احادیث موجود ہیں۔ ایسی صورت میں ایران کے وحدت اسلامی کے پیغام کے ساتھ جڑ کر وحدت اسلامی کو مضبوط کرنے کی سخت ضرورت ہے اور اس پیغام کو آگے بڑھانے کیلئے ہم ملک ایران، دیگر ممالک اور اپنے ملک کے علمائے کرام اور تنظیم کو مبارکباد پیش کرتے ہیں جو اس کیلئے کوشاں ہیں۔ اتفاق واتحاد میں طاقت ہے اور اتفاق واتحاد اور وحدت اسلامی کو مستحکم کرنا موجودہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔

(۳)

# سی بی ایس ای نظام تعلیم بہار کے اسکول اور مدارس میں-ایک تجزیاتی مطالعہ

سی بی ایس ای سنٹرل بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن کا مخفف ہے۔ یہ نظام تعلیم مرکزی حکومت کے ذریعہ تیار کردہ ہے۔ اور ملک کے تمام ریاستی حکومت نے اس نظام تعلیم کو قبول کیا ہے۔ اوراس طرح اب سی بی ایس ای پیٹرن پر ہائی اسکول تک کے اداروں میں تعلیم دی جاتی ہے اوراسی کے مطابق امتحانات منعقد کرائے جارہے ہیں۔

سی بی ایس ای نظام تعلیم کو مرکزی حکومت نے مرتب کیا ہے، جس میں صرف ۵۰۰ نمبرات کے مضامین ہیں، جس کی وجہ سے تمام مضامین کو پڑھانے میں دشواری پیش آرہی ہے۔ پہلے ریاستی حکومت آزادانہ طور پر ریاست کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے نصاب تعلیم مرتب کراتی تھی۔ اب مرکزی نظام تعلیم کے ماتحت اپنا نصاب تعلیم مرتب کرانے کا کام انجام دیتی ہے، جس کے نتیجہ میں اس میں دشواری پیش آرہی ہے۔ پہلے ریاستی حکومت کے ذریعہ بنائے گئے نصاب تعلیم کے مطابق تعلیم دی جاتی تھی اس نصاب تعلیم کو ریاستی حکومت کے ذریعہ تیار کیا جاتا رہا ہے چونکہ اس نصاب تعلیم کو صوبہ میں تیار کیا جاتا تھا، اس لئے اس میں صوبہ میں بسنے والے ہر مذہب کے لوگوں کے مذاہب اور جذبات کی رعایت کی جاتی تھی۔ ان کے زبان کی حفاظت، ثقافت اور کلچر کی حفاظت، دین ودھرم کی رعایت، غرض نصاب

تعلیم کو مرتب کرتے وقت تمام باتوں کو ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ اور اسی کے اعتبار سے مضامین اور نمبرات بھی متعین کئے جاتے تھے۔ جیسے صوبہ بہار کو سامنے رکھئے۔ صوبہ بہار کی ریاستی حکومت کے ذریعہ مرتب کردہ نصاب تعلیم پر نظر ڈالئے۔ اس نصاب تعلیم میں مسلم سماج کے زبانوں کی رعایت پوری طرح کی گئی، اردو زبان کو مادری زبان شمار کرتے ہوئے اس کو لازمی مضمون کی زمرہ میں رکھا گیا، مسلم سماج کا تعلق دیگر دوزبانوں سے بھی ہے۔ یہ ان کی ثقافتی زبان ہے، ایک فارسی اور دوسرے عربی۔ عربی وفارسی میں سے اول الذکر ایک قدیم زبان ہے۔ قرآن وحدیث عربی زبان ہے۔ اس کے علاوہ تفسیر، فقہ اور عقائد کی کتابیں عربی میں ہیں۔ اس طرح عربی زبان سے ان کا رشتہ بہت مضبوط ہے۔ ثانی الذکر فارسی زبان یہ ثقافتی زبان ہے یہ ہندوستان کی سرکاری زبان رہ چکی ہے۔ اس میں ایک بڑا علمی، اور ثقافتی ورثہ موجود ہے۔ ان دونوں زبانوں کی وجہ سے اردو زبان میں پختگی آتی ہے۔ اس طرح فارسی زبان سے بھی مسلم سماج کا رشتہ مضبوط ہے۔ اسلئے اختیاری لازمی کے گروپ میں عربی وفارسی میں سے کوئی ایک مضمون اور اکسٹرا میں ان دونوں میں سے کوئی ایک زبان رکھنے کی اجازت ہوتی تھی۔ اور اس کے لئے باضابطہ 100 نمبرات مقرر کئے جاتے تھے، یہ مجموعی نمبرات میں شامل کئے جاتے تھے، یہی نہیں بلکہ ہر اسکول میں اردو، فارسی اور عربی کے اساتذہ بحال کئے جاتے تھے۔ غرض ہر اسکول میں اردو فارسی اور عربی کی باضابطہ تعلیم ہوتی تھی۔ ہائی اسکول میں ان تینوں مضامین کے طلبا ہوتے تھے۔ اور ہر مسلم طالب علم لازمی مضمون میں اردو اور اختیاری میں فارسی یا عربی اور اکسٹرا میں عربی یا فارسی رکھتا تھا۔ اور ان کے دونوں نمبرات مجموعی نمبرات میں شامل ہوکر نتیجہ شائع کیا جاتا تھا۔ جب یہی طلبا ہائی اسکول سے پاس کرکے کالج اور یونیورسٹی میں جاتے تھے۔ تو وہاں بھی اردو لازمی مضمون اور فارسی یا عربی کو اختیاری مضمون کے طور پر لیا کرتے تھے۔ اس طرح کالج اور یونیورسٹی میں اردو کے شعبہ کے ساتھ فارسی اور عربی کے شعبے بھی ہرے بھرے رہتے تھے۔ اردو کے لکچرر/ پروفیسر بھی بحال ہوتے تھے۔ اور فارسی اور عربی کے بھی۔ یہی سلسلہ آج تک جاری رہا۔

میں نے ۱۹۷۰ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا ابھی میٹرک کا مارکس شیٹ میرے سامنے ہے۔ مارکس شیٹ کے مطابق مضامین اور نمبرات کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

## لازمی مضامین

| | | |
|---|---|---|
| (۱) | قومی زبان ہندی: | ۱۰۰ |
| (۲) | مادری زبان اردو: | ۱۰۰ |
| (۳) | انگلش i۔ | ۱۰۰ |
| (۴) | انگلش ii۔ | ۱۰۰ |
| (۵) | مطالعہ سماج: | ۱۰۰ |
| (۶) | سائنس: | ۱۰۰ |

## اختیاری مضمون

| | | |
|---|---|---|
| (۷) | معاشیات: | ۱۰۰ |
| (۸) | فارسی: | ۱۰۰ |
| (۹) | تاریخ: | ۱۰۰ |

## اضافی مضمون

| | | |
|---|---|---|
| (۱۰) | عربی: | ۱۰۰ |
| (۱۱) | مجموعی نمبرات: | ۱۰۰۰ |

مذکورہ بالا تفصیلات کو دیکھئے، طلبا اردو، فارسی، عربی تینوں مضامین پڑھتے تھے اور تینوں کا امتحان دیتے تھے۔ اور تینوں مضامین کے نمبرات مجموعی نمبرات میں شامل کرنے کے بعد نتیجہ شائع کیا جاتا تھا۔ اس نصاب تعلیم میں 1000 نمبرات کے مضامین نصاب میں شامل تھے۔

یہی حالت آئی اے میں بھی رہی، آئی اے میں نے ۱۹۷۸ء میں پاس کیا۔ مارکس شیٹ میرے سامنے ہے۔ اس میں مضامین اور نمبرات کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

| | |
|---|---|
| راشٹریہ بھاشا: | ۱۰۰ |
| ورنا کولر: | ۱۰۰ |
| انگلش: | ۱۰۰ |

| | |
|---|---|
| موڈرن لنگویج: | ۲۰۰ |
| کلاسیکل لنگویج: | ۲۰۰ |
| پولٹیکل سائنس: | ۲۰۰ |
| سوشولوجی: | ۲۰۰ |
| ٹوٹل: | ۱۱۰۰ |

آئی اے میں 1100 نمبرات کے مضامین نصاب تعلیم میں شامل تھے۔

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ واضح ہے کہ طلبا کو ہندی، انگریزی، اردو، فارسی اور عربی تمام زبانوں کو پڑھنے کا موقع میسر آتا تھا۔ اوران مختلف زبانوں کی واقفیت سے ان میں آگے کی تعلیم کو جاری رکھنے میں آسانی ہوتی تھی۔ ساتھ ہی مذکورہ بالا تمام مضامین کے اساتذہ اسکول اور کالج میں بحال ہوتے تھے۔ اس طرح ملازمت کے مواقع بھی حاصل ہوتے تھے۔ مذکورہ بالا تمام شعبے آباد رہتے تھے۔

سنٹرل بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن (C.B.S.E) کا نصاب تعلیم مرکز میں لاگو ہے۔ اس نصاب تعلیم میں صرف 500 نمبرات پر مشتمل مضامین کو شامل کیا گیا۔ یہ نصاب تعلیم ممکن ہے مرکزی حکومت کی ضرورت کے مطابق ہو لیکن ریاست میں مذکورہ بالا ضرورتوں کو پورا کرنے سے قاصر ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کا سب سے برا اثر زبان پر پڑا ہے۔ سی بی ایس ای کے نصاب تعلیم میں مضامین اور نمبرات کی تفصیل حسب ذیل ہے۔ اس میں درج تمام مضامین لازمی ہیں۔

(۱) انگریزی: ۱۰۰ نمبر

(۲) لنگویج میں کوئی دو زبان ۱۰۰ نمبر۔ اس میں سے ایک زیادہ نمبرات والے مضمون کو ۱۰۰ کامان کر ڈویزن میں شامل کیا جائے گا۔ اور کم نمبر والے ایک مضمون کو مجموعی نمبرات کے بعد مارکس شیٹ کے نمبر شمار ٦ میں درج کر دیا جائے گا۔ اس نمبر کا شمار نہیں ہوگا۔ صرف مارکس شیٹ میں درج ہوگا۔

| | | |
|---|---|---|
| (۳) | حساب: | ۱۰۰ |
| (۴) | سائنس: | ۱۰۰ |

(۵) سوشل سائنس: ۱۰۰

ٹوٹل: ۵۰۰

سی بی ایس ای کا مذکورہ بالا نظام تعلیم ریاستی ضرورت کے مطابق نہیں ہے۔اس لئے ریاستی حکومت نے اپنے طور پر نصاب تعلیم میں کچھ ترمیم کرکے بہار سکنڈری بورڈ میں لاگو کیا،گرچہ یہ ترمیم بھی صرف اعتراض سے بچنے کی ایک کوشش ہے۔جس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

بہار بورڈ کلاس x-ix (+2)

(۱) مادری زبان: ۱۰۰۔جیسے اردو، ہندی، بنگلہ، میتھلی وغیرہ

(۲) دوسری ہندوستانی زبان: ۱۰۰۔اس میں مندرجہ ذیل تین زبان میں سے کوئی ایک زبان کو رکھا جاسکتا ہے۔

سنسکرت، راشٹریہ بھاشا، متبادل انگریزی

(۱) حساب: ۱۰۰

(۲) سائنس: ۱۰۰

(۳) سوشل سائنس: ۱۰۰

کل: ۵۰۰

اختیاری مضامین: عربی، فارسی، Eco، ہوم سائنس وغیرہ، اس مضمون کا نمبر نہیں جوڑا جائے گا لیکن مارکس شیٹ میں نمبر درج رہے گا۔

کلاس: xi-xii

(۱) پہلی زبان: ۱۰۰۔اردو، ہندی، انگریزی وغیرہ

(۲) دوسری زبان: ۱۰۰۔(الف) ہندی ،۵۰ نمبر سب کے لئے (ب) اختیاری (۵۰ نمبر) اردو، ہندی، انگریزی وغیرہ اس میں فارسی/عربی نہیں ہے۔

ریاستی حکومت نے سی بی ایس ای نصاب تعلیم کو ہائی اسکول میں لاگو کیا۔اس میں درج نکات کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔درجہ ۹/اور ۱۰/میں کوئی طالب علم جس کی مادری زبان ہندی ہے اسے

کو پانچ پرچے کا امتحان دینا ہے۔ اس کے نمبرات ۵۰۰ ہوں گے۔ اس کی مادری زبان ہندی ہے۔ اس نے (۱) کے مطابق ہندی ۱۰۰ کا لیا۔ اور نمبر (۲) کے مطابق ایک ہندوستانی زبان کو لینا ہے۔ اس نے سنسکرت ۱۰۰ کا لے لیا۔ بقیہ نمبر ۳ / ۴ / اور ۵ ر کے مطابق حساب سائنس اور سوشل سائنس 100+100+100 لے لیا۔ اس طرح زبان میں اس کو ہندی اور سنسکرت یعنی مادری اور ثقافتی دونوں زبانوں کو پڑھنے کا موقع ملا۔ دونوں مضامین لازمی ہیں۔ اس لئے دونوں کے نمبرات مجموعی نمبرات میں شامل ہوں گے۔ اور انہیں ڈویزن ملے گا۔ اب ایک اس طالب علم کو دیکھئے جس کی مادری زبان اردو ہے۔ نمبر (۱) کے مطابق اس نے مادری زبان اردو ۱۰۰ نمبر کا لیا۔ نمبر ۲ کے مطابق تین زبانوں یعنی سنسکرت، راشٹر یہ بھاشا اور متبادل انگریزی میں سے کوئی ایک رکھنا ہے۔ اس لئے یہاں راشٹر یہ بھاشا ہندی رکھنا اس کی مجبوری ہے۔ جو ۱۰۰ نمبر کا ہے۔ اس کے بعد اس نے حساب، سائنس، سوشل سائنس 100+100+100 رکھا۔ 500 نمبرات مکمل ہو گئے۔ اب اختیاری مضمون میں عربی، فارسی ہے۔ یہ اختیاری ہے یہ اختیاری لازمی ہوتا تو اس کا نمبر شمار ہوتا اور طلبا پڑھنے پر مجبور ہوتے لیکن ایسا نہیں ہے۔ اگر اس کو لازمی کیا جاتا تو مجموعی نمبرات 600 ہو جائیں گے جبکہ صرف 500 کے پانچ مضامین کو پڑھنا ہے۔ اسلئے طلبا/ طالبات عربی، فارسی نہیں لیتے ہیں۔ اگر لیتے بھی ہیں تو بڑی مشکل سے، چونکہ ان کے نمبرات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اس طرح مسلم طلبا و طالبات کو فارسی/عربی زبان سے دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے یہی کچھ حال درجہ گیارہویں اور بارہویں کا ہے۔ اس میں نمبر (۱) کے مطابق کسی نے پہلی زبان ۱۰۰ نمبر کا اردو رکھ لیا۔ تو ۲ کے (الف) کے مطابق ہندی 50 نمبر کا رکھنا لازمی ہے۔ اس نے 50 نمبر کی ہندی رکھ لیا۔ اسکے بعد (ب) میں اختیاری مضمون میں عربی/ فارسی ہے ہی نہیں، کہ مسلم طلبا اس کو رکھیں گے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اردو، ہندی، انگریزی وغیرہ میں سے کسی ایک زبان 50 نمبر کا رکھنا اس کی مجبوری ہے۔ اس طرح درجہ گیارہویں اور بارہویں میں مسلم طلبا کو عربی/ فارسی زبان پڑھنے سے روکنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کا نتیجہ سامنے ہے کہ جب نیچے ہی درجہ میں طلبا فارسی/عربی ثقافتی زبان کو نہیں پڑھیں گے، تو کالج اور یونیورسٹی میں کہاں سے طلبا ملیں گے۔ چنانچہ اخبار میں بیان آچکا ہے کہ کسی مضمون میں دس طلب

سے کم ہوں گے وہاں اس ڈیپارٹمنٹ کو بند کردیا جائے گا۔ یہ تلوار اردو/ فارسی/عربی تینوں ڈیپارٹمنٹ پر لٹک رہی ہے۔ کسی وقت بھی اس شعبوں میں سے جس میں طلبا کم ہوں گے ان کو بند کردیا جائے گا۔ اس طرح اس کی زد میں بہت ممکن ہے اردو زبان بچ جائے لیکن فارسی اور عربی ڈیپارٹمنٹ پوری طرح آئیں گے۔ ہائی اسکول میں پہلے اردو، عربی، فارسی کے اساتذہ الگ الگ اساتذہ بحال ہوتے تھے۔ پھر اس میں کمی کردی گئی۔ ایک استاد اردو کے اور ایک استاد فارسی/عربی کے بحال کئے جانے لگے۔ موجودہ حالت میں عربی کے لئے استاذ کی بحالی نہیں ہوتی ہے۔ کسی کسی اسکول میں فارسی کے عہدے ہیں، چند سال میں طلبا کی کمی کی وجہ سے یہ عہدے بھی ختم ہوجائیں گے۔ یہی کچھ حال کالج اور یونیورسٹی کا ہوگا۔ طلبا کی کمی کی وجہ سے سارے ڈیپارٹمنٹ ختم ہوجائیں گے۔ نہ ڈیپارٹمنٹ رہے گا، نہ پروفیسر، لیکچرر بحال ہوں گے۔ مذکورہ بالا تفصیل کے مطالعہ سے آپ نے محسوس کیا کہ سی بی ایس ای نظام تعلیم کے لاگو ہونے کے بعد اسکول میں فارسی، عربی زبانوں کی تعلیم ختم ہورہی ہے اس کی وجہ سے مسلم طلبا اپنی مذہبی اور ثقافتی زبان سے دور ہوتے جارہے ہیں، ساتھ ہی ان زبانوں میں بحالی کے مواقع بھی ختم ہوتے جارہے ہیں۔

اب مدارس ملحقہ پر نظر ڈالئے صوبہ بہار میں مدارس ملحقہ کا مستقل نظام ہے۔ ان مدارس ملحقہ کی بنیاد مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ ہے، جو صوبہ بہار کی راجدھانی پٹنہ میں واقع ہے۔ اس مدرسہ کو بانی مدرسہ الحاج سید جسٹس نور الہدیٰ نے اپنے والد کے نام پر قائم کیا۔ اور ۱۹۱۹ء میں اس مدرسہ کو سرکاری تحویل میں دیدیا۔ اس کا نصاب تعلیم شروع ہی سے دینی اور عصری مضامین پر مشتمل رہا۔ اور اس کا نصاب تعلیم مدرسہ اکزامنیشن بورڈ میں لاگو کیا گیا۔ اس کا نصاب تعلیم مدارس کے سلسلہ میں بہت مقبول ہوا۔ چونکہ اس کو ملک کے مشاہیر علمائے کرام اور دانشوران نے مدون کیا تھا۔ اسی مدرسہ کی وجہ سے ۱۹۲۲ء میں بہار مدرسہ اکزامنیشن بورڈ قائم ہوا۔ مدارس کی تعلیم کے فروغ اور اسناد کو ملازمت کے لئے منظوری کے پیش نظر صوبہ کے مدارس کو بہار مدرسہ بورڈ سے ملحق کرنے کی منظوری دیدی گئی۔ یہ سلسلہ چلتا رہا۔ یہاں تک کہ ۱۹۷۸ء میں مدرسہ اکزامنیشن بورڈ کو تحلیل کرکے بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کردیا گیا اور اس کی نصاب کو جدید تر کردیا گیا، اسلامی اور مشرقی علوم وفنون کے ساتھ

اسکول، کالج اور یونیورسٹی کے جملہ مضامین کواس میں شامل کر دیا گیا۔اوراس طرح اس کے اسناد کو باضابطہ گزٹ کے ذریعہ داخلہ اور بحالی کے لئے مساوی قرار دیا گیا۔اس طرح بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے اسناد کے مساوات کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

وسطانیہ: مڈل

فوقانیہ: میٹرک

مولوی: آئی اے

عالم: بی اے

یہ مساوات داخلہ میں بھی ہے۔اور بحالی میں بھی ،اس کا نصاب تعلیم جدید تر ہے۔

انسان فطری طور پر جلد باز واقع ہوا ہے۔اسکے سامنے کوئی تبدیلی آتی ہے تو اس سے وہ فوراً متاثر ہوتا ہے۔ایسا ہی کچھ معاملہ نصاب تعلیم کے ساتھ بھی ہے۔ہندوستان میں سب سے زیادہ تجربہ محکمہ تعلیم میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ہر دو چار سال پر انداز تعلیم اور نصاب تعلیم میں تبدیلی ہوتی ہے۔جب اسکول، کالج اور یونیورسٹی کے نصاب تعلیم میں تبدیلی ہوتی ہے تو یہ آواز اٹھنے لگتی ہے کہ بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ کے نصاب تعلیم میں بھی ترمیم کی جائے۔اوراس کو اسکول، کالج اور یونیورسٹی کے مطابق بنایا جائے۔حالانکہ مشورہ دینے والوں کو اس پر دھیان دینا چاہیے کہ دونوں ادارے الگ الگ ہیں، مدارس کی تعلیم کا تقاضہ کچھ اور ہے۔اور اسکول کی تعلیم کا تقاضہ کچھ اور۔دونوں کے مقاصد الگ الگ ہیں۔سی بی ایس ای کے نصاب تعلیم کے لاگو ہونے کے بعد ایسا ہی معاملہ سامنے آیا، ایک جانب سے یہ آواز آئی کہ مدارس ملحقہ کے نصاب تعلیم کو بھی سی بی ایس ای کے انداز پر کر دیا جائے۔ جب میں نے جائزہ لیا تو یہ محسوس ہوا کہ سی بی ایس ای کے نصاب تعلیم کو بہار مدرسہ بورڈ کے نصاب تعلیم پر منطبق کرنے میں دشواری ہے۔چونکہ دونوں کی ضرورت الگ ہے۔دونوں کے مقاصد الگ ہیں، سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بہار مدرسہ بورڈ کا نصاب تعلیم مقابلۃً بہت بہتر ہے۔اس کو حکومت نے مساوات کا درجہ بھی دیا ہے۔اس کے ذریعہ تمام مضامین کو اچھی طرح درس وتدریس کے مواقع بھی ہیں۔بہار مدرسہ بورڈ کے نصاب تعلیم میں عصری مضامین سی بی ایس ای سے زیادہ ہیں،

مساوات میں مجوزہ نمبرات کا موازنہ نہیں کیا جاتا ہے۔ بلکہ مضامین کو دیکھا جاتا ہے۔ ساتھ ہی اس پر نظر ہوتی ہے کہ اس کے پڑھنے والے طلبا میں معیار پیدا ہوگا کہ نہیں، یہی وجہ ہے ریاستی حکومت نے بھی پورے طور پر مرکزی نصاب کو لاگو نہیں کیا ہے تو پھر کوئی مجبوری بھی نہیں ہے کہ بہار مدرسہ بورڈ کے نصاب کو بھی سی بی ایس ای کے مطابق کیا جائے۔

سی بی ایس ای کے نصاب تعلیم کا مطالعہ آپ اسکول کے ضمن میں کر چکے۔ اس نصاب تعلیم کو لاگو ہونے کے بعد اسکول میں عربی، فارسی کا جو حشر ہوا وہ آپ کے سامنے ہے۔ اگر مدارس ملحقہ کے نصاب تعلیم کو سی بی ایس ای کے مطابق کیا جائے تو عربی/ فارسی کے ساتھ اسلامیات اور دینیات کو بچانا مشکل نظر آتا ہے۔ پھر مدارس ملحقہ کا کیا حشر ہوگا۔ آپ خود اندازہ کر لیں۔

یہاں اس حقیقت کی وضاحت کو خاص اہمیت حاصل ہے کہ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ کے نصاب تعلیم کو جو بہار مدرسہ اکزامنیشن بورڈ میں جاری کیا گیا، بانی مدرسہ کی کوشش سے انگریز حکومت نے اس کے اسناد کو منظوری دی تھی۔ اس منظوری کے اعتبار سے فاضل سند رکھنے والے کی ہائی اسکول میں بحالی ہوتی تھی۔ خواہ وہ کوئی فاضل ہو۔ فاضل حدیث ہو، فاضل فقہ ہو، فاضل تفسیر ہو، فاضل عربی ہو، فاضل فارسی ہو، فاضل اردو ہو، ہائی اسکول میں بحالی کے لئے صرف فاضل پاس کی ضرورت ہوتی تھی۔ یہ سلسلہ تقریباً ۱۹۷۵ء تک جاری رہا۔ پھر حکومت نے یہ شرط لگائی کہ ہائی اسکول میں اردو کے عہدہ پر اردو آنرس کے ساتھ فاضل اردو پاس کی بحالی ہوگی، فارسی کی جگہ پر فارسی آنرس کے ساتھ فاضل فارسی پاس کی بحالی ہوگی۔ اس کے لئے بہار مدرسہ بورڈ کے نصاب تعلیم میں ۱۹۷۸ء میں تبدیلی کی گئی، اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ صرف فاضل اردو میں پڑھنے والے طلبا رہ گئے، اس کے بعد کچھ فاضل فارسی میں۔ چونکہ ہائی اسکول میں انہیں دونوں کے ذریعہ بحالی ہوتی ہے۔ حدیث، تفسیر، فقہ، عربی ادب کی ہائی اسکول یا کسی سرکاری ادارہ میں کوئی عہدہ نہیں ہے اس لیے حدیث، تفسیر، مضامین میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کو ملازمت نہیں ملے گی۔ اسلئے ان مضامین میں طلبا داخلہ نہیں لیتے ہیں اسکے نتیجہ میں فاضل حدیث، تفسیر، فقہ، عربی ادب، وغیرہ کی تعلیم مدارس ملحقہ میں نہیں ہوتی ہے۔

بہار مدرسہ بورڈ کا نصاب تعلیم بہت اچھا ہے۔ آرٹس کے مضامین میں مدارس کے لئے اس

سے بہتر نصاب تعلیم نہیں مدون ہوسکتا ہے۔ اس میں مناسب انداز پر تعلیم کا انتظام ہوجائے، تو طلبا ہر میدان میں نمایاں کارنامے انجام دیں گے۔ جہاں تک سائنس کی بات ہے تو فوقانیہ تک سائنس نصاب میں شامل ہے اس کو مولوی میں لاگو کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے نصاب تعلیم کو تیار کرتے وقت اس کی رعایت ضروری ہے کہ مدارس کا اپنا تشخص باقی رہے۔ نصاب تعلیم کو مشتہر کیا جائے اور صوبہ کے مشاہیر علمائے کرام اور دانشوران سے مشورہ طلب کیا جائے پھر اس کو مکمل کیا جائے تا کہ نصاب تعلیم میں کوئی کمی نہ رہے۔

جہاں تک اسکول میں عربی رفارسی کی بات ہے تو اس کے لئے ریاستی حکومت سے اپیل کی ضرورت ہے کہ بہار اسکول بورڈ کے نصاب تعلیم میں فارسی/عربی کو لازمی مضامین کے گروپ میں شامل کیا جائے۔ تا کہ سنسکرت کی طرح مسلم طلبا بھی اپنی مذہبی/ثقافتی زبان سے اپنے رشتہ کو قائم رکھ سکیں، اس کی صورت یہ ہے کہ درجہ آٹھویں اور نویں میں راشٹریہ بھاشا جو ۱۰۰ نمبر کا ہے اس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ 50 نمبر راشٹریہ بھاشا ہندی کے لئے اور 50 نمبر فارسی رعربی کے لئے، جیسے پہلے ہندی/ اردو کمپوزیشن میں 50 +50 نمبرات کے دونوں مضامین ہوتے تھے۔ اسی طرح ہندی اردو کے بجائے ہندی/ فارسی یا عربی 50 + 50 نمبرات کے کر دیئے جائیں۔ اور اختیاری مضمون میں سے عربی/ فارسی کو خارج کر دیا جائے، اسی طرح گیارہویں اور بارہویں کلاس میں نمبر شمار ۲ میں دوسری زبان کے الف میں ہندی کے لئے 50 نمبر مسلم طلبا کو بھی پڑھنا ہے۔ (ب) اختیاری 50 میں فارسی/عربی شامل نہیں ہے اسکو شامل کر دیا جائے۔ تو ان دونوں کلاس میں بھی مسلم طلبا فارسی/عربی 50 نمبر کا لے کر فارسی/عربی کی تعلیم حاصل کر سکیں گے۔ اور 500 نمبر میں اضافہ بھی کرنا پڑے گا۔ یہ کام ریاستی حکومت کے اختیار میں ہے۔ اس کو آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔ عزت مآب وزیر اعلیٰ نتیش کمار بڑے مہربان اور ہر دلعزیز ہیں، انہوں نے تمام لوگوں کے حقوق کی رعایت کی ہے۔ ان کے سامنے اس کو پیش کیا جائے۔ اور فارسی/عربی زبان کو ہائی اسکول اور 2+ میں شامل کیا جاسکے۔ توقع ہے کہ حکومت بہار ہمدردانہ غور کر کے اس مسئلہ کو حل کرے گی۔

(قومی تنظیم پٹنہ، راشٹریہ سہارا پٹنہ ۲۰۰۶)

(۴)

# برصغیر کے تکثیری معاشرہ پر اسلام کے اثرات

ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش پر مشتمل تین ممالک برصغیر کہلاتے ہیں۔ پاکستان اور بنگلہ دیش دونوں ہی ہندوستان کے حصہ تھے۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان ہندوستان سے الگ ہوا۔ اور الگ ایک ملک ہو گیا۔ پھر پاکستان سے بنگلہ دیش الگ ہوا۔ اور مستقل ایک ملک ہو گیا۔ اس طرح پاکستان اور بنگلہ دیش دونوں ہی قدیم ہندوستان کے حصے رہے ہیں۔

ہندوستان کے سلسلہ میں سید سلیمان ندوی تحریر کرتے ہیں:

مسلمانوں کی آمد سے پہلے اس پورے ملک کا کوئی ایک نام نہ تھا۔ ہر صوبہ کا نام الگ الگ تھا۔ یا ہر ریاست کا نام اس کی راجدھانی کے نام سے مشہور تھا۔ اہل فارس نے جب اس ملک کے ایک صوبہ پر قبضہ کیا، تو اس دریا کا نام جس کو اب دریائے سند کہتے ہیں اور جس کا نام عربوں کے زبان میں مہران ہے ''ھندھو'' رکھا۔ پرانی ایرانی زبان اور سنسکرت میں 'س' اور 'ہ' آپس میں بدلا کرتے ہیں۔ اس کی متعدد مثالیں ہیں۔ اس لئے فارس والوں نے اس کو ''ھندھو'' کہہ کر پکارا۔ اور اس سے اس ملک کا نام ھند پڑ گیا۔ عربوں نے جو سندھ کے علاوہ اس ملک کے دوسرے شہروں سے واقف تھے، انہوں نے سندھ کو سندھ ہی کہا، لیکن اس کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے شہروں کو ہند قرار دیا۔ اور آخر یہی نام تمام دنیا میں مختلف صورتوں میں پھیل گیا۔ اور 'ہ' کا حرف ''الف'' ہو کر فرنچ میں اند اور انڈیا اور اس کی مختلف صورتیں ہو کر تمام دنیا میں مشہور ہو گیا۔ اور خیبر سے آنے والی قوموں نے اس کا نام ''ھندواستھان'' رکھا۔ جو فارسی تلفظ میں ''ہندوستان'' بولا جاتا ہے۔ یہ عجیب حیرت انگیز بات ہے کہ ''ھند'' کا لفظ عربوں کو ایسا

پیارا معلوم ہوا کہ انہوں نے ملک کے نام پر اپنی عورتوں کا یہ نام رکھا۔ چنانچہ عربی شاعری میں یہ نام وہ حیثیت رکھتا ہے جو فارسی میں لیلیٰ اور شیریں کی ہے۔(۱)

تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ جنوبی ہند میں مسلمانوں کی آمد سے قبل ہی مشرکین عرب آباد تھے۔ اسلامی عہد میں سب سے پہلے حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں بحر ہند میں فوجی بیڑا داخل ہوا۔ ساتویں صدی عیسوی کے آخر میں مسلمان سب سے پہلے جنوبی ہند کے ساحل مالا بار پر آباد ہوئے۔ محمد ابن قاسم کے سندھ پر حملہ سے پہلے مسلمان لنکا میں آباد ہو چکے تھے۔ آٹھویں صدی عیسوی کے شروع میں حجاج بن یوسف نے خاندان بنو ہاشم کے ایک کنبے کو ملک بدر کر دیا تھا۔ یہ کنبہ جنوبی ہند کے مغربی اور مشرقی ساحل پر آباد ہوا۔ اسی صدی میں عرب بیڑوں نے بھڑوچ اور کاٹھیاواڑ کی بندرگاہوں پر حملہ کیا۔ اسی زمانہ میں محمد ابن قاسم نے بھی سندھ پر حملہ کیا۔ اور اس طرح سندھ، ملتان، کاٹھیاواڑ اور لنکا وغیرہ مسلمانوں کے زیر اثر آ گئے۔ نویں صدی عیسوی کا زیادہ حصہ نہ گزرا تھا کہ مسلمان ہندوستان کے مغربی ساحل پر پھیل گئے۔ مسعودی (۹۱۶ء) کے بیان کے مطابق چال کے مقام پر تقریباً دس ہزار مسلمان عرب آباد تھے۔

فتوح البلدان میں مذکور ہے:

> ''عمر بن الخطاب نے ۱۵ھ میں عثمان بن ابی العاص الثقفی کو بحرین وعمان کی ولایت پر مقرر کیا۔ وہ خود تو عمان گئے اور اپنے بھائی الحکم کو بحرین بھیجا۔ عمان پہنچ کر انہوں نے ایک دریائی مہم تانہ (تھانہ) کی طرف بھیجی۔ جب یہ لوگ صحیح سلامت واپس آ گئے تو عمرؓ کو اس کی اطلاع دی۔ الحکم نے اپنے بھائی المغیرہ کو خلیج دیبل کی طرف روانہ کیا۔ اور خود بڑوج پر حملہ کیا۔ دشمن سے مقابلہ ہوا اور اس پر غالب ہوئے۔ پھر عثمان بن عفان نے اپنے زمانہ میں بلاد عراق پر عبداللہ بن عامر کو مقرر کیا۔ تو انہیں ثغر الہند کی طرف دریائی مہم بھیجنے کا حکم دیا۔ غرض یہ کہ اس ملک کے حالات سے آگاہی ہوئی۔ عبداللہ نے حکیم بن حبلہ العدوی کی سرداری میں ایک دستہ سمندر کے راستے سے روانہ کیا۔ وہ بلوچستان اور سندھ کے مشرقی علاقہ کو دیکھ کر واپس آئے۔ عبداللہ نے انہیں عثمان کے پاس بھیج دیا کہ جو کچھ دیکھا ہے جا کر سنا دے۔ حضرت عثمانؓ نے سن کر لشکر کشی کا خیال ترک کر دیا۔ ۳۸/۳۹ھ میں حارث بن مرّہ العبدی نے علی بن ابی طالب سے اجازت لے کر سرحد ہند پر حملہ کیا، اور فتحیاب ہوئے۔''(۲)

اسلام اور مسلمانوں کی آمد کے وقت برصغیر میں مختلف دھرم اور مذاہب کے لوگ بستے تھے۔ ہندو دھرم، جین مت، بودھ مت اور سکھ پنت کے ماننے والوں پر مشتمل ایک بڑا معاشرہ موجود تھا۔ برصغیر کے اس تکثیری معاشرہ پر اسلام نے بڑے اثرات قائم کئے۔ اسلام نے جہاں تہذیب وتمدن کو متاثر کیا، وہیں قدیم مذہبی نظریات پر بھی اپنا گہرا اثر چھوڑا۔ برصغیر کے تکثیری معاشرہ پر اسلام کے اثرات کو دیکھنے کے لئے چند عنوانات (الف) مذاہب (ب) تہذیب وتمدن (ج) علوم وفنون (د) فن تعمیر (ہ) فن مصوری (ی) فن موسیقی کے تحت اس کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

{الف} مذاہب:۔ برصغیر میں کئی دھرم وجود میں آئے۔ ہندو دھرم، بودھ مت، جین مت اور سکھ پنت کی پیدائش کی جگہ برصغیر ہی ہے۔ مسلمان اور اسلام کی آمد کے وقت یہ تمام دھرم، مت وپنت یہاں رائج تھے۔ بلکہ اس کا دائرہ دیگر ممالک تک بھی پھیلا ہوا تھا۔ ان کے مصلحین ملک میں تحریک کو عام کرنے کے لئے اپنی تحریکیں چلا رہے تھے۔ ان کا پورا پورا اثر یہاں کے سماج پر موجود تھا۔ اسلام نے ان کے مصلحین کے عقائد پر اتنا اثر ڈالا کہ ان کے بنیادی عقائد پر بھی اسلام کا اثر نمایاں طور پر دیکھنے کو ملتا ہے۔

جنوبی ہند میں ہندو دھرم میں شیومت اور وشنومت کے مصلحین کا اثر زیادہ تھا۔ ان مصلحین میں نمالور، شنکر، رام نوج (۱۰۰۶ء) نمبارک، مادھو (۱۱۹۹ء۔ ۱۲۷۸ء) وشنو سوامی، بلائے لوک اچاریہ وغیرہ نے بھگتی کا پرچار کیا۔ ان کے نظریات اور انداز فکر اسلام کے مرہون منت معلوم ہوتے ہیں۔

رام نوج کا فلسفہ خدائے واحد کو تسلیم کرتا ہے۔ اور ایمان اور خود سپردگی کے ساتھ اس کی عبادت کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ جن جماعتوں کو مذہب سے اب تک علیحدہ رکھا گیا، ان کے لئے مذہب کے دروازے کھول دیئے جائیں۔ اس کے فلسفے میں صرف عبد ومعبود کے درمیان ہی نہیں بلکہ انسان اور انسان کے درمیان بھی محبت کارفرما ہے۔ اگرچہ اس دوسرے معاملے میں رفتار سست ہے۔ وشنو سوامی، نمبارک اور مادھو کے خدا کی ماہیت اور انسان سے متعلق مابعد الطبیعیاتی مباحث نظام اشعری اور غزالی کی یاد دلاتے ہیں۔

اسلام کا عقیدۂ توحید ہندوستان میں اس طرح عام ہوگیا کہ اس کو ہر مذہب کے مصلحین نے

اختیار کیا۔ چنانچہ ڈاکٹر تاراچند تحریر کرتے ہیں:

''قرون وسطی میں عقیدہ توحید ہندوستان کا عام مذہب ہو جاتا ہے۔ خدائے واحد کو مختلف ناموں شیو، وشنو وغیرہ سے یاد کیا جاسکتا ہے۔ وجود باری، تخلیق اور عبد و معبود کے مابین تعلق کے بارے میں مختلف نظریات ہو سکتے ہیں۔ مگر خدا ہی واحد اور اعلیٰ ہے۔''(۳)

سدھاریوں کے عقیدوں سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام نے ان کے عقیدوں پر بھی گہرا اثر ڈالا ہے، ان کے عقیدے یہ ہیں:

خدا ماورائے مکان ہے، کیونکہ وہ دور، بہت دور، موجودات عالم سے بالاتر اور لامکان میں رہتا ہے۔ یہ عبادت نہیں کہ مٹی یا تپے ہوئے گارے کے بنے ہوئے بتوں کے آگے سر جھکایا جائے۔ سدھاریوں کے یہاں نسلی امتیازات بھی نہیں، یہ اخوت انسانی کے علم بردار ہیں، سخت توحید پرست ہیں، بت پرستانہ رسوم کے مخالف ہیں۔ ان کے یہاں فنافی اللہ کا تصور صوفیاء کے اثرات کی غمازی کرتا ہے۔

مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ لنگایتی خدائے واحد کے پرستار ہیں۔ وہ خدا جو مطلق، مختار، غیر مری، نور اعلیٰ، ہر حدوث سے ماوراء اور مادیت سے منزہ ہے۔ وہی ارواح اور قدرت کا خالق ہے۔ جن کے متعلق یہ تصور ہے کہ وہ ہستی مطلق کے آئینہ دار ہیں۔ وہ معلم کائنات اور روح منفرد کے رہنما کی حیثیت سے جلوہ گر ہوتا ہے۔

ان کے مذہب میں نہ یگیہ ہے نہ برت، نہ تہوار اور نہ یاترا۔ لنگایت کے لئے کوئی رسم تطہیر بھی نہیں۔ نہ ان کے یہاں ذات پات کا جھگڑا ہے۔ کوئی بھی اس مذہب کو قبول کرلے تو وہ بھی برہمن سے کسی طرح کم مرتبہ نہیں سمجھا جاتا۔ جنسی اور نسلی اختلافات کی بنیادوں پر بھی کوئی امتیاز نہیں، انسان پر پرآتما کا جس حد تک اثر ہے۔ اسی تناسب سے ہر انسان مقدس ہے۔

ان کے یہاں نکاح لڑکے اور لڑکی کی مرضی پر موقوف ہے۔ بیاہ سے پہلے دلہن کی اجازت لینی ضروری ہے۔ بچوں کے بیاہ کو غیر مستحسن خیال کیا جاتا ہے۔ طلاق کی اجازت ہے۔ بیواؤں کے ساتھ عزت کا سلوک کیا جاتا ہے۔ اور ان کو دوبارہ بیاہ کرنے کی اجازت ہے۔ مردوں کو جلایا نہیں جاتا، بلکہ دفن کیا جاتا ہے۔ کوئی شرادھ یعنی رسومات میت فرض نہیں۔ یہ لوگ عقیدۂ تناسخ ارواح پر

ایمان نہیں رکھتے۔آپس میں شادیاں کرتے ہیں۔اورمل جل کر رہتے ہیں۔ان کے ان عقیدوں پر بھی اسلام کا پورا اثر موجود ہے۔

تیرہویں صدی عیسوی کے آغاز ہی میں مسلمانوں کے ہاتھوں شمالی ہند کی فتح مکمل ہو چکی تھی۔ان فتوحات نے ہندوستانی تمدن پر گہرا اثر ڈالا چنانچہ چودہویں صدی عیسوی سے گجرات، پنجاب اور بنگال وغیرہ کے مختلف ہندو مذہبی رہنماؤں نے قدیم رسومات کو ترک کرنا شروع کر دیا تھا۔وہ اسلامی اثرات ہی کا نتیجہ تھا۔

شمالی ہند کے دو مصلحین رامانند اور کبیر کی تعلیمات پر بھی اسلام کا گہرا اثر پایا جاتا ہے۔رامانند غالباً چودہویں صدی کے اخیر میں پیدا ہوا، یہ وشنو کی پوجا کیا کرتا تھا۔اس نے تعصب سے بالاتر رہ کر ہندوؤں کے چاروں ذاتوں کو بھگتی کی تعلیم دی۔اس کے چیلوں میں کبیر بہت مشہور ہوا۔

رامانند کے تعلیمات نے مذہب بھگتی کے دو مکاتب فکر پیدا کر دیئے۔ایک رجعت پسند اور دوسرا جدت پسند۔پہلے مکتب خیال میں تلسی داس سرفہرست ہے۔اور دوسرے مکتب فہرست میں کبیر پیش پیش ہے۔اسلامی اثرات کے تحت کبیر نسلی اور ذاتی امتیازات کا مخالف ہے۔وہ تصوف سے کافی متاثر ہوا ہے۔چنانچہ دسویں صدی عیسوی میں منصورؒ نے جن اصطلحات کا استعمال کیا تھا وہ کبیر کے یہاں بھی موجود ہے۔مثلاً عالم ناسوت، عالم ملکوت، عالم جبروت، عالم لاہوت وغیرہ۔اسی تاثر کا نتیجہ ہے کہ ایک اندازے کے مطابق کبیر کے اقوال میں تقریباً دوسو عربی اور فارسی الفاظ ملتے ہیں۔

کبیر کا مرکزی عقیدہ توحید ہے۔خدا کے متعلق اس کا عقیدہ ہے:

عقل کا مقام اس حقیقت متحرکہ کی رویت ومعرفت سے بہت دور ہے۔وہ ہر دل میں موجود ہے، ہر ایک ظرف میں اس کی جلوہ گری ہے۔اور تمام موجودات اس کے نور سے معمور ہے۔

شمالی ہند کے مصلحین میں گرونانک بہت مشہور ہیں۔گرونانک کی پیدائش ضلع گجرانوالا (مغربی پاکستان) میں ہوئی۔ابتدا میں انہوں نے سنسکرت سیکھی۔پھر مولانا قطب الدین سے فارسی پڑھی۔۳۰ر سال کی عمر میں گھر بار اور ملازمت کو چھور کر فقیری اختیار کی۔اطلاعات کے مطابق فارس وعرب کے بیشتر علاقوں میں سیاحت کی۔اور مسلم صوفیاء سے ملاقات کی۔جس کا اس پر گہرا اثر

ہوا۔ گرونانک کا مقصد حیات ہندو مسلم اتحاد تھا۔ وہ دوئی پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ سب کو ایک دیکھنا چاہتے تھے۔ وحدت پرست تھے۔ خدا کے متعلق ان کا عقیدہ یہ ہے۔

وہ ناقبل فہم، بیکراں، مختار کل، لازوال اور قیوم ہے۔ وہ وراُالوراُ ہے۔ پھر بھی ہر جگہ موجود ہے۔ اوراس کے نور سے ہر چیز منور ہے۔

نانک نے ہندوؤں کی توہم پرستی پر ملامت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

سب کچھ صحیح لیکن اگر تجھ کو خدا کی معرفت نصیب نہیں تو پھر موت تم کو ماردے گی۔

ان کا یہ بھی کہنا ہے:

اس شخص کا ناپاک دل کس طرح پاک ہوسکتا ہے۔ جو پتھروں کی پوجا کرتا ہے۔

گرونانک عقیدہ حلول کا قائل نہیں۔ ذات پات کی تفریق کو بھی تسلیم نہیں کرتے۔ قیامت کے قائل ہیں۔ اور عمل صالح پر زور دیتے ہیں یہ سب عقائد اسلامی اثرات کے غماز ہیں۔ (۴)

کبیر اور نانک کے چیلوں میں دھنا، پیپا، سائیں اور ریداس کا ذکر ملتا ہے۔ ان کے اقوال سے اسلامی اثرات کا پتہ چلتا ہے۔ اسی صدی میں دادو دیال بھی پیدا ہوا۔ اس کے یہاں بھی اسلامی اثرات پائے جاتے ہیں۔ اس نے ریختہ اور بگڑی ہوئی فارسی میں شاعری کی ہے۔ مثلاً اس کا یہ شعر

موجود خبر، معبود خبر، ارواح خبر موجود
مقام چہ چیز است، دادنی سجود

دادو دیال گرو کو معرفت الٰہی کا وسیلہ سمجھتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے:

مرشد نے مرید کی روح کو معبود کی راہ سے باخبر کردیا ہے۔

وہ خدا کو ''ماوراٗ''، ''غیر محدود''، ''واحد'' اور ''نور'' تصور کرتا ہے۔ معرفت الٰہی کو نجات کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ آواگون کا معتقد نہیں۔ اور اسلام کی طرح عمل صالح پر زور دیتا ہے۔ (۵)

ملوک داس (۱۵۷۴ء) بھی سولہویں صدی عیسوی میں گزرا ہے۔ اس نے ظواہر مذہب کی تردید کی۔ اور معرفت ذات، فنائے ذات، گرو پر اعتماد اور عشق حقیقی پر زور دیا۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتا ہے:

''جو شخص جذبات انسانی کو مٹا کر زندگی میں ہی مرجاتا ہے، اس کے سامنے حضرت

عزرائیلؑ بھی جھک جاتے ہیں۔‘‘

اسلامی اثرات کے تحت وہ انسانی ہمدردی کا علم بردار ہے۔ چنانچہ کہتا ہے:

وہ شخص خدا کا محبوب بندہ ہے جو عناصر خمسہ سے علیحدہ رہ کر پیاسوں کو پانی پلاتا ہے

ست نامی فرقہ کا بانی بیر بھان (۱۵۴۳ء) بھی اسی صدی میں ہوا ہے۔ وہ سخت قسم کا موحد تھا۔ اس کے فرقہ میں ذات پات اور نسلی امتیازات نہیں ہے۔ یہ لوگ بتوں کے قائل نہیں ہیں۔ فنافی اللہ ہونا ان کے نزدیک فرد کی ترقی کا منتہی ہے۔ اس فرقہ کے لوگ مسکرات استعمال نہیں کرتے۔ اور چھپا کر خیرات دینا پسند کرتے ہیں۔ یہ فرقہ اسلامی اثرات سے کافی متاثر ہوا ہے۔

زمانہ وسطی میں بنگال میں وہ سب مقامات شامل تھے۔ جو آج بنگلہ دیش کہلاتے ہیں۔ موجودہ بہار، آسام اور اڑیسہ کے حصے بھی شامل رہے ہیں۔ بنگال کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ دوسرے علاقوں کی طرح اسلام بنگال کے معاشرہ پر کافی اثرانداز ہوا۔ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے تو اسلام کا اثر یہاں کی مذہبی زندگی پر دیکھنے کو ملتا ہے۔ پنڈتوں کی مذہبی اجارا داری پر اسلام کے تعلیم کا گہرا اثر پڑا۔ اسلام کی تعلیم وحدانیت سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس کا اثر یہ پڑا کہ ہندو پیشوا بھی بہت ساری دیوی دیوتاؤں کی پرستش کی جگہ ایک خدا کی عبادت کا درس دینے لگے۔

بنگال کے مشہور مصلح شری چتینیہ تھے۔ ان کی تعلیم پر اسلامی تعلیمات کا اثر نمایاں ہے۔ انہوں نے ہندو ذات پات میں تفریق کے خلاف تعلیم دی۔ ان کی تعلیم میں یہ بھی ہے کہ ہر شخص بغیر کسی کی مدد کے خدا سے براہ راست تعلق قائم کرسکتا ہے۔ اور اس کی پرستش بھی کرسکتا ہے۔ اس نے نشہ آور چیزوں کے استعمال اور شراب پینے سے بھی منع کیا ہے۔ ان کے یہ خیالات اسلامی تعلیمات سے متاثر ہیں۔ جہاں تک سماجی اور ثقافتی زندگی کا معاملہ ہے تو یہاں کی سماجی اور سیاسی زندگی پر بھی اسلام کا کافی اثر پڑا۔ شہر ہو یا گاؤں یہاں کے اعلیٰ طبقہ کی عورتیں اپنا چہرہ چھپائے رکھتی تھیں۔ یہ اسلام ہی کا اثر تھا۔ ملازمت حاصل کرنے کے لئے پڑھے لکھے لوگ فارسی لکھتے اور پڑھتے تھے۔ مثنوی مولانا روم اور دیوان حافظ وغیرہ پڑھنے کا بھی رواج تھا۔ یہاں کے آداب مجلس نیز لباس، پوشاک، زیور، ماکولات اور مشروبات میں بھی اسلام کا اثر ظاہر ہوا۔ (۶)

اسلام اور عربی وفارسی کا اثر بنگلہ زبان پر بھی بہت گہرا پڑا۔ یہاں کے پڑھے لکھے لوگ مقامی زبان بنگلہ کی ترقی اور مقبولیت کے حامی نہیں تھے۔ بنگلہ زبان کی ابتدائی نشوونما اور اس کی ترقی میں مسلم حکمرانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ عربی وفارسی کی طرح انہوں نے بنگلہ کی بھی سرپرستی کی۔ اور اسے اپنی زبان سمجھا۔ ان کی سرپرستی کی وجہ سے بنگلہ زبان عوام کی زبان بن گئی۔ اور ترقی کرنے لگی۔ (۷)

کشمیر کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اسلام نے کشمیری معاشرہ پر کافی اثر ڈالا۔ کشمیریوں کی زندگی کا تقریباً ہر شعبہ اسلام سے متاثر ہوا۔ مذہبی عقائد، سماجی زندگی، رہن سہن، صنعت و حرفت، علوم وفنون، زبان، خوراک، لباس، تجارت، آئین حکومت غرض زندگی کے ہر شعبہ میں ایک نمایاں تبدیلی ہوئی۔ مئورخ جوناراجا لکھتا ہے۔ جس طرح آندھی درختوں کو تباہ کر دیتی ہے اور ٹڈی دھان کو۔ اسی طرح مسلمانوں نے کشمیر کے رسم ورواج کو تباہ کر ڈالا۔

ڈاکٹر محمد عمر تحریر کرتے ہیں:

''ہندوستانی مذہبی اور روحانی زندگی میں اسلام کے اثر سے ایسا انقلاب ہوا کہ اس نے یہاں کی مذہبی اور روحانی زندگی میں ایک نئی روح پھونک دی۔ بھگتی تحریک کا جنم اسلام کے زیر اثر ہوا۔ اور اس تحریک کے پیشواؤں کی تعلیمات بڑی حد تک اسلام کی تعلیمات پر مبنی تھیں۔ مثلاً فلسفۂ توحید ہندوؤں میں بھی توحید کا عقیدہ موجود تھا۔ لیکن ایک خدا کے ساتھ دوسرے خداؤں کو شریک نہ کرنے کا تصور نہ تھا۔ اس کے برعکس اسلام کا فلسفہ توحید وحدہ لاشریک لہ ہے۔ بھگتی تحریک کے پیشواؤں نے خالص اسلامی توحید کا فلسفہ اپنا لیا۔ مثلاً کبیر اور نانک نے فلسفہ توحید کی ترویج کے ساتھ ساتھ دوسرے دیوی دیوتاؤں کو ترک کرنے کی بھی تعلیم دی۔ اور انہوں نے ایک ایسے خدا کا تصور پیش کیا جس کا کوئی شریک نہیں۔ کبیر نے عبادت پر زور دیا، جس پر انسانی برتری کا انحصار تھا۔ نسلی برتری کی مذمت کی۔ یہی مسلمانوں کا فلسفہ ہے کہ اللہ کے زیادہ قریب وہ شخص ہے جو تم میں زیادہ پرہیزگار اور عبادت گزار ہے۔'' (۸)

**{ب} تہذیب وتمدن:۔** اسلام نے برصغیر کے تہذیب وتمدن پر گہرا اثر ڈالا۔ کھانوں میں۔ کباب، مرغ مسلّم، شامی کباب، ہانڈی کباب، اسٹو، قیمہ، قورمہ، کوفتہ، ٹکیا، نہاری، بریانی، چکن بریانی، مغل ڈش وغیرہ۔ لباس میں شیروانی، صافہ، عمامہ، جبہ، کرتا پایجامہ، لنگی، رومال، ٹوپی، شلوار، جمپر، اسکارف، غرارہ، صدری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ہندو سماج میں بیوہ کے نکاح کا رواج نہیں

تھا۔مسلمانوں نے ہندوستانی سماج پر اتنا اثر ڈالا کہ بیوہ کے شادی کا رواج جاری ہوگیا۔یہاں کے بسنے والے لوگوں کے رہن سہن شادی، بیاہ وغیرہ پر بھی اسلام کا نمایاں اثر دیکھنے کو ملتا ہے۔

ہندوستانی تہذیب پر اسلام کے اثرات کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر تارا چند نے لکھا ہے کہ ہندوستانی تہذیب کے تمام شعبوں میں اسلام کس حد تک اثر انداز ہوا۔اس بارے میں مبالغہ سے کام لینا بہت ضروری ہے۔لیکن یہ اثرات رسم ورواج ،فن موسیقی ،لباس ،کھانے پینے کا طریقوں، شادی بیاہ کے رسموں، تہواروں، میلے ٹھیلوں کے منانے کے طریقوں اور مراٹھا، راجپوت اور سکھ حکمرانوں کے درباری اداروں اور درباری آداب میں بہت زیادہ نمایاں ہیں۔بابر کے دور حکومت نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے طرز زندگی اور انداز فکر میں یہاں تک یکسانیت پائی جاتی تھی کہ اسے ان کے مخصوص ''ہندوستانی طرز'' کا مشاہدہ کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔اس کے جانشینوں نے اس ورثے کو اس شاندار اور حیرت انگیز طریقے سے پروان چڑھایا کہ ہندوستان آج اس ورثے پر فخر کرسکتا ہے جو انہوں نے اپنے پیچھے چھوڑا تھا۔(۹)

{ج} سماجی وسیاسی زندگی:۔ برصغیر کے سماجی اور سیاسی زندگی پر اسلام نے بہت ہی گہرا اثر ڈالا۔ہندوسماج میں خاندان اور نسلی امتیاز بہت زیادہ تھا۔جس کی وجہ سے ہندوسماج کے نیچے طبقے کے لوگ نہایت ہی گھٹن محسوس کرتے تھے۔اسلام کے اخوت انسانی اور مساوات کے اصول کا ہندو سماج پر بہت گہرا اثر پڑا۔اس میں خاندان اور نسلی امتیاز کی اہمیت کم ہوگئی۔اور اس اثر کی وجہ سے ہندو مذہب میں سماجی مساوات کے احساس کی رفتار تیز ہوگئی۔اسی طرح اسلام اور مسلمانوں نے ہندوستان کے سیاسی حالات پر بھی اپنا اثر قائم کیا۔یہاں کی سیاست چھوٹے چھوٹے راجاؤں کے درمیان منقسم تھی۔ان کے درمیان سیاسی اتحاد نہیں تھا، بلکہ ہمیشہ ایک دوسرے سے برسر پیکار رہتے تھے۔مسلمانوں نے سیاسی لحاظ سے چھوٹے چھوٹے راجاؤں کی سیاسی مرکزیت کو ختم کرکے سیاسی اتحاد اور یکسانیت پیدا کرنے کی کوشش کی۔اور قومی یکجہتی فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا۔اس اصول نے یہاں کے باشندوں کو اسلام سے زیادہ قریب کردیا۔برصغیر میں اسلام کے فروغ میں سماجی مساوات، سیاسی یکسانیت اور قومی یکجہتی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔

{د} **علوم وفنون:۔** ہندو سائنس میں ریاضی، طب اور علم نجوم بہت ترقی یافتہ علوم تھے۔ اور ان علوم میں عرب اور ایران ہندوستانی علماء کے مرہون منت تھے۔ لیکن عربوں نے یونانی علوم بھی حاصل کئے تھے۔ اور اپنی کوششوں کے ذریعہ ان علوم کو مزید ترقی بھی دی تھی۔ اس لئے جب مسلمان ہندوستان آئے تو وہ اپنا سائنسی نظام بھی لائے۔ اس میں بعض منفرد عناصر تھے۔ ہندوؤں نے ان بعض عناصر کو اپنالیا جو ان کے لئے نئے تھے۔ ہندو منجموں نے مسلمانوں سے فنی اصطلاحیں اخذ کیں۔ مثلاً مسلمانوں کا طول البلد اور عرض البلد ناپنے کا طریقہ اور زیچ کی بہت سی اصطلاحیں مہاراجہ جئے سنگھ (۱۶۸۶۔ ۱۷۴۳ء) نے ہندو علم زیچ کا کام انجام دیا۔ اس نے جے پور، میتھرا، دہلی اور بنارس میں رصد گاہیں قائم کیں۔ اس کے درباری پنڈتوں نے عربی سے المجسطی نامی کتاب کا سنسکرت میں ترجمہ کیا۔ اور زیچ محمد شاہی کی ترتیب میں الغ بیگ، ناظر الدین طوسی، الغرگان، جمشید کاشی اور دوسرے نجومیوں کے فلکیاتی جدول کا استعمال کیا۔ ہندوستانی علم طب نے مسلمانوں سے فلزاتی تیزاب اور انٹر وکمسٹری کے طریقے اخذ کئے۔ ہندوستان میں مسلمانوں نے جن دست کاریوں اور صنعتوں کو رائج کیا یا ترقی دی ان میں سے کاغذ بنانا، بنے جانے والے مختلف قسم کے کپڑے منبت کاری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ (۱۰)

جہاں تک سنسکرت اور ہندی زبان وادب کی بات ہے، تو اسلام اور مسلمانوں کا اثر ان دونوں زبانوں پر بھی صاف طور سے نظر آتا ہے۔ عربی اور فارسی کے الفاظ ان دونوں زبانوں میں تو پہلے سے موجود تھے ہی، لیکن مسلمانوں کی آمد کے بعد عربی وفارسی الفاظ زیادہ رائج ہو گئے۔ یہی نہیں، ہندو اور مسلمانوں کے میل جول کی وجہ سے ایک نیا لسانی امتزاج رونما ہوا۔ ایک نئی زبان جو ہند آرین تہذیب کی وجہ سے آگے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ہندوستان میں مسلمان اور ان کی زبان عربی اور فارسی کی وجہ سے اس نئی زبان کو نہایت ہی تیزی کے ساتھ ترقی کے مواقع حاصل ہوے۔ اور یہ نئی زبان اردو کی شکل میں وجود پذیر ہوئی۔

برصغیر میں دیسی علاج ومعالجہ کا رواج پرانا تھا۔ جو آیورویدطریقہ علاج پر مشتمل تھا۔ ویدوں نے اس طریقہ علاج کو آگے کی طرف بڑھایا۔ اور آج بھی یہ طریقہ علاج برصغیر میں موجود ہے۔

مسلمانوں نے برصغیر کوایک نئے طریقہ علاج سے بھی روشناس کرایا۔اور یہاں اس طریقہ علاج کو رواج دیا۔یہ یونانی طریقہ علاج ہے۔یہ طریقہ علاج برصغیر میں بھی بہت مقبول ہوا۔اور بڑے بڑے طبیب اور حکیم پیدا ہوئے۔آج یہ طریقہ علاج برصغیر میں بہت ہی مقبول ہے۔

{ہ}فن تعمیر:۔ہندوستان قدیم ملک ہے۔اس میں بسنے والے زیادہ تر ہندو دھرم سے تعلق رکھتے تھے۔اس لئے یہاں کی فن تعمیر میں بھی ہندو فن تعمیر کے گہرے نقوش پائے جاتے ہیں۔ڈاکٹر تاراچند کے بیان کے مطابق ہندو فن تعمیر میں بکثرت مختلف قسم کے ستون ہیں۔مربع بھی ہیں،مخمس اور مسدس،مثمن پہلو بلکہ شانزدہ پہلو بھی ہے،اور گول بھی۔ستونوں کی قسموں،قطر،اونچائی اور دیواروں سے ستونوں کی پیوستگی کے تناسب کا سختی سے تعین کردیا گیا ہے۔پایہ،کرسی،عمود،سرعمود اور وہ بالائی حصہ جس میں محراب،کانس وغیرہ شامل ہوتی ہیں۔نیر بے شمار آرائشی حاشیئے ہوتے ہیں۔

اسلامی فن تعمیر کے بارے صہبا وحید کی تحریر پیش ہے:

> ”اسلامی فن تعمیر ہر گوشہ اور ہر پہلو سے مشیت ایزدی کے آگے سر تسلیم خم کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ ابتدائی برسوں میں اس کا یہ موقف آرائش اور حسن کاری کی شکل میں بتدریج نشوونما پاتا رہا ہے اور بعد کی تعمیرات میں نمایاں ہوکر سامنے آیا۔اس حقیقت سے انکار بہر حال محال ہے کہ ساتویں صدی عیسوی کے وسط سے تقریباً آٹھ سو سال تک مسلمانوں نے جس طرز تعمیر کو فروغ دیا،وہ عیسائی مغرب کے حلقہ اثر سے باہر کی چیز تھا اور اگر کچھ مماثلت تھی بھی،تو محض سرسری سی۔اور وہ بھی اس لئے کہ مسلمانوں نے تعمیر کاری کے جن اسالیب کی خوشہ چینی کی تھی،وہ متاخر یونانی اور رومی ادوار میں مروج تھے۔لیکن یہ متاخر یونانی،رومی اسالیب بھی ظہور اسلام سے بہت پہلے بائی زنطہ اور مشرق ادنی کے تعمیر کاروں کی جسارتوں کے سبب اپنی اصل ہیئت کھو چکے تھے۔“(۱۱)

مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے کے بعد مسلم تہذیب وتمدن نے جہاں ہندوستانی تہذیب وتمدن کو متاثر کیا وہیں ہندو فن تعمیر پر بھی اسلامی فن تعمیر نے گہرا اثر ڈالا۔ملک میں پھیلے ہوئے حسین وخوبصورت عمارتوں کا شمار کیا جائے تو ان میں سے اکثر اسلامی فن تعمیر کا مظہر نظر آئیں گے۔یہ صرف مسلم عمارتوں کی بات نہیں بلکہ اس زمانہ میں تعمیر ہونے والی ہندو عمارتوں میں بھی اسلامی فن تعمیر کا گہرا اثر دیکھنے کو ملتا ہے۔بنگال کا ایک مندر جو مسلم عہد حکومت میں تعمیر ہوا۔اس میں

گوراور مالدہ کی مسجدوں کی طرز تعمیر کی پیروی کی گئی ہے۔ یہ مندر ۱۷۰۴ءاور ۱۷۲۲ء کے درمیان تعمیر ہوا۔اس کی حدود دار بعہ اچھی خاصی ہیں۔اوراس کا خاکہ چوکور ہے۔اس کی تین منزلیں ہیں اور تیسری منزل پر مرکزی منارہ ہے۔جس کے اوپر مخروطی کلس لگا ہوا ہے۔

مطالعہ سے یہ بات ثابت ہے کہ مسلمانوں کے اثرات کے وجہ سے ہندوؤں کی قدیم جمالیاتی قدریں بدل گئیں۔مختلف مقامات کی عمارتوں کو دیکھنے کے بعد یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسلامی جمالیاتی قدروں نے برصغیر کے جمالیات کو بے حد متاثر کیا۔یہی وجہ ہے کہ برصغیر کے طرز تعمیر پر اسلامی طرز تعمیر کا گہرا اثر موجود ہے۔ریاست جودھپور میں رانپور کے مقام پر ۱۴۳۹ء میں مندر تعمیر ہوااس میں قدیم روایات سے انحراف ہے۔گوالیار میں راجہ مان سنگھ اور وکرامادتیا سنگھ کے محلات میں محرابیں موجود ہیں جو مسلم فن تعمیر کی علامتیں ہیں۔۱۵۹۰ء میں راجہ مان سنگھ میں برندابن میں گوند دیو کا مندر بنایا۔اس میں بھی دہلیز پر محرابیں ہیں۔اسی مقام پر ۱۶۲۷ء میں جو مندر تعمیر کرایا گیا،اس میں بھی مخروطی مینار اور محراب دار طاق مسلم فن تعمیر سے لیا گیا ہے۔صوبہ مدراس کے ہندوراجاؤں کے عمارات اور ودیانگر، چندر گڑھ، مدورا اور تنجور کے محلات میں مسلم فن تعمیر کا اثر نمایاں ہے۔مدورا میں تیرو ملائنک نائنک کا محل ستر ہویں صدی عیسوی میں تعمیر کیا گیا۔اس کو تین گنبد والی مسجد کے انداز پر تعمیر کیا گیا ہے۔اسی طرح کے سینکڑوں عمارات ہیں جن میں مسلم فن تعمیر کا پورا اثر دیکھنے کو ملتا ہے۔

ڈاکٹر تاراچند تحریر کرتے ہیں:

> ”اس دور کا ہندوستانی فن تعمیر بھی اسی امتزاجی رجحان کا پتہ دیتا ہے۔ہندو محلات، منادر، یادگاری مقابل یا چھتریاں خالص قدیم انداز پر تعمیر نہیں ہو رہے تھے۔انہوں نے نہ صرف یہ کہ فن تعمیر کہ اسلامی عناصر کو اپنایا بلکہ ان کے اندر ایک نئی روح پیدا ہوگئی تھی۔جو اس حقیقت کی غمازی کرتی ہے کہ قدیم اقدار حسن کس کس قدر تبدیل ہوگئے تھے۔پھر یہ کہ مسلمانوں کا اثر ملک کے کسی خاص حصہ تک محدود نہ رہا۔یہ سب بڑھ کر راجپوتانہ اور وسط ہند کی ہندو ریاستوں اور مقدس مقامات مثلاً متھرا، بندرابن اور بنارس میں ظاہر ہوا۔اس کے علاوہ دور دراز مقامات مثلاً کٹھمنڈو اور مدورا وغیرہ میں بھی اسلامی اثرات محسوس کئے گئے۔اسی طرح سے مسلمانوں کے مکابر، مساجد اور محلات بھی بالکل ہندوستانی انداز پر قائم کئے گئے ہیں۔“ (۱۲)

{و}فن مصوری:۔مسلمانوں سے قبل ہندو،جین اور بودھ مصوری ہرایک کا اپنا مخصوص انداز تھا۔اور یہ فن نہایت ہی ترقی یافتہ تھا۔مختلف کتابوں میں آج بھی موجود ہیں۔مختلف غاروں میں مصوری کے نادر نمونے پائے جاتے ہیں۔چٹانوں کو کھود کر غاروں میں جو مندر بنائے گئے ہیں۔ان کی چھتیں اور دیواریں تصاویر سے مزین کی گئی ہیں۔مسلمانوں کے اس ملک میں وارد ہونے کے بعد اس فن کو مزید وسعت حاصل ہوئی۔بابر اور ہمایون کے زمانے میں اس فن کو آگے بڑھنے کے زیادہ مواقع حاصل ہوئے۔اسی زمانہ میں داستان امیر حمزہ کو مرتب کیا گیا۔جس میں ایک ہزار چار سو تصاویر ہیں۔یہ بارہ جلدوں میں ہے۔اس کے لئے کافی تربیت یافتہ نقاشوں کو مشاہرہ پر رکھا گیا تھا۔عہد اکبری میں اس فن کو مزید وسعت حاصل ہوئی۔اور بہت سے مشہور نقاش نے اس فن کو آگے بڑھایا۔اوران کے بہت سے شاگرد بھی پیدا ہوگئے۔تیمور نامہ میں بہت سے نقاشوں کے نام موجود ہیں۔جہانگیر کے زمانے میں اس فن میں غیر معمولی نفاست حاصل کرلی۔شاہجہاں کے عہد حکومت میں یہ فن کمال کو پہنچ گیا۔تصویر میں ظاہری و باطنی تناسب رکھنے،داخلی تاثر اور تاریکی پیدا کرنے کے اصول وضع کئے گئے۔اس زمانہ میں مصوری کے لئے بہترین برش اور انتہائی قیمتی رنگ استعمال کئے جاتے تھے۔

انیس فاروقی تحریر کرتے ہیں:

’’شاہجہاں کا دور تاریخی اہمیت کے نقطۂ نظر سے فن تعمیرات کا دور کہا گیا ہے۔لیکن اسے بھی فن مصوری سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔استاد فقیر اللہ شاہجہانی اسٹوڈیو کا مہتمم تھا۔اس کی نگرانی میں کام کرنے والے مصوروں میں میر ہاشم،انوپ چھتر،چتر من،منوہر وغیرہ قابل ذکر ہیں۔اس دور کے جو مرقع نسخے دستیاب ہیں ان کے نام ہیں،باز بہادر،لیلیٰ مجنوں،خسرو شیریں،کام روپ وکامتا اور شاہجہاں نامہ۔فن مصوری سے مغلیہ دربار کی غیر معمولی دلچسپی کی وجہ سے مصوروں کی تعداد جہانگیر کے زمانے تک کافی بڑھ گئی تھی۔اوران سبھی کو دربار میں ملازم رکھنا قطعی ممکن نہ تھا۔چنے ہوئے اور ممتاز مصور تو دربار کی زینت تھے اور جو دوسرے درجہ کے مصور تھے وہ نوابوں،امرا اور وزیروں کے یہاں ملازم تھے۔لیکن جو تیسرے درجہ کے مصور تھے انہیں ملازمت نہ ملنے کی وجہ سے بازار میں اپنی دکانیں کھولنی پڑیں۔اس طرح شاہجہاں کے دور سے ہی فن مصوری نے بازاری سطح پر تجارتی موڑ اختیار کرلیا تھا۔بازار میں کام کرنے والے مصوروں نے

اپنی گذر اوقات کے لئے پیشہ مصوری کو جس طرح چاہا استعمال کرنا شروع کیا۔ یہ عام طور سے کم سے کم وقت میں پرانے چربوں سے گھٹیا قسم کی کاپیاں بناتے اور سستے داموں میں بیچتے تھے۔ لہٰذا تکنیکی اور جمالیاتی سطح پر اس دور سے منے چر مصوری میں زوال شروع ہوا۔ بہر حال دربار میں ولی عہد دارا شکوہ کی مصوری سے غیر معمولی دلچسپی اور ذاتی سرپرستی کی وجہ سے کوئی کمی نظر نہیں آتی اور شاہی اسٹوڈیو میں کسی قسم کا انحطاط نہیں آیا۔ مشہور دارا شکوہ البم اور تصوف پر اچھی خاصی تعداد میں تصاویر اختراع کی گئیں۔ دارا شکوہ ہی نے شاہجہاں نامہ مرقع کروایا۔ جو ۱۸۵۷ء کا تاریخ شدہ ہے۔ اور ونڈسر کیسل کے شاہی مجموعہ میں محفوظ ہے۔" (۱۳)

**{ز} فن موسیقی:۔** برصغیر میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے مذہبی اور بھگتی تحریکوں نے موسیقی کے فن کو آگے بڑھایا۔ اور یہ فن ترقی یافتہ شکل میں موجود تھا۔ مسلمانوں نے اس فن کو مزید ترقی دی، اور عروج تک پہنچایا۔ کلاسیکی موسیقی کو انقلاب سے ہم کنار کیا۔ سُر اور پردہ کی حقیقت کو واضح کیا، اور ان دونوں کے ربط کو واضح کر کے موسیقی کے فن کو ایک نیا راستہ دکھایا۔ چنانچہ مسلم مصنفین نے اس فن میں بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ ان میں سے غنیۃ المنیہ، لہجات سکندری، کنز التحف، آئین اکبر، پارجاتک، راگ درپن، مفتاح السرور، معرفتہ النغم، شمس الاصوات، اصول نغمات الآصفیہ، تحفۃ الہند، دھرپد، تذکرہ مشاہیر عالم کے نام قابل ذکر ہیں۔ شہاب سرمدی تحریر کرتے ہیں:

"اس طرح ہندی مسلمان نے یہاں کی کلاسیکی موسیقی کو جس انقلاب آگیں عمل سے بے تکلف بنایا وہ پردہ اور نسبات نغم کا منت پذیر تھا، اور آج بھی ہے۔ سچ پوچھئے تو عہد وسطیٰ نے جو فیصلہ سُر اور پردہ کے سارے مضمرات کے بیچ کیا، وہی اس کی تاریخ کا سب سے زیادہ عہد خیز واقعہ ہے۔ اس لئے کہ آج ہمارے سنگیت کا سارا دارومدار اسی سُر اور پردہ کے استعمال پر ہے۔ آج ہم روی شنکر کے ستار، علی اکبر خاں کے سرود، استاد بسم اللہ خاں کی شہنائی یا چورسیا جی کی بانسری کو ملک کی فنی اور عوامی موسیقی کے نمودار نمایندے جانتے مانتے ہیں۔ یہ سب کرشمے سُر اور پردہ کے سماگم کے ہیں۔" (۱۴)

**{ح} فن خطاطی:۔** مسلمانوں نے برصغیر کو ایک نئے فن سے بھی روشناس کرایا، وہ فنِ خطاطی ہے۔ یہ فن اپنی خصوصیات وامتیازات کے اعتبار سے تمام فنون لطیفہ میں زیادہ لطیف ونظیف ہے۔ یہ موسیقی، مصوری، نقاشی، سنگ تراشی، صناعی اور معماری سب سے منفرد ہے۔ فن خطاطی نے لال قلعہ، تاج محل، قطب مینار وغیرہ عمارتوں کے حسن کو حسین ترین بنا دیا ہے۔ اس فن میں اتنی جاذبیت اور کشش

ہے کہ عربی وفارسی حروف اپنی ساخت اور کشش کی وجہ سے پر کشش اور دیدہ زیب ہوجاتے ہیں۔

محمود غزنوی سے لیکر بہادر شاہ ظفر تک تمام مسلم حکمرانوں نے اس ملک کی عظمت میں اضافہ کیا۔فنون لطیفہ سے دلچسپی کی وجہ سے اس ملک کو حسین سے حسین بنانے کی کوشش کی۔قطب مینار اور اس کے در و دیوار پر فن خطاطی نے اس مینار کی عظمت اور وقار کو مزید بڑھا دیا ہے۔اس کے علاوہ بھی ہر دور میں اس فن کی پذیرائی ہوتی رہی۔اور آج کمپیوٹر کے دور میں بھی یہ فن ایک نئی شکل میں موجود ہے۔یہ وہ فن ہے جس نے برصغیر کی عمارتوں کی عظمت اور شان کو بڑھا دیا ہے۔اور یہ عمارتیں اپنے حسن کے اعتبار سے دنیا کی عمارتوں میں بے نظیر و بے مثال ہیں۔

خلاصہ یہ کہ برصغیر کے تکثیری معاشرہ پر اسلام کے اثرات کا گہرا اثر پایا جاتا ہے۔ہر جگہ اس کی جلوہ ستانی موجود ہے۔ان اثرات نے برصغیر کی شان اور عظمت کو دوبالا کردیا ہے۔

مراجع

(۱) عرب وہند کے تعلقات۔ص ۱۲
(۲) فتوح البلدان۔ص ۶۶۱
(۳) تمدن ہند پر اسلامی اثرات۔ص ۲۷
(۴) تمدن ہند پر اسلامی اثرات۔ص ۲۵،۲۴
(۵) تمدن ہند پر اسلامی اثرات۔ص ۲۶،۲۵
(۶) بنگالی جیبنے مشلمان پر وبھاب، (بنگلہ میں) یعنی بنگالی سماج پر مسلمانوں کا اثر
(۷) بنگلہ ادب کی تاریخ اردو ترجمہ
(۸) ہند اسلامی تہذیب کا ارتقاء۔ص ۳۷
(۹) ہند اسلامی تہذیب کا ارتقاء۔ص ۳۷
(۱۰) ہند اسلامی تہذیب کا ارتقاء۔ص ۳۶
(۱۱) ہند اسلامی فن تعمیر۔ص ۳۶
(۱۲) تمدن ہند پر اسلامی اثرات۔ص ۳۱۴
(۱۳) ہند اسلامی تہذیب کا ارتقاء۔ص ۱۷۳
(۱۴) ہند اسلامی تہذیب کا ارتقاء۔ص ۱۸۷

(۵)

# الخنساء: حیاتہا وشعرہا

الخنساء اسمہا تماضر بنت عمرو السلمیۃ،صحابیۃ و شاعرۃ مخضرمۃمن اہل نجد۔(۱) ولدت فی عام ۶۴۵م۔والخنساء لقب غلب علیہا۔(۲)لقبت بالخنساء بسبب ارتفاع ارنبتی انفہا۔(۳) وقیل لقبت بالخنساء لقصر انفہا و ارتفاع انبتیہ(۴)نبتت فی دوحت الشرف،واز دہرت فی روضۃ الفضل ،فکان ابو ہا واخواہا معاویہ و صخر سادات سلیم من مضر۔وکانت بارعۃ الجمال والادب۔(۵) واشتہرت برثا ئہا لا خو یہا صخرو معاویۃ الذین قتلا فی الجاہلیۃ۔ (۶)لما قتل معاویۃ و صخر جزعت علیہا اشد الجزع و بکتہما احر البکاء و رثتہما بابلغ الرثاء ولا سیماصخر لما بلتہ من کثرۃ احسانہ وشدۃ حنانہ وقوۃ جنانہ۔

الخنساء کانت ذات حسب وجاہ و شرف و انہا کانت ذات جمال و حسن ولذا شبہوہا بالبقرۃ الوحشیۃ وا لعرب اذا تغزل فی الانثی،وارادا تعبیر عن جمالہا،شبہا بذالک،ولکن ہذا التشبیہ لتماخر لم یکن فی معرض غزل طاری و انما ہو تشبیہ صار لہا لقبا غالبا علی اسمہا و کنیتہا۔

الخنساءخطبہا درید بن الصمہ سید ہوازن و فارس جشم۔

فرددته و آثرت التزوج فی قومها و انها تزوجت من رجل من قبیلتها اسمه عبد العزی السلمی اولدها بنیها "ابا شجرة" عبدالله ۔( ۷)ثم تزوجت من رجل اسمه مر داس و کان مرداس فی رائها افضل الناس حلما ومروء ة و شجاعة فقالت:

| | |
|---|---|
| الااختار مرداساعلی الناس قاتله | ولو عاده کناته و حلائله |
| وقلن الا هل من شعفاء یناله | وقد منع الشفاءمن هو قاتله |
| وقد منع الشفاء من شد قادرا | وقد علقت هند بن عمرو و حبائله |
| فلما راه البدر اظلم کاسفا | ارن شوان برقه فمسایله |
| رنینا وما یغنی الرنین وقد اتی | بنعشک من فوق القریة حامله |
| وفضل مرد اساعلی الناس فضله | وان کل هم همه فهو فاعله |
| وان رب و ادیکره القوم هبطه | هبطت وماء منهل انت نازله |
| ترکت به لیلا طویلا ومنزلا | تعاوی علی جنب الطریق عواسله |
| و سبی کارام الصریم حویته | خلال رجال مستکین عواطله |
| فعدت علیه بعد بؤسی بانعم | وکلهم یثنی به ویواصله |
| متی ما تعادل ماجدا تعتدل به | کما عدل المیزان بالکف ثاقله |

(۸)

الخنساء ادرکت الجاهلیه والاسلام، وفدت فی قومها علی الرسول صلی الله علیه وسلم فاسلمت و انشدته فامتزلشعرها واستزاد بقوله : هیه یاخناس ! وکان فی الظن ان تنهه الخنساء بعد اسلامهاد موع الجزع علی ابیها و اخویها تعزیا بالدین و عزوفا عن سنة الجاهلیته۔الا ان وجدها علی صخر کان وراء الصبر و فوق العزاء۔فلم تزل تبکیه وترثیه حتی ابیضت عیناها من الحزن و کانت تقول کنت ابکی له فی الثار،وانا الیوم ابکی له من النار علی ان السن ولزمان والدین ما زالت بهذه الکبدالقریحة حتی اندملت۔ (۹)

وقیل حین انتشر نور الاسلام صحبت بنیها و بنی عمها من بنی سلیم وافدة الی رسول الله صلی الله علیه وسلم لتعلنوادخو لهم فی الدین،واسلمت فی عام ۸ھ، ۶۳۰ م وهی فی طلائع شیخوختها لم تقل عن الخمسین ولن تزید علی الستین ۔عندما قدمت علی النبی مع قومها بنی سلیم واعلنت اسلامها و ایمانها لعقیدة التوحید و حسن اسلامها۔(۱۰)

عن ابی وجزة عن ابیه قال حضرت الخنساء بنت عمرو السلمیة حرب القادسیة سنة ۱۶ ھ ۔۶۳۸ م و معها بنو ها اربعة رجال فذکر موعظتها لهم و تحریضهم علی القتال وعدم الفرار،فقد حرضت ابناء ها الاربعة علی الجهاد و رافقتهم مع الجیش زمن عمر بن الخطاب،وقد او صتهم: "یا بنی انکم اسلمتم وهاجرتم ختارین، والله الذی لا اله غیره انکم لبنورجل واحد،کما انکم بنو امرأة واحدة، ماخنت اباکم ولا فضحت خالکم، ولا هجنت حسبکم ولا غیرت نسبکم۔وقد تعلمون ما اعد الله للمسلمین من الثواب الجزیل فی حرب الکافرین۔واعلموا ان الدار الباقیة خیر من الدار الفانیة یقول الله:(یا ایها الذین امنوا اصبروا وصابرواو رابطوا واتقوا الله لعلکم تفلحون)(ال عمران:۲۰۰)۔فاذا اصبحتم غدا ان شاء الله سالمین،فاغدوا الی قتال عدوکم مستبصرین ،وبالله علی اعدائه مستنصرین۔ واذا رایتم الحرب قد شمرت عن ساقها واضطرمت لظی علی سیاقها وجللت نارا علی اوراقها ،فتیموا وطیسها،وجالدوا رئیسها عند احتدام خمیسها تظفروا بالغنم والکرامة فی دار الخلد والمقامة۔ فلما بلغ الیها خبر وفاة استشهادهم جمیعا،لم تجزع ولم تبک،ولم تحزن ،قالت قولتها المشهورة:"الحمدالله الذی شرفنی باستشهادهم، وارجومن ربی ان یجمعنی بهم فی مستقر رحمته" ۔ (۱۱)

شعرها:

ليس فى شواعر العرب قبل الاسلام و بعده من تفوق الخنساء فى رصانة شعرها،ورقةلفظه ،وحلاوة جرسه،ولربماضارعت فى هذه الصفات الشعراء الفحول۔ويرى النابغة وجريروبشار انها افضل من الرجال، لما فى شعرها من قوة الرجولة ورقة الانوثه۔وقد غلب فى شعرها الفخر والرثاء۔اما الفخر فلان اباها امثل قومه واخويها خيرا مضر۔واما الرثاء فلعجيعتها فيهم و طول وجدها عليهم۔والاسى يدق الشعور،ويرق العاطفة،ويفتق القريحة فى الرجل، فكيف به فى المراة؟وكانت لا تقول الاالبيتين او الثلاثة قبل مقتل اخويها،فلما قتلا فاض الدمع من عينها ،والشعر من قبلها، فاتت فى رثائها بالمعجب المعجز۔ وظلت الخنساء فى شعرها بدوية جاملية،فلم تتاثربالاسلام كثيرا ولا قليلا۔(١٢)

نموذج من شعرها:

قالت ترثى اخاها صخرا:

اعينى جودا ولا تجمدا الا تبكيان لصخر الندى؟
الا تبكيان الجرىء الجميل الا تبكبان الفتى السيدا!
رفيع العماد طويل النجا دساد عشيرته امردا
اذالقوم مدوابا يديهم الى المجد مد اليه يدا
فنال الذى فوق ايديهم من المجد ثم انتمى مصعدا
يحمله القوم ما عالهم وان كان اصغر هم مولدا
وان ذكر المجد الفيته تاز ربالمجد ثم ارتدى

وقالت ترثيه ايضا:

الا يا صخر ان ابكيت عينى فقد اضحكتنى زمنا طويلا
دفعت بك الخطوب وانت حى فمن ذا يد فع الخطب الجليلا؟

اذا قبح البكاء على قتيل رايت بكاء ک الحسن الجميلا

وقالت ترثی و تفتخر:

تغرقنی الدمر نهسا و حزا واوجعنی الدمر قرعا و غمزا
وافنی رجالی فبادوا معا فاصبح قلبی بهم مستفزا
كان لم يكونوا حتى يتقى اذا الناس فی ذاک من عزبزا
وخيل تكدس بالدارعين وتحت العجاحة يجمزن جمزا
بيض الصفاح وسمر الرماح فباليض ضربا وبالسمر و خزا
ومن ظن ممن يلاقی الحروب بالا يصاب فقد ظن عجزا
نعف و نعرف حق القری و تتخذ الحمد ذخرا و كنزا
ونلبس فی الحرب نسج الحديد وفی السلم نلبس خزا وبزا
(۱۳)

قالت فی رثاء معاوية:

الا لا اری فی الناس مثل معاويه اذا طرقت احدی الليالی بداهية
بداهية يصغی الكلاب حسيسها و تخرج من سير النجی علانية
الا لا اری كالفارس الورد فارسا اذا ما علته جزاة و علانية
وكان لزاز الحرب عند شبوبها اذا شمرت عن ساقها و هی ذاكية
وقواد خيل نحو اخری كانها سعال و عقبان عليها زبانية
بلينا وما تبلی تعار وما تری على حدث الايام الا كماهية
فاقسمت لا ينفک دمعی وعولتی عليک بحزن ما دعاالله داعية

قالت رثت بها صخر:

قذی بعينک ام بالعين عوار ام فرقت دخلت من اهلها الدار
كان عينی لذكراه اذاخطرت فيض يسيل على الخدين مدرار
تبكی لصخر هی العبری وقد ولهت ودونه من جديد الثرب استار
تبكی خناس فما تنفک ما عمرت لها عليه رنين وهی مفتار

تبکی خناس علی صخر و حق لها ادرابها الدهر ان الدهر ضرار
لا بد من میته، فی صرفها عبر والدهر فی صرفه حول واطوار
قد کان فیکم ابو عمرو یسودکم نعم المعمم للداعین نصار
صلب النحیزة وهاب اذا منعوا وفی الحروب جریء الصدر مهصار
یا صخر وراد ماء قد تماذره اهل الموارد ما فی وزده عار
مشی السبنتی الی هیجاء معضلة له سلاحان: انیاب واظفار
وماعجول علی بو تطیف به لها حنینان: اغلان و اسرار
ترتع ما رتعت،حتی اذا درکت فانما هی اقبال و ادبار
لا تسمن الدهر فی ارض وان رتعت فانما هی تحنان وتسجار
یوماباوجد منی یوم فارقنی صخر وللدهر احلاء وامرار
وان صخرا لوالینا وسیدنا وان صخرا اذا نشتو لنحار
(۱۴)

قال ابن قتیبة :”اماما ادخلت الخنساء من صفات جدیدة فی المرثیة،فمن الصعب ان نحدده،لانه لم یصل الینا شی تام من هذا النوع قبل قصائدها،الا ما ورد عن المهلهل ،وهو فی مجمله یقرب من طریقة الخنساء،ولکن مالاشک فیه هو ان من تبعها من شعراء الرثاء،وشواعره اغترفوا جمیعهم من بحرها الفیاض بفیض العاطفة البشریة“(۱۵)

وقال مصطفی صادق الرافعی:”ولا یهلونک کثرة اسماء النساء اللاتی قلن شعرا،فعمود الشعر عندهم الرثاء، ولیس لهنت الا المقاطیع والابیات القلیلة،ولم تبن منهن الا الخنساء ولیلی الا خیلیة وما شعرت الخنساء حتی کثرت مصائبها۔“(۱۶) وتوفیت بالبادیه عام ۲۴ھ

فقد اجمع اهل العلم بالشعر انه لم تکن امراة قبلها ولا

بعدها اشعر منها ۔

المراجع:۔

(۱)الاعلام الزرکلی ج ۲ص ۸۶
(۲)تاریخ آداب اللغة العربیة الزیات ص ۱۰۹
(۳)وفیات الاعیان ض ۲ ص ۳۴
(۴)الوافی فی الوفیات
(۵)تاریخ آداب اللغة العربیة الزیات ص ۱۰۹
(۶)الاعلام ج ۲ص ۸۶
(۷)دائرة المعارف الاسلامیه:الخنساء
(۸)دائرة المعارف الاسلامیه:الخنساء
(۹)تاریخ آداب اللغة العربیة ص ۱۱۰
(۱۰)الاصابة فی تمیز الصحابة لابن حجر ج ۸ص ۳۴
(۱۱)اسد الغابة جزء ا ص ۱۳۴۲
(۱۲)تاریخ آداب اللغة العربیة للزیات ص ۱۱۰
(۱۳)تاریخ آداب اللغة العربیة للزیات ص ۱۱۱
(۱۴)اسد الغابة جزء ا ص ۱۳۴۲
(۱۵)الشعر و شعراء ص ۱۹۷
(۱۶)تاریخ آداب العرب ج ۳ص ۲۱

العمید بالمدرسة الاسلامیة شمس الهدیٰ، بتنا سابقا

(٦)

# اللغة العربية وآدابها بين العلماء المعاصرين لولاية بيهار

ولاية بيهار من اهم الولاية فى الهند، لها اہمية خاصة فى نشرالعلوم والفنون ولها اہمية فى خدمات اللغة العربية ايضاً، العلماء لولاية بيهار لهم خدمات جليلة فى ارتقاء اللغة العربية و ادابها و خدماتهم العلمية و الادبية محيطة فى كل مجال العلوم و الفنون العلماء القدماء لولاية بيهار عدد هم كثير الذين بذ لوا جهودهم فى مجال العلوم و الفنون و خاصة فى اللغة العربية، منهم لعلامة محب الله البيهارى و العلامه ظهير احسن النيموى (١٨١٦-١٩٠١)الشيخ نذير حسين المحدث البيهارى ثم الدهلوى (١٨٠٥-١٩٠٢) و الشيخ شمس الحق الديانوى(١٨٥٤-١٩١٠) والشيخ بركات احمد البيهارى ثم التونكى( ١٨٨٤-١٩٥٢) والعلامه السيد سليمان الندوى( ١٩٥٤)والشيخ مسعود عالم الندوى (١٩٨١٠-١٩٥٤) والعلامة عبد الماجد الندوى لهم خدمات جليلة فى الترويج والاشاعة و الارتقاء باللغة العربية ولهم مصنفات و مئولفات عديدة فى اللغة العربية۔

واما الآن العلماء المعاصرون الذين يتعلقون بولاية بيهار هم يبذلون جهودهم ايضاً بارتقاء اللغة العربية و آدابها و خدماتهم فيها

كثيرة، لا يمكن الاحصا ء من تراجم كلهم فى هذه المقالة، و لذالك نكتفى بالذكر على خمسة رجال الذين لهم خدمات جليلة فى اللغة العربية و آدا بها ومنهم الشيخ بدرالحسن القاسمى والدكتور لقمان السلفى و الدكتور ابو سحبان روح القدس المدنى والدكتور محمد صدرالحسن الندوى المدنى و الشيخ نور عالم خليل الامينى، نذكر نبذة من تراجهم و خدماتهم فى اللغة العربية و آدابها

(١) الشيخ بدرالحسن القاسمى هو عالم شهير واديب بارع فى اللغة العربية، له خدمات جليلة فى ساحة اللغة العربية لافى ولاية بيهارفقط بل هو اديب له شهرة فى البلاد العربية ايضاً، قد تولد فى قرية ريوندها بمديرية دربنجه بولاية بيهار، تحصل التعليم الابتدائى فى وطنه، ثم سافر للحصول على التعليم العالى الى جامعة رحمانى بمونكير ثم سافر الى الجامعة العربية الشهيرة بدارا لعلوم بديوبند، واخذ العلوم والفنون من العلماء الكبار، و اجتاز الامتحان السنوى لدورالحديث بالسماة الممتازة،و بعدالفراغ من الحصول على التعليم ادى الخدمة للتدريس فى دارالعلوم بديوبند، ثم ادى الخدمة من حيث المدير للمجلة 'الداعى' اللتى تصدر من دارالعلوم بديوبند، ثم سافرا الى دولة الكويت و اما الان هو موظف فى وزارة الحج و الاوقاف بدولة الكويت و هوخطيب فى المسجد الجامع هناك ايضاً وهو يخطب با للغة العربية و الاردوية الفصيحة۔

الشيخ بدرالحسن اديب باللغة العربية و ادابها، له مصنفات عديدة فى اللغة العربية، منها حديث الروح و على هامش الاحداث و قضية فلسطين و ابعادها السياسية والادب الاسلامى المعاصر و وجه جديد للفلسفة وله مساهمة فى كتابةالمقالات العربية و بحوث العلمية باللغة العربية و مقالاته طبعت فى المجلات العلمية و

الصحف الشهيرة اللتى تصدر من المملكة العربية السعودية و من دولة الكويت وهو مدير للاخبار 'نشرة' اللتى تصدر من وزارت الاوقاف بدولة الكويت۔

الشيخ بدرالحسن يكتب اللغة العربية بلغة فصيحة و بليغة، نقدم مهنا عبارتين للنموذج من الكتاب "الكون يشهد بوجود الاله" الذى هو من افادات الامام الكبير الشيخ محمد قاسم النانوتوى عربه الشيخ المذكور باللغة العربية الفصيحة۔

'من القواعدالمعروف المسلمة عند جميع العقلاء ان كل صنعة لا بدلها من صانع، و كل حادث لا بدله من محدث، و كل حركة لا بدلها من محرک، وكل نظام لابد ان يكون له مدبر، لذلک كلما نرى بيتا او بناية عظيمة او منارة شامخة بحزم من غيرتامل و اطا لة فكر و اعمال روية بان لها صانعا، و ليس على ظهر الارض ييت ولو كان صغيرا تاسس من غير ان يكون له بناء و موسس۔ ان الساعةالحقيرة المبتذلة التى نستعلم بها الوقت لا يمكننا ان نتصور عنها ولو لبرهة انها تجهزت و تكونت من غير عمل صناعى و ميكانيكى دقيق۔

فهذا الكون الهائل الضخم، و هذاا لعالم الرحب الذى ترامت اطرافه وا تسعت جوانبه و ارجاءه ما يشتمل عليه من الاجرام العلوية والآثار السفلية الضخمة التى تدمش العقول و تثير الا عجاب كيف يمكن ان يوجد من دون ان يكون له خالق و منظم و من غير ان تكون و راء ه يد مدبرة وقوة عليا مسيطرة؟

و عبارة اخرى

اننا اذا نظرنا الى العالم و تاملنا فى احوال كل كائن من هذا العالم الكبير ظهرلنا ان احوال جميع من فى الكون منقبلة لا يبقى شىء على وجه ولا يستمر ابدا على حال و تلوح على اسرةجميع مافى

العالم آثار الخضوع و الافتقار و علائم الذلة االمقهورية، و الى اى ناحية من نواحى هذا الكون سرحنا الطرف رايئنا مظاہر الذلة اولهوان، و الحقارة و النزاله، مثلااذا ارسلنا البصر الى السماء و نظر نا الى الشمس و القمر والكواكب الاخرى السيارة التى هى فى حركة دائمة وجولة مستمرة و جد نا ها كالذرة التايهة فى هذا الكون الهائل ، اوكالريشة الطائرة فى مهب الرياح ، فتطلع و تسير و تجرى لمستفرلها، فترفع تم تزول و تغرب، و اذا خسف القمر او كسفت الشمس فينطمس نورها۔( الكون يشهد بوجود الاله)

(٢) الدكتور محمد لقمان السلفى بن بارك الله بن محمد يسين بن محمد سلامت بن عبدالعليم الصديقى تولد فى عام ١٩٤٢ فى قرية چندن باره فى مديرية جمبارن الشرقى ، قراء القرآن والكتب الابتدائية من الشيخ محمد عثمان فى قريته، ثم سافر الى مديرية فورنيه الى الشيخ محمد الياس وتعلم اللغة العربية والفارسية ثم رجع الى بيته و التحق فى مدرسة الاسلامية آزاد بقصبة دماكه وتعلم النحو والصرف والفقه، ثم سافر الى دارالعلوم احمديه السلفيه و تعلم الى المتوسطة، ثم سافر الى الجامعة الاسلامية بالمدينة المنورة فى عام ١٩٦٢ والتحق فى الكلية الشرعية و حصل على شهادة الفراغ فى عام ١٩٦٧ من الشيخ عبدالله بن باز والشيخ ناصرالدين البانى والشيخ امين المختار وغيرهم من العلماء البارعين وحصل على شهادة الماجستر من المعهدالقضاء فى فن الحديث ثم سافر الى الرياض و صار موظفا فى ادارة الدعوة للخارج۔

وله مصنفات عديدةفى اللغة العربية منها اركان الاسلام و فتح الاعلام فى استخراج الاحكام و هدى الثقلين فى احاديث الصحيحين و رحلة مريم جميلة الامريكيه من الكفر الى الاسلام۔

وھو یکتب اللغه العربیة بلغته بلیغة وھو یقدر علی اللغة العربیة قدرة تامة، نقدم مھنا عبارتین من کتابه القراء ة العربیة

"فقد شرف اللّٰہ عزوجل الغة العربیة والناطقین بھا بان انزل کتابه الکریم فیھا، فجعلھا لغة عظمیة عالیة خالدة، وقد نطق بھا سیدالانبیا ء و المرسلین، وھو افصح من نطق بھا۔ و تحدث بھا بعد البعثة لمدة ثلاث و عشرین سنة۔ و ھذہ الاحادیث حفظھا اصحابھا فی صدورھم ووعوھا کما سمعوھا من فیه ﷺ، ثم نقولھا الی تلامیذ ھم التابعین الذین نقولھا فی القراطیس والکتب، فاجتمعت من ھذہ الاحادیث ثروة عظیمة اختصت بھا امة محمدﷺ لا مثیل لھا عند قوم اخرین فی الدنیا۔و بھذہ الثروة الضخمة لھائلة التی تضمنت صنوفا من التشریعات الا لھیة و العلوم والحکم والآداب اصبحت اللغة العربیة زاخرة بثروة علمیة خالدة ، وقد جعلتھا ھذہ الثروة مع القرآن الکریم لغة عمیقة الجذور ثریة المعانی والدقائق خالدة خلود السماوات والارض لا تدانیھا لغة اخری فی عمقھا و ثرائھا و عظمتھا و بھائھا۔

و لکونھا لغة القرآن الکریم والسنة النبویة عنی اسلافنا عنایة فائقة و سعوا لاجاد تھا و اتقانھا سعیاًبلیغاًلما عرفوا فیھا من المنفعة الدینیة العظیمة: لان فھم الکتاب والسنة کما یلیق بشانھما و ادراک دقائقھما و اسرارھما لم یکن با مکانھم الا بمعرفة الغة العربیة و ادابھا۔ " ( القراء ة العربیة)

وعبارة اخری من رش البرد شرح الادب المفرد للامام البخاری رحمه ا للّٰہ

" وادب مع الخلق:۔ وھو معاملتھم علی اختلاف مراتبھم بما یلیق بھم ، فلکل مرتبة ادب، فمع الوالدین ادب، ومع العالم ادب

آخر، ومع السلطان ادب يليق بهم، ومع الاجانب ادب غير ادبه مع اصحابه و ذوى انسه، ومع الضيف ادب غير ادبه مع اهل بيته ولكل حال ادب، فالاكل ادب،و اللشرب ادب، والدخول، والخروج، والسفر، والاقامة، والنوم آداب، وللكلام آداب، وللسكوت والا ستماع آداب۔

و ادب المرء عنوان سعادته و فلاحه، و قلة ادب عنوان شقاوته و بواره، فما استجلب خير الدنياوالآخر بمثل الادب، ولا استجاب حر مانهابمثل قلته الادب۔انتهى

واذا درست الاسلام و تعمقت فيه تجد ان الله سبحانه و تعالى اقام دعوة الاسلام على اساس متين من الاخلاق الكريمة و الآداب الرفيعة و الفضائل العالية، واوضح ان هذه الاخلاق النبيلة هى اصل كل خير و مفتاح كل صلاح و فلاح و نجاح، و انه لا يمكن ان تتقدم الامة الاسلامية الا اذا تربعت على المراتب العليا من الاخلاق، وانها لم تنحدر الى مهاوى الهلاك والدمار الا عندما سائت اخلاقها و ساء ادبها مع الله تعالى و مع رسوله ﷺ ومع الخالق۔ ” (رش البرد)

(۳) الشيخ ابو سحبان روح القدس الندوى،قد تولد فى مونكير بولاية بهار الهند عام ۱۹۵۴ و قراء القرآن الكريم و مبادى العربيه و الفارسية فى وطنه و قراء مبادى النحو والصرف على والده و الشيخ روح القدس (المتوفى عام ۱۹۶۳) ثم سافر الى لكناؤ والتحق بالمعهد الثانوى لدار العلوم ندوة العلماء لكناؤ الهند ۱۹۶۴ و فضل منها على شهادتى العالمية والفضيلة عام۱۹۷۴ ثم سافر الى المدينة المنورة فى عام ۱۹۷۹ و نال الاجازة العالمية الليسانس من كلية الدعوة و اصول الدين للجامعة الاسلاميه بالمدينة المنورة ثم نال شهادة الماجستر فى الآداب اللغة العربية من جامعة لكناو عام ۱۹۹۰ م و هوكاتب فى

جريدةالرائد العربية بعنوان'درس من السنة منذ عام ١٩٨٤واما الآن هو استاذ الحديث بدارالعلوم ندوة العلماء لكناو الهند، وله مصنفات فى اللغة العربية وهو اديب شهير و عالم بارع له خدمات جليلة فى اللغة العربية و آدابها ومويكتب اللغة العربية الفصيحة، نقل نبذة من عبارته التى هى منقولة من ر وائع الاعلاق فى شرح تهذيب الاخلاق للشيخ المحدث الشريف عبد الحى فخرالدين الحسنى (١٢٨٦-١٣٤٦)

" اما بعد ! فمن جلائل نعم الله تعالى و تقدس بعثة سيدنا محمد عليه الصلاة و التسليمات، و نزول القرآن العظيم، ومدى السنة النبوية، و نشاة الرعيل الاول من الصحابة و الصحابيات، ثم من تلاهم، و قيامهم متمسكين بما امروا به قبل المامهم بكتابة الحديث و تدوينه، و ترعرع اخلافهم من جملة طبقات الامة، و خاصة من المحدثين الحفاظ الذين قضوا اعمارهم المباركة فى نشرالدين، والعمل باصوله الاساسية و التعليم و الارشاد حسب المنهج النبوى،النبعة الخالصة لمناهج الصحابة و التابعين و اتباعهم باحسان حتى بدا التدوين ثم استكمل على انواع شتى، منها:

الانتقاء للا حاديث المختصة باى باب او اكثر من باب، كما ان الحاجة الحنت على ذ لک، مثل اختيارهم من الحديث النبوى الشريف لما يرتبط بالآداب و الاخلاق، او يتصل بالزهد و الدعوة والارشاد الى معالى الامور، او يتصل بفضائل الاعمال، و فضل العلم و اهله، او يناط بالامثال، او الى غير ذ لک من الادعية والاذكار ، و بقية الابواب۔

فقد كثرت قديما و حديثا مولفاتهم القيمة، و يسرت للامة ان ينشبوا باهداب الاسوة النبوية الكريمة فى ميادين حياتهم علماو تعلما، تعليما و اعتقادا، ثم دعوة و ارشادا،وتلقينا بحيث لا تبقى لهم

حاجة للخروج فی وقت ما من نطاق القرآن الفرقان و الحدیث النبوی۔" (روائع الاعلاق)

(۴) الدکتور محمد صدرالحسن بن محمد سلیمان بن مبارک حسین ولده بقریة فاطمة جک بمدیریة مظفرپور لولایة بیهار فی عام ۱۳۷۶المصادف ۱۹۷۵وقرأ الکتب البدائیة علی اساتذه القریة ثم التحق بالمدرسة العربیة الاسلامیة بقریة دمری بمدیرة المظفرفور وقراء الکتب الدرارسیة ههنا واجتازالامتحان الفوقانیة و المولوی من هیة الامتحانیة للمدارس لولایة بہار بتنه۔ثم سافر الی مدینة لکناؤ و التحق بدار ا لعلوم ندوة العلما فی سنه ۱۹۷۴م وحصل علی شهادة العالیة فی الشرعیة عام ۱۹۷۸ م کما حصل علی شهادة الفضیلة فی الشریعة عام۱۹۸۰ ثم قام برحلة الی المملکة العربیة السعودیة والتحق بکلیة الشریعة بالجامعة الاسلامیة بالمدینة المنورة عام ۱۹۸۱ و نا ل الشهادة "البکا لوریوس" فی الشریعة عام ۱۹۸۴ و بعد رجوعه الی بلاد الهند التحق بالجامعة علیجرہ و حصل علی شهادة الماجستر فی اللغة العربیه عام ۱۹۹۵ و حصل علی شهادة الدکتورة فی اللغة العربیة عام ۱۹۹۸م

وله اسهام کبیرفی مجال التالیف فی اللغة العربیه و الاردویة حتی بلغ عدد مولفاته الی ثلاث و ثلاثین مولفا و منها الاسلام والمسلمون فی الهند والمستشرقون والاسلام والمستشرقون والفقه الاسلامی و منافذ الحضارة الاسلامیة الی اروبا قبل عصر النهضة والمدائح النبویة فی الهند وغیرہا والدکتور محمد صدرالحسن له قدرة کاملة علی النظم والنثر کلیهما، فی نثره فصاحة وبلاغة ، نقدم ههنا عبارة من مصنفاته

الحمد الله رب العالمین والصلوة والسلام علی محمد بن عبدالله

الامين وعلى آله و صحبه اجمعين و من تبعهم باحسان الى يوم الدين الذين ينفون عن الشريعة الاسلامية الغراء السمحة تحريف الغالين وانتحال المبطلين و تاويل الجاهلين ، اما بعد:

فان هذاالكتاب الذى اتقدم به الى الباحثين والمعنين بالدراسة هو حصيلة مجهودات و دراسات استغرفت ثمانى عشرة سنة۔ فقد جلت فى هذه الفترة بين مكتبات الهند الزاخرة بالكتب الاسلامية و المؤلفات العربية لعلماء الهند المفلقين والشعراء النابغين و قمت بجمع ما تناثر من المدائع النبوية التى فاضت بها قرائع الشعراء الهنود باللغة العربية على مراالدهور الممتدة من القرن الثامن من الهجرة الى القرن الخامس عشر من الهجرة فى بطون الكتب العلمية و دواوين الشعر و كتب التراجم والطبقات و صفحات المجلات والجرائد و مظانها ثم علقت عليها مع سرد تراجم الشعراء و بيان مكانتهم العلمية والادبية۔

و الد وافع التى حفزتنى على اختيار هذا الموضوع يمكن ان اوردها فيما يلى بايجار:

انه لما سنحت ببالى فكرة هذا الموضوع واجلت النظر فيما يتعلق به تبدى لى من خلال دراسات و ابحاث مسبقة للعلماء والادباء المتقد مين و المعاصرين فى هذا المجال ان الموضوع لم يزل يحتاج الى المزيد من العناية ولا تزال هناك جوانب شاغرة فى هذا الباب ۔

وجدت اثناء دراستى للموضوع ان كمية كبيرة و مقد ارا صالحا للمدائح النبوية توجد فى بطون كتب التاريخ والسير والتراجم لشعراء الهند المفلقين الذين اكتسبوا اللغة العربية دراسة و ذوقا و فاضت قريحتهم بالتغنى بمدح الرسول صلى الله عليه وسلم ولاتقل انتا جا تهم الادبية المد حية شانا و مكانة عن كلام شعراء العرب۔

ونقدم مهنا نبذة من اشعاره

ماذا على بعين خالط الارقا ام ا شترى خطراًاو اودع العشقا
فاق النبين فى الاخلاق قاطبة من جاء ه منكراقد ءزانه شرقا
نال الكرامة فالخلق يكرمه بحر الفضائل لا نقصاولا رنقا
اسرى به ربه فى دار مكرمة ولا يفوه بشرساميا نطقا
وكان يخفض للانسان رحمته ياوى اليه من الحيوان ما ابقا
انى امرولارى الا مودته وقد نجحت فلا اخشى بها غرقا
ارجو من الله يوم الحشر صحبته و اعوذ بالله من انذال ما خلقا
لا يرتدى خلدى الالباس تقى ولا اراه لباساراتقاً فتقا
قد انزل الله لطفا فى رسالته فلا اخاف به بخساًولا رهقا
اصلى عليه صلاة لاختام لها واسدى اليه سلاماًعاطراً عبقا

(المدائح النبوية فى الهند)

(۵) الشيخ نور عالم خليل الامينى ولد فى قرية رائے فور فى عام ۱۹۵۲م وقراء الكتب الابتدائية فى قريته، ثم سافر الى دارالعلوم بديوبند و المدرسة الامينة بدهلى و نال شهادة الفضيلة فى الشريعة الاسلامية و الاختصاص فى اللغة العربية وآدابها والف عدداً من الكتب فى شتى المواضيع الادبية و الاسلاميه بللغتين العربية و الاردية عدا مئات من المقالات والابحاث التى نشرتها ولا تزال الداعى و البعث الاسلامى و الرائد بالهند و مجلة الدعوة الفيصل و الحرس الوطنى و العالم الاسلامى بالمملكة العربية السعودية ومجلة دارالعلوم و مراة دارالعلوم و تعمير حياة بالهند و مجلة الحق ببا كستان و غيرما من المجلات و له مولفات عديدة بااللغة العربية منها الصحابة ومكانتهم فى الاسلام والمسلمون فى الهند و الدعوة الاسلامية بين الامس واليوم والعالم الهندى الشيخ محمد طيب ومو يعمل حالياً استاذاً للدب

العربی ورئیس تحریر مجلة الداعی العربیة الشهریة فی الجامعة الاسلامیة دارالعلوم دیوبند الهندوله قدرة کاملة علی اللغة العربیة وهو یکتب فی للغة العربیة الفصیحة، نذکر مهنا عبارة من مصنفاته۔

”وظلت الامینة تتقوی و تزداد مع الایام ، ولا سیما لانی لم ار محاولة من ایة جهة او فرد، حتی من الجهات والافراد اللصیقین به رحمه الله تعالی، تبذل من اجل القیام بتعریف جاد ولو موجز، هذا العالم الفرد الذی کان ملء السمع والبصر فی حیاته و الذی ساد الوساط الدنیة فی شبه القارة الهندیة دون منازع مدة طویلة، وکان الشعب المسلم الهندی یفتخر عن حق بشخصیة العلمیة الجامعة بین العلم والحلم، سحر البیان و عذوبة اللسان، وجمال المظهر و نزاهة المخبر، و جدابیة الظاهر و محاسن الباطن ، وشرف النسب و مجد الحسب، ولارث الدینی والتراث العلمی، والفهم السدید والذکاء العجیب، وخفة الروح و جد العمل، والحزم والحکمة، والتانی والتروی، مع البادرة الی التحرک، والا سراع الی مجال النشاط۔

رغم انه قد مضی علی و فاته نحو عشرین عاماً؟ ولکنه لا زال عالقا بالذاکرة، ماثلاً فی المخیلة، حالافی العین، مستقراً فی القلب، و کان العین تراه یغدو ویروح، وکان السمع ینصت له وهو یخطب باسلوبه القوی العجیب الممتع الفرید الذی کانه کان فیه مویدا من الرحمن، ملهما فیه من الله القادر الوهاب، وکان الناس لا یزالون ینظرون الیه نظرة متتابعة و هویمشی علی قدیمیه خارجاًمن مکتب رئاسة الجامعة الاسلامیة دارالعلوم دیوبند، معتمدا علی عکازه الجمیل، مشیة تتسم بالتواضع و وتثبت الخطو و ترکز النظر الی الامام؛ او مترددا بین المسجد القدیم للجامعة و بین بیته هی الصلوات الخمس ایام حله بدیوبند؛ او هوجالس وسط منصة من منصات

الحفلات فی مکان من امکنة هذه البلاد الواسعة، تلک المنصات التی کان لها زینة وبهاء عبر حیاته۔۔ جالس فی هدوء و کانه فی جلسة التشهید فی القعدة الاخیرة، لا یلتفت، ولا یتحرک ، ولا یتغیر فی جلسته، وانما یعلوه الوقار والسکینة، ویلف الهدوء وجهه و الوجیه المشرق الابیض المشرب بالحمرة، وکانه سابح فی تفکیر عمیق، و غارق فی الامعان فی موضوع من الموضوعات، دینی او علمی او اجتماعی او ملی کان شغله الشاغل حقا کل وقت۔

او محاط بالا وراق المنتظرة لتوقیعه، جالسا الی منضدة جمیلة۔ ینعکس علیها جمال خلقة وخلقه و تاتقه فی جوانب الحیاة کلها۔ فی مکتب رئاسة الجامعة، الذی کان یزدهی و یتالق مادام موجودا فیه، ویشرق بنورة العلمی والقه الفکری ووهجه الایمانی ولهیبه الروحانی۔ کل من لقیه هابه لوقاره العلمی، وکل من جلس الیه شعر بنعومة الاخلاق، و بر و دة الحلم، و طیب الکرم ، وفراسة المومن، و ذکاء العالم الصالح ، وفهم الفقیة الربانی، الذی ینهمک فی ملذات العلم، و یتزه فی منتجعات المعرفة والثقافة کل وقت، و یصدر فی جمیع مواقفه عن دراسة واعیة و فهم متوارث للکتاب والسنة۔

ظلت معجبا به مند ان کنت متعلما بالجامعة الاسلامیة دارالعلوم دیوبند، وقد رائته اول مرة عام۱۳۸۰(۱۹۶۰م) فی المدرسة الامدادیة بمدینة 'دربنجه' بولایة 'بیهار' عندما کنت طالبا بها، فی اوائل العقد الثانی من عمری، وقد قدمها لیخاطب حفلتها السنویة؟ ولکنها کانت رویة خاطفة۔"( الشیخ المقری محمد طیب)

العمید بالمدرسة الاسلامیة شمس الهدی ، بتنه

(۷)

# الشعرالعربی لصوفیة ولایة بیهار

اللغة العربیة هی اکثراللغات تحدثاً واحدی اکثر اللغات انتشاراًفی العالم وهی ذات اهمیةقصوی لدی المسلمین لانهاهی لغة مقدسة لغة القرآن والاحادیث اللغة العربیة هی احدی اللغات السامیة وتعرضت مثل سائراللغات الحیة وتقلبت علیٰ احوال شتی،فتنوعت الفاظها بالنحت والابدال والقلب ودخلها کثیر من الالفاظ الاعجمیةفی اعصر مختلفة۔الهند من بلادالعجم،الروابط بین الهند والعرب من قدیم الزمان ولذالک العرب اقتسبواکثیراً من الالفاظ السنسکرتیة،اللغة السنسکرتیة هی لغة من لغات الهند کما قال جرجی زیدان فی کتابه

"لاریب فی ان العرب اقتبسوا کثیراً من الالفاظ السنسکرتیة ممن کان یخالطهم من الهنود فی اثناء الاسفار للتجارة اوالحج ،لان جزیرة العرب کانت واسطة الاتصال بین الشرق والغرب،فکل تجارات الهند المحمولة الی مصرا والشام اوالمغرب کا نت تمرببلاد العرب، وکان اللعرب فی حملها اوترویجها شان، وقدعثرنا فی السنسکرتیة علی الفاظ تشبه الفاظ عر بیة تغلب ان تکون سنسکرتیة الاصل لخلوا خوات العربیة من امثالهاکقولهم "صبح" و "بهاء"فانهما فی السنکرتیة بهذاللفظ تماماً، ویدلان علی الاشراق والاضاء ة۔(۱)

وقال ایضاً

فاذارائینا لفظاً فی العربیة لم نرله شبیهاً فی العبرانیة اوالسریانیة

اوالحبشية ترجح عندنا انه دخيل فيها واكثر مايكون ذالک اسماء العقاقير اوالادوات اوالمصنوعات اوالمعادن اونحوها مما يحمل الى بلادالعرب من بلادالفرس اوالروم اوالهند اوغيرها ولم يكن للعرب معرفة به من قبل۔(۲)

الشعرالعربی موضوع هذه المقالة ولذالک نبحث شیأ عن الشعر اولاً. الشعر من الفنون الجميلة اللتی يسميها العرب الآداب الرفيعة۔ للشعر تعريفات عديدة،تختلف تبعاً لزمانها۔ وقديماً عرف الشعر منظوم القول غلب عليه لشرحهٖ بالوزن والقافيةوان كان كل علم شعراً۔ وقال ابن منظور فی لسان العرب وعرف ايضاًهو النظم الموزون وحده ما تركب تركباً متعاضداً وكان مقفی موزوناً، مقصوداً بذالک، فما خلا من هذهٖ القيود اوبعضها فلا يسمی شعراً، ولا يسمی قائله شاعراً، ولهذا ما ورد فی الكتاب اوالسنة موزوناً فليس بشعر لعدم القصد والتقضية، فكانه لم يشعر به، وعرفه الشريف الجرجانی فی اللغةالعلم و فی الاصطلاح كلام مقفی موزون علی سبيل القصد، والقيد الاخير يخرج نحو قوله تعالی"الذی انقض ظهرک، ورفعنا لک ذكرک" فانه كلام مقفی موزون، ولكن ليس بشعر لان الاتيان به موزوناً ليس علی سبيل القصد۔

وقال ابن خلدون فی تعريف الشعر "الشعر هو الكلام المبنی علی الاستعارة والاوصاف المفصل باجزاء متفقة فی الوزن والروی مستقل كل جزومنها فی غرضه و مقصده عما قبله وبعده ، الجاری علی اساليب العرب المصوصة به۔

وفی دلائل الاعجاز:اما القافية فهی لازمة فی معظم انواع الشعر القديم ولاكن الشعرالحديث اخذ يقلص فی دور القافية الخارجية فيقال له الشعر المرسل۔(۳)

المسلمون الذين دخلوا بلاد الهند كانوا اكثرهم من العلماء والصوفية وكانوا مرجعاً للخلائق بسلوكهم و مخلصين فى الدين باخلاصهم وكانوا قادرين علىٰ اللغة العربية فى الكتابة والخطابة والشعر والادب وكانت لهم ملكة فائقة علىٰ الشعر العربى، فكما انهم جادوا الشعر فى اللغة الفارسية او الاردوية كذلك قرضوا الشعر فى اللغة العربية ايضاً۔

اما ولاية بهار فعلماءہا واصفياءها لهم خدمات جليلة فى الشعر العربى۔منهم الشيخ امين الله العظيم آبادى، له القصيدة العظمى فى مديح النبیﷺ و ہذه القصيدة شهيرة ومكتوبة فى اكثر الكتب من آداب اللغة العربية، والشيخ عبدالحميد العظيم آبادى، له اشعار عربية قد ذكرها الشيخ عبدالحئ الحسنى اللكنوى فى الثقافة الاسلامية فى الهند، والشيخ حسين بن على العظيم آبادى والشيخ شمس الدين الفلواروى والشيخ وصى احمد الفلواروى احوالهم واشعارهم مذكورة فى نزہة الخواطر، والشيخ نعمة الله الفلواروى والشيخ سليمان بن داؤد الفلواروى والشيخ ابوالحسن القادرى الفلواروى والشيخ محمد سليمان الفلواروى والشيخ نورالعين القادرى الفلواروى والشيخ محمد محى الدين تمنا الفلواروى اشعارهم شهيرة وشائعة بين العلماء والصوفية۔ نذكر هنا ثلاثة رجال من الصوفية الذين ادوا الخدمة فى الدعوة والعزيمة۔ منهم الشيخ الملا جمال الدين بهجت الفلواروى والشيخ محى الدين الفلواروى والشيخ بدرالدين الفلواروى كلهم كانوا من الصوفية المشهورين بين العلماء و بين الناس، واشعارهم فى اللغة العربية موجودة ومحفوظة فى مكتبة زاوية مجيبية بفلوارى۔

۱۔ الشيخ جمال الدين بهجت الفلواروى

الشيخ جمال الدين بن القاضى علاء الدين تولد فى ۱۱۰۲ھ فى

دیانواں من مدیریة بتنا، ابوه القاضی علاء الدین کان قاضیاً فی بتنا فی عهد شاہجهاں، ثم صار قاضیاً فی فلواری و انه اخذ السکونة فی ہذه القریة الناجیة۔واما الشیخ جمال الدین قرأ الکتب الدرسیة علیٰ ملا کمال الدین السهالوی واکمل الکتب المتداولة فی ۱۱۲۰ھ وکان هو قاضیاً ایضاً فی بلدة کلکتا، ثم صار قاضیاً فی بلدة بتنا وکانت له براعة فی اللغة العربیة وملکة خاصة فی الشعرالعربی وله قصیدة فی مدیح النبیﷺ ،نذکر ھٰهنا القصیدة بتمامها۔

السلام علیک منی وصلوتی یا رسول الله ۔۔۔ لیس لی حسن العمل کیف نجاتی یا رسول
ما اقول کیف حالی حیث لایخفی علیک ۔۔۔ انت تعلم ما مضی وما سیاتی یارسول
ان فی هجرک عذاباً فی عذاب لا یطاق ۔۔۔ ان فی وصلک حیوة فی الحیوة یا رسول
انت موج اول الامواج فی بحرالقدیم ۔۔۔ لیس مثلک ممکناً فی الکائناة یارسول
انت خیرالخلق خیرالانبیاء خیرالبشر ۔۔۔ مصدر الخیرات محمود الصفاة یا رسول
انت غیث الفیض انبتنی نباتاً مثل ما ۔۔۔ انبتک الله فی حسن النباة یا رسول
فضلک بحر عمیق رحمة للعالمین ۔۔۔ کیف نتعطش علی شط الفراة یا رسول
حن من شوقک حنان الاسطوانة فی الفراق ۔۔۔ سبح للله فی کفک حصاة یارسول
غبت عن ابصارنا لکن ترانا لا نراک ۔۔۔ فضلک جار کماء فی القناة یارسول
نحن یتناهون فی تیه المعاصی حسر ۔۔۔ تأالریاح فی الفلات یارسول
غول نفسی راودتنی عن صراط المستقیم ۔۔۔ اهدنا للله یا اهدی الهدایة یا رسول
ان قلبی لا یاوی غیراصنام الهوی ۔۔۔ من هجوم الوسوسة کالسومناة یارسول
امح عنی سیأتی کلها مرالقلم ۔۔۔ مثبت فی اللوح من حبک براتی یارسول
اعطنی ماکان خیراً وقنی من کل شر ۔۔۔ استعیذ الله من شرالوشاة یارسول
منک ارجو شفقة فی کل حین دائماً ۔۔۔ کل حال فی الحیوة والمماة یارسول
احیی قلبی بالمعارف انک محی القلوب ۔۔۔ اسمک محی العظام والرفاة یارسول
سلم الله علی روحک وصلی دائماً ۔۔۔ کل ساعات النهار والبیاة یارسول(۴)

هذه القصيدة فى اللغة العربية ولكن لا نرى فيها من المحاسن الشعرية

٢۔ الشيخ محى الدين القادرى الفلواروى

الشيخ محى الدين بن الشيخ بدرالدين القادرى تولد فى ٣٠۔ذوالحجه ١٢٩٩ھ و قرأ الكتب البدائية على والده والكتب البدائية من اللغة العربية على الشيخ صميد الحق الفلواروى، وقرأ الكتب النهائية على الشيخ عبدالله الرامفورى والشيخ عبدالرحمٰن الناصرى واستفاد منه كثير من العلماء، منهم الشيخ قمرالدين الفلواروى الامير الثالث والشيخ نظام الدين والشيخ سليمان الندوى وغيرهم من العلماء الكبار ثم جلس على مسندالطريقة والارشاد لزاوية مجيبية بفلوارى، ثم اتخذه الناس الامير للامارة الشرعية لولاة بيهار واريسة۔

الشيخ القادرى كانت له ممارسة فى اللغة العربية كما كانت له ممارسة على اللغة الاردوية والفارسية وكانت له براعة على الشعر فى اللغة الاردويه والفارسية والعربية واشعاره محفوظة فى اللغات كلها فى مكتبة زاوية مجيبية بفلوارى وله مكتوب فى اللغة العربية الى الشيخ الحكيم محمد شعيب الرضوى الفلواروى و هذا المكتوب ليس بمكتوب فقط بل قصيدة ترشح منها شان المتنبى الذى هوشاعر شهير باللغة العربية، واذا رئينا هذا المكتوب تموج فى اذهاننا كثير من الاشعار التى قال لها المتنبى فى هذا البحر۔

قال المتنبى يمدح اباعلى هارون بن عبدالله الكاتب۔

امن از ديا رك فى الدجى الرقباء اذحيث كنت من الظلام ضياء

قلق المليحة وهى مسك هتكها و مسيرها فى الليل وهى ذكاء

اسفى على اسفى الذى دلهتنى عن علمه فيه على خفاء

شكيتى فقد السقام لانه قد كان لما كان لى اعضاء

انا صخرة الوادی اذامازوحمت اذ نطقت فا نی الجوزاء
شیم اللیالی ان تشکک ناقتی صدری بها افضی ام البیداء
یتلون الخریت من خوف التوی فیها کما یتلون الحرباء
لبس الثلوج بها علی مسالکی فکانها ببیاضها سوداء(۵)

فانظر الی ماذاقال الشیخ محی الدین القادری۔

یا سایقاً لظعینة حسناء وطاوی العمران والقفراء
الله حافظک جفاء المخمصة وحماک من معاطش البیداء
حین وصولک شط نهر ارول عرج منیاً وجهة الشرقاء
فیفوج عندک شد نسیم قریة فاقت علی کل القری روہاء
ہو قریة الله عاصمہا من ال اسواء والادواء والقحطاء
ہو قریة فیها مرادی نخبة ال علماء والفضلاء والکملاء
یشفی مریض الحب وہوطبیب من مثله فی زمرة الحکماء
من وجهه کالشمس تسطح نورها نرمق الیه رمقة الحرباء
الوفرة السوداء حذوجبینه فیها محاسن لیلة القمراء
من عینه قد صاد قلبی فا نها ال حسناء والشهلاء والکحلاء
تنظر بما فی مقلتی من حمرة کم ذقت منها نشوةالصهباء
ہوصاحب الکرم العمیم خصالة وعلی محاسن اسوة الآباء
ہو من یلیق لشانه الاوصاف ہو من سقاه الله کاس ولاء
ہو بضعة السادات صفوة قومه ہو غرة الامجاد بحر سخاء
ہو شمس نور سعادة ونجابة ہو شمس ارض فاق شمس سماء
فقل سلام الشوق عند جنابه من عاشق ومولع بکاء
ثم تغن بالتواجد عنده هذه القصیدة سجعة الورقاء
وقل له منی نسیتم عهد من فی هجرکم ودع منام رجاء
ترک الهجوع بهجر حبیبکم ومعیشة هنیة ورخاء

هو يكتم سقم الجوى لكن قد شهدت عليه عينه الهطلاء
ادعوله من فالق الاصباح صبحامساء غدوة وعشاء
حياه بالعيش الهنى وارغد ورقاه فوق الدرجة العلياء(۶)

استعمل المتنبى"البيداء"فى شعره وقال:

شيم الليالى ان تشكك ناقتى صدرى بها افضى ام البيداء

وقال الشيخ محى الدين القادرى:

الله حافظك جفاء المخمصة وحماك من معاطش البيداء

استعمل المتنبى"الحرباء"فى شعره وقال:

يتلون الخريت من خوف التوى فيها كما يتلون الحرباء

وقال الشيخ القادرى:

من وجهه كالشمس تسطح نورها نرمق اليه رمقة الحرباء

وقال المتنبى يمدح ابا على ہارون ويذكر من سخائه:

وكذا الكريم اذااقام ببلدة سال النضار بها وقام الماء
لم تحك نائلك السحاب وانما حمت به فصبيبها الرحضاء
لم تلق ہذا الوجه شمس نهرنا الا بوجه ليس فيه حياء

وقال الشيخ القادرى:

هو صاحب الكرم العميم خصالة وعلى محاسن اسوة الآباء
هو من يليق لشانه الاوصاف هو من سقاه الله كاس ولاء
هو بضعة السادات صفوة قومه هو غرة الامجاد بحر سخاء
هو شمس نور سعادة ونجابة هو شمس ارض فاق شمس سماء (۷)

لا نريد بالذكر الموازنة بين المتنبى و بين الشيخ القادرى ولكن نعترف ان الشيخ القادرى فى اشعاره ايضاً من المحاسن الشعرية والافكار الجليلة۔

فالحاصل ان الشيخ محى الدين القادرى فى اشعاره حلاوة

واشعاره مملوة بالمحاسن الشعرية تدل على ممارسته على اللغة العربية۔

۳۔ الشيخ بدرالدين القادرى الفلوارى

الشيخ بدرالدين بن الشيخ شرف الدين تولد فى ۲۷۔جمادى الثانية ۱۲۶۸ھ وقرأ الكتب الدراسية كلها على والده و على الشيخ محمد على حبيب نصر ثم اخذ عنه الطريقة والارشاد والسلوك وقرأالصحيح البخارى اولاً على شيخهٖ ثم على الشيخ آل محمد المحدث المهاجر المدنى، واستفاد منه كثير من العلماء والمشائخ والناس من البلاد المختلفة من الشام والعراق والحبش وغيرها من الممالك، وكانت له براعة فى العلوم والفنون و التصوف والسلوك والارشاد واستفاد الناس كثيراً من علومه و فيوضه۔

والشيخ بدر الدين القادرى كان من العلماء البارعين فى اللغة العربية، وكانت له براعة فى الشعرالعربى ايضاً۔ وله قصيدة فى مديح النبیﷺ۔ وهذه القصيدة ممتازة فى المدائح النبوية، نذكره هنا من قصيدة الشيخ القادرى۔

| | |
|---|---|
| يا رب صل على النبى محمد | محبوبک المحمود احمد حامد |
| ومحبک وحبيبک ومحبوبک | ونبيک ورسولک المتفرد |
| وصفيک ونجيک وخليلک | وامينک المعتمدعبدک احمد |
| ہادى الانام واشفق من والدى | مشفعى يوم القيامة سيدى |
| سلم عليه وآله وصحبه | متضا عفاً متضا عداً متعدد |
| عدد صلاة المومنين وسلامهم | عدد الركوع وسجود الساجد |
| قد رحنين العاشقين بعشقه | قدر دموع عيونهم ياسيدى |
| واغفر لبدرالدين عبدک رحمة | وبجاه شافعنا نبيک مرشدى |

وان الشيخ قال:

ہذا ما ناجیت ربی علی جبل راجگیر وتوسلت بنبینا البشیر النذیر وولیه المخدوم صاحب الولایة فی بیهارنفعنا الله بروحه۔

قال الشیخ:

یامن حنین القلب عنا یسمع ودواء ضیق الصدر منک یطمع
بحبیبک ونبیک ورسولک اتوجه اتوسل اتشفع
بمصطفاک ومرتضاک ومجتباک یاربنا کل البلاء ید فع
کنت بعصیانی کثیراً ہائماً تبت الیک والیک ربی ارجع
والامن من ہول القیامة کلہا نترقب یاربنا نتوقع
ہب لی حضورک مستمراً دائماً ما زلت حیاً ابصرو اسمع
صل وسلم دائماً ابداً علی محمد خیرالوری ومشفع
وآله وصحبه ومحبه وولیه والسالکین التبع
وارحم علی احوال بدرالدین یا من رحمته من ذنوبه اوسع(۸)

فالحاصل ان صوفیة ولایة بیهار لهم خدمات جلیلة فی اللغة العربیة علی نثرہا و شعرہا کلیهما واماالشعر العربی لصوفیة الولایة فیه حلاوة وفیه المحاسن الشعریة ایضاً۔

**المراجع**


(۱) تاریخ آداب اللغة العربیه ص۔۴۶
(۲) تاریخ آداب اللغة العربیه ص۔۴۴
(۳) تاریخ آداب اللغة العربیه ص۔۵۹
(۴) حضرت شاہ آیۃ اللہ جوهری حیات اور شاعری، ص۲۵
(۵) دیوان المتنبی۔ص۶
(۶) عطرالوردین۔ص۲۲
(۷) عطرالوردین۔ص۲۴
(۸) عطرالوردین۔ص۲۴


العمید للمدرسة الاسلامیة شمس الهدیٰ بتنا سابقاً

8

# پریس ریلیز

پریس ریلیز کتاب کا ایک حصہ ہے، یہ وہ پریس ریلیزیں ہیں جن کو مولانا قاسمی نے مختلف اوقات میں مختلف عنوانات پر ضرورت کے مطابق گاہے بگاہے لکھا اور یہ پریس ریلیز اخبارات میں شائع ہوئے۔ اس کتاب میں ۲۶ ر پریس ریلیز شامل ہیں، ویسے تو ان کے سیکڑوں کی تعداد میں پریس ریلیز ہیں، جو قومی، ملی اور سیاسی موضوعات پر مشتمل ہیں۔ اگر ان سبھوں کو شامل کیا جاتا، تو ایک ضخیم کتاب بن جاتی۔ ان پریس ریلیز کو پڑھ کر آپ محسوس کریں گے کہ انہوں نے کسی چیز کی پروا نہیں کی۔ مومنانہ شان کے ساتھ جس کو صحیح سمجھا برملا اظہار کر دیا۔ ورنہ عام طور سے یہ دیکھا جاتا ہے کہ لوگ تعریفی کلمات کہتے ہیں اور حق بات کہنے سے کتراتے ہیں۔ ان پریس ریلیز سے حکومت اور عوام پر بھی اچھا اثر پڑا۔ ایک نئی راہ ملی اور کچھ کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ حکومت نے ان پریس ریلیز کی روشنی میں اپنے بہت سے احکامات میں تبدیلی بھی کی۔ ان پریس ریلیز کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپس میں ایک دوسرے سے مربوط ہیں، الفاظ کا تکرار نہیں ہے، اصل موضوع کو سامنے رکھ کر بات کہی گئی ہے، جس سے سیدھے طور پر بات سمجھ میں آتی ہے، یہ تکلفات سے پاک ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے عام فہم زبان کا انتخاب کیا ہے۔ نمونہ کے لیے ایک اقتباس پیش ہے:

> ''ہندوستان سیکولر ملک ہے، ہندو مسلم، سکھ اور عیسائی اس ملک میں میل ومحبت کے ساتھ رہتے ہیں۔ پیار ومحبت، امن وشانتی اور قومی یکجہتی اس ملک کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس ملک کی گنگا جمنی تہذیب وثقافت پوری دنیا میں مشہور ہے۔ ادھر کچھ برسوں سے ملک فرقہ پرستوں کے نشانہ پر ہے اور فرقہ پرست جماعتوں کی طرف سے ملک کے امن وشانتی کو بگاڑنے کے لئے طرح طرح کی سازشیں کی جارہی ہیں، جو ملک کے لئے بے حد خطرناک ہے۔''

ان پریس ریلیز میں جہاں حکومت کے کاموں کی تعریف کی گئی ہے وہیں دوسری جانب حکومت کی کمیوں کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔ جیسے ''گاندھی جی کی جان بچانے والے بطخ میاں کو فراموش کر دیا گیا''، ''اردو پرائمری اور مڈل اسکولوں کو ختم کرنے کی منظم سازشیں''

جب آپ ان پریس ریلیز کو پڑھیں گے، تو آپ کو ملی اداروں کے احوال بھی ملیں گے، ان میں آپ ان اداروں کی کمیوں اور حکومت کی سرد مہریوں کا بھی مطالعہ کریں گے۔ ادارۂ تحقیقات عربی وفارسی اور مدرسہ اسلامیہ شمس

الہدیٰ میں کتنی جگہیں ہیں جواب تک پُرنہیں ہوئی ہیں، ان میں مسائل کا حل بھی پیش کیا گیا ہے۔ مولانا کی تحریر کا ایک خاص وصف یہ ہے کہ پہلے مسئلہ اٹھاتے ہیں، اس کے بعد حل تلاش کرتے ہیں۔ آیئے پڑھیں اور خود مشاہدہ کریں۔

(صدر عالم ندوی)

(۱)

## غیر ملکی زبانوں کا بہانہ بنا کر فارسی وعربی کو یو پی ایس سی سے خارج کرنا افسوسناک

پٹنہ (پریس ریلیز) مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی چیئرمین سوشل ایسوسی ایشن فار ایجوکیشنل اینڈ ڈیولپمنٹ نے پریس ریلیز میں کہا ہے کہ فارسی وعربی زبان کو غیر ملکی زبان کا بہانہ بنا کر یو پی ایس سی سے خارج کر دیا گیا ہے۔ جو بے حد افسوسناک ہے۔ اور ایک ترقی یافتہ ملک کے لیے شرمناک بھی ہے۔ آج گلوبلائیزیشن کا دور ہے۔ اس میں ملکی اور غیر ملکی زبان کی بات کی جارہی ہے، اس سے کوتاہ نظری ظاہر ہوتی ہے۔ فارسی اور عربی دونوں بین الاقوامی زبانیں ہیں۔ پوری دنیا میں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ اس کا رشتہ ہندوستان سے بہت گہرا ہے۔ فارسی زبان ہندوستان میں ۷۰۰ ر برسوں تک حکومت کی زبان رہی ہے۔ ہندوستان کی تہذیب وثقافت کا بڑا حصہ اس زبان میں ہے۔ جب کہ عربی زبان بھی ایک بین الاقوامی زبان ہے۔ اس کا رشتہ بھی ہندوستان سے بہت گہرا ہے۔ ملک کے مدارس، مکاتب، اسکول، کالج اور یونیورسیٹیوں میں عربی وفارسی زبان وادب کی تعلیم ہو رہی ہے۔ ایک طرف مدارس کو آگے بڑھانے کے لئے حکومت اسکیم بناتی ہے۔ اور دوسری جانب اس میں پڑھائی جانے والی فارسی اور عربی زبان کو یو پی ایس سی سے خارج کر رہی ہے۔ فارسی اور عربی کو یو پی ایس سی سے خارج کر کے حکومت مدارس ،کالج اور یونیورسیٹی سبھوں کے فارغین کے لئے مواقع کم کر رہی ہے۔ جو حد درجہ افسوسناک ہے۔ مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی نے غیر ملکی زبان کا بہانہ بنا کر عربی وفارسی کو یو پی ایس سی سے خارج کرنے پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے مرکزی حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ غیر ملکی زبان کا بہانہ بنا کہ عربی وفارسی کو یو پی ایس سی سے خارج نہ کرے۔ بلکہ عربی وفارسی کو یو پی ایس سی میں حسب سابق برقرار رکھے۔ تا کہ مدارس، کالج اور یونیورسیٹیوں کے فارغین کو ان زبانوں کے پڑھنے کا فائدہ حاصل ہو سکے۔

(۲)

## دین حنیف کا بڑا سرمایہ اردو زبان میں لہذا اردو زبان زندہ رہے گی

پٹنہ (پریس ریلیز)۔۔۔ مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی چیئرمین سوشل ایسوسی ایشن فار ایجوکیشنل اینڈ ڈیولپمنٹ نے پریس ریلیز میں کہا ہے کہ اردو ترقی یافتہ اور ترقی پذیر زبان ہے۔ اس زبان کی ترویج واشاعت میں خانقاہوں اور مدارس نے بھر پور حصہ لیا ہے اور آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ تحقیق کے مطابق اس زبان کا ابتدائی نثری وشعری

کارنامہ اسلامیات و دینیات پر مشتمل ہے۔ ادباء و دانشوران کا اس پر اتفاق ہے کہ اردو مدارس کی وجہ سے زندہ ہے۔ ان اداروں نے اردو زبان کی خاموش خدمت کی ہے۔ اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ مدارس اور مکاتب کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ ان کا ذریعہ تعلیم اردو ہے اور اسلامیات و دینیات کا بڑا سرمایہ اردو زبان میں ہے۔ بلکہ اردو زبان میں سب سے زیادہ کتابیں اسلامیات و دینیات کی ہیں۔ بہت سے دانشوران کی تحریر ایسی سامنے آتی ہے جس میں مایوسی جھلکتی ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اردو کا مستقبل تاریک ہے۔ اور اردو زبان زندہ نہیں رہے گی۔ لیکن مجھے اس کا یقین ہے کہ اردو کا دائرہ مزید وسیع ہوگا چونکہ اردو کا تعلق جہاں دیگر حلقوں سے ہے وہیں اس کا تعلق اسلامیات و دینیات سے بھی ہے۔ اور اسلامیات کا بڑا سرمایہ اردو زبان میں منتقل ہو چکا ہے۔ اس لئے اردو زبان ہمیشہ زندہ رہے گی اور اس کے لئے ترقی کا دائرہ وسیع ہوتا رہے گا۔ مایوسی سے نکل کر ہمیں ان مدارس کے نظام کو مزید مستحکم اور مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔ آج اس کی سخت ضرورت ہے کہ مدارس کے نظام کو مستحکم کیا جائے اور مکاتب کے قیام پر توجہ دی جائے۔ ہر محلہ میں صباحی و مسائی مکاتب قائم کئے جائیں اور محلے کے بچے/بچیوں کو مکاتب و مدارس میں پڑھنے کے لئے بھیجا جائے اور اس کے لئے تحریک چلائی جائے۔ ساتھ ہی جو بچے اسکول میں تعلیم حاصل کرتے ہیں ان کے گارجین اپنے بچے کو مکاتب میں اردو اور اسلامیات کی تعلیم دلائیں یا اپنے گھروں میں ان کے لئے اردو اور اسلامیات کی تعلیم کا انتظام کریں۔ تاکہ اردو زبان کا زیادہ سے زیادہ فروغ ہو سکے۔ اس حقیقت کی وضاحت کو بھی خاص اہمیت حاصل ہے کہ دنیا کے جس خطے میں بھی مسلمان رہتے ہیں، انہوں نے اپنے اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا بھی انتظام کیا ہے چونکہ مسلم تہذیب و ثقافت کا بڑا حصہ اردو زبان میں ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے اسلامیات اور دینیات کی تعلیم کا بھی انتظام کیا ہے۔ یہ تعلیم اردو زبان میں دی جاتی ہے۔ مساجد میں صباحی و مسائی مکاتب قائم کئے گئے ہیں جہاں صبح و شام بچوں کو اردو میں تعلیم دی جاتی ہے۔ امریکہ جیسے شہر میں بھی میں نے مسجدوں میں اور اسلامک سینٹر میں اردو زبان اور دینیات کی تعلیم کا مشاہدہ کیا۔ یہ اردو زبان کے لئے فال نیک ہے۔

(۳)

## اردو گنگا جمنی تہذیب کی علامت اور ہماری ثقافت کی امین

### ہم عہد کریں کہ اپنے بچے/بچیوں کو اردو کی تعلیم لازمی طور پر دیں گے

پٹنہ (پریس ریلیز) مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی چیرمین سوشل ایسوسی ایشن فار ایجوکیشنل اینڈ ڈیولپمنٹ نے پریس ریلیز میں کہا ہے کہ اردو زبان شیریں اور ترقی یافتہ زبان ہے۔ یہ گنگا جمنی تہذیب وثقافت کی امین ہے۔ اس زبان کی ترویج واشاعت اور ترقی وفروغ میں سبھوں نے حصہ لیا ہے۔ لیکن مسلمانوں نے خاص طور پر اس زبان کو اور اس کے ادبی سرمایہ کو آگے بڑھانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ مدارس، مکاتب، خانقاہوں، تنظیموں، اسکولوں اور تعلیمی اداروں نے اس زبان کی آبیاری کی ہے۔ اور اس زبان کو ترقی تک پہنچایا ہے۔ جب تک ہمارا رشتہ اردو کے ساتھ مضبوط رہا، ہمارے معاشرہ وسماج میں ہی نہیں، بلکہ ہر گھر میں اردو زبان پڑھنے، پڑھانے، بولنے اور

لکھنے کا رواج رہا۔تعلیم کی ابتداء ہی اردو مادری زبان سے کی جاتی رہی۔اردو کے ادبی سرمایہ میں بھی ہماری بھرپور حصہ داری رہی۔لیکن جیسے جیسے وقت گذرتا گیا، ہمارا رشتہ اردو زبان وادب سے کمزور ہونے لگا۔اردو مادری زبان ہمارے گھروں میں اجنبی نظر آنے لگی۔مذکورہ صورتحال میں اردو زبان وادب کی ترقی وفروغ کے لئے مسلم سماج کے ہرفرد کو اسی جذبہ کے ساتھ تیار ہونا پڑے گا کہ یہ ہماری مادری زبان ہے۔یہ گنگا جمنی تہذیب کی علامت ہے۔ اسلامیات اور دینیات کا بڑا حصہ اس زبان میں منتقل ہو چکا ہے۔اب یہ زبان ہماری ثقافت کی امین بھی ہے۔اس زبان کو پڑھے بغیر ہم، ہمارے بچے/ بچیاں اپنے دین، مذہب اور ثقافت سے پورے طور پر واقف نہیں ہو سکتے ہیں۔اس لئے مسلم سماج کے ہرفرد کو اس کا عہد لینا پڑیگا کہ ہم اپنے بچے/ بچیوں کو اردو زبان کی تعلیم لازمی طور پر دلائیں گے۔ہم اپنے بچے/ بچیوں کو جہاں بھی پڑھائیں لیکن ہم ان کے لئے اپنے گھروں میں اردو زبان پڑھنے کا انتظام کرائیں گے۔نیز بچے/ بچیوں کی تعلیم کے لئے محلہ میں صباحی ومسائی مکاتب قائم کرکے ان میں اردو زبان کی تعلیم کا انتظام کریں گے۔اسکول اور مدارس میں اردو زبان کی تعلیم کو مستحکم اور مضبوط بنائیں گے۔مسلم سماج کے ہر بچے/ بچیوں کو ان اداروں میں لازمی طور پر بھیجیں گے۔اور اردو کی تعلیم دلائیں گے۔ ہمارا یہ عہد اور اس پر عمل اردو زبان وادب کی ترقی کے لیے ایک مثالی قدم ہوگا۔

(۴)

## تعلیمی مراکز کو اکچھر آنچل سے جوڑنے کے منصوبہ پر نظر ثانی کی ضرورت

پٹنہ (پریس ریلیز) مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی چیئر مین سوشل ایسوسی ایشن فار ایجوکیشنل اینڈ ڈیولپمنٹ نے پریس ریلیز میں کہا ہے کہ سچر کمیٹی اور رنگ ناتھ مشرا کمیشن کی رپورٹ کے مطابق مسلمانوں کی حالت دلتوں سے بھی بدتر ہے۔ریاستی حکومت نے مسلم سماج کے انتہائی پسماندہ اور دلت سماج کے مہادلتوں کے درمیان تعلیم کے فروغ کے لئے تعلیمی مراکز اور اتھان کیندروں کو قائم کیا۔تاکہ سماج کے محروم طبقہ میں بھی تعلیم کی روشنی پہنچے۔حکومت کے اس اقدام کا ہر جانب سے خیر مقدم کیا گیا۔شروع میں تعلیمی مراکز کی تعداد 5500 تھی، جو اب گھٹ کر 3896 رہ گئی ہے۔خبر کے مطابق اب حکومت تعلیمی مراکز کو اکچھر آنچل منصوبہ سے جوڑنے جارہی ہے۔جس کی وجہ سے مسلم سماج میں مایوسی ہے۔وزیر تعلیم پی۔کے۔شاہی کے مطابق تعلیمی مراکز کے رضا کاروں کو 15 سال سے زیادہ عمر کی ناخواندہ لڑکیوں اور خواتین کو بھی پڑھانے کی ذمہ داری دی جائے گی۔ساتھ ہی وہ 6 سے 14 سال کے بچوں کو بھی پڑھانے کا کام کرینگے۔مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی نے کہا کہ تعلیمی مراکز کو اکچھر آنچل سے جوڑنے کی وجہ سے بچوں کی تعلیم پر برا اثر پڑیگا۔ناخواندہ خواتین کو خواندہ بنانے کا منصوبہ ایک اچھا قدم ہے۔اس کے لئے الگ سے انتظام کرنے کی ضرورت ہے۔دونوں کو ایک ساتھ جوڑ دینے سے نہ تو تعلیمی مراکز کا کام اچھی طرح چل سکے گا اور نہ ہی اکچھر آنچل کا۔اس لئے حکومت سے اپیل ہے کہ تعلیمی مراکز کو اکشر آنچل سے جوڑنے کے منصوبہ پر نظر ثانی

کرے۔اور تعلیمی مراکز کو اکھیر آنچل سے الگ رکھتے ہوئے ان کی تعداد میں اضافہ کرنے پر غور کرے۔تاکہ مسلم سماج کے انتہائی پسماندہ طبقہ میں تعلیم کی روشنی زیادہ سے زیادہ پہنچ سکے۔

(۵)

## اردوزبان وادب کی ترقی وفروغ کے لئے مدارس ومکاتب کے تعلیمی نظام کومزید مستحکم کیا جائے

پٹنہ(پریس ریلیز)مولاناابوالکلام قاسمی شمسی چیرمین سوشل ایسوسی ایشن فار ایجوکیشنل اینڈ ڈیولپمنٹ نے پریس ریلیز میں کہا ہے کہ مسلم سماج کا رشتہ مدارس ومکاتب سے بہت گہرا رہا ہے۔اور بہت حد تک آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔یہی وجہ ہے کہ مدارس ومکاتب کی تعداد لاکھوں میں ہے۔اور متوسط اور پسماندہ طبقہ کے لڑکے/لڑکیاں مدارس ومکاتب ہی میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ان مدارس ومکاتب کا ذریعۂ تعلیم ہمیشہ اردوزبان رہی ہے،اورآج بھی ہے۔اردوزبان وادب کی ترقی وفروغ کے لئے مدارس ومکاتب کے تعلیمی نظام کومزید مستحکم کرنے کی ضرورت ہے۔مسلم سماج کے ہر محلہ میں صباحی ومسائی مکاتب قائم کئے جائیں۔مساجد میں تعلیم کا انتظام کیا جائے۔مدارس میں زبان کے ساتھ ادب کی تعلیم پر بھی خصوصی توجہ دی جائے۔اور اردو زبان کے ساتھ ادب پر بھی زور دیا جائے۔تاکہ مدارس کے طلباوطالبات میں ادبی ذوق پروان چڑھ سکے۔

(۶)

## عربی وفارسی زبانوں کے معاملے میں وزیراعلیٰ سے مداخلت کی اپیل

پٹنہ(پریس ریلیز)مولاناابوالکلام قاسمی شمسی،چیئرمین سوشل ایسوسی ایشن فار ایجوکیشنل اینڈ ڈیولپمنٹ نے پریس ریلیز میں کہاہے کہ میٹرک کے نصاب اورامتحان میں عربی رفارسی کوایسے اختیاری مضمون میں ڈال دیا گیا ہے جس کا نہ توامتحان دیناضروری ہےاورنہ اس کے نمبرکومجموعی نمبرات میں شامل کیاجاتا ہے۔عربی وفارسی زبانوں کے ساتھ اس طرح کا معاملہ آرٹیکل ۲۹ کے خلاف ہے۔جب کہ ہندی مادری زبان والوں کے لئے درجہ پنجم سے اپنی تہذیبی وثقافتی زبان سنسکرت پڑھنے اور امتحان دینے کا انتظام ہے۔اور سنسکرت لازمی گروپ میں شامل ہے۔اسی طرح اردو مادری زبان والوں کے لئے بھی اپنی تہذیبی وثقافتی زبان عربی رفارسی پڑھنے اورامتحان دینے کا انتظام شروع سے چلا آرہاہےاورآج تک درسی کتابیں سرکار کے طرف سے بھی شائع ہورہی ہے۔انہوں نے مزید کہا کہ اگر بچوں کوتہذیبی وثقافتی زبان کی تعلیم نہیں دی جائے گی،تو بچے اپنی تاریخی اور ثقافتی وراثت سے دور ہوتے چلے جائیں گے۔اسی کے پیش نظر ہندی مادری زبان والے بچوں کے لئے ایسی پلاننگ بنائی گئی،کہ وہ اپنی تہذیبی وثقافتی زبان سنسکرت کا امتحان لازمی طور پر دے سکیں۔لیکن اردو مادری زبان والے بچوں کے لئے امتحان کی پلاننگ ایسی نہیں بنائی گئی،کہ وہ اپنی تہذیبی وثقافتی زبان کا امتحان لازمی طور پر دے سکیں۔یہی وجہ ہے کہ عربی اور فارسی کوایسے

اختیاری مضمون کی حیثیت سے شامل کیا گیا، جس کا نہ تو امتحان دینا ضروری ہے اور نہ اس کے نمبر کو مجموعی نمبرات میں شامل کیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے عربی وفارسی کو طلبا امتحان میں رکھنے کے لئے تیار ہی نہیں ہوتے ہیں، اور وہ عربی وفارسی زبان کو پڑھنے سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اس لئے عزت مآب وزیر اعلیٰ حکومت بہار سے اپیل ہے کہ عربی وفارسی زبان کے سلسلہ میں مداخلت کر کے اردو مادری زبان والے طلبا کے لئے عربی/ فارسی زبان کے اکزامینیشن کی پلاننگ میں شامل کرانے کے لئے مداخلت کریں۔

(۷)

## میٹرک کے نصاب تعلیم اور امتحان میں فارسی/عربی کو مجموعی نمبرات

### (Aggregate) میں شامل کرنے کے لئے حکومت سے اپیل

مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی چیئر مین سوشل ایسوسی ایشن فار ایجوکیشنل اینڈ ڈیولپمنٹ پٹنہ نے پریس ریلیز میں کہا ہے کہ فارسی اور عربی دونوں قدیم زبانیں ہیں، ان دونوں کا تعلق تہذیب وثقافت سے بہت گہرا ہے۔ ان میں سے فارسی زبان ثقافتی زبان ہے اور ہندوستان کی سرکاری زبان بھی رہی ہے۔ جبکہ عربی قرآن وحدیث کی زبان ہے۔ مسلم سماج کا ان دونوں زبانوں سے رشتہ بہت مضبوط ہے۔ ان دونوں زبانوں کی وجہ سے اردو زبان میں پختگی آتی ہے۔ اس لئے ان دونوں زبانوں کی تعلیم کا انتظام حکومت کی جانب سے کیا جاتا رہا ہے۔ سی۔ بی۔ ایس۔ ای۔ نظام تعلیم کے لاگو ہونے کے بعد فارسی/عربی کو ساتویں پیپر یعنی ایسے اختیاری مضمون کے خانہ میں رکھ دیا گیا ہے، جس کا نمبر مجموعی نمبرات (Aggregate) میں شامل نہیں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ سے طلبا فارسی/عربی کو پڑھنا نہیں چاہتے ہیں۔ اور اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے مسلم طلبا اپنی مذہبی اور ثقافتی زبان سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ ساتھ ہی اسکول، کالج اور یونیورسیٹی تک فارسی/عربی کے شعبے بند ہونے کے کگار پر ہیں۔ اس لئے اس کی سخت ضرورت ہے کہ فارسی/عربی کو ایسے خانہ میں رکھا جائے جس کا نمبر مجموعی نمبرات (Aggregate) میں شامل ہوتے ہیں۔ تاکہ طلبا ان کو پڑھنے میں دلچسپی لیں۔ گرچہ عزت مآب وزیر تعلیم نے اختیاری سبجیکٹ کی تعلیم اور امتحان کو یقینی بنانے کا اعلان کیا ہے۔ پھر بھی سنسکرت زبان کی طرح فارسی / عربی کو مجموعی نمبرات کے اندر رکھنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ اردو پڑھنے والے طلبا فارسی/عربی جو ثقافتی زبان ہے، اس کو لازمی طور پر پڑھ سکیں اور امتحان دے سکیں۔

موجودہ صورت حال میں فارسی/عربی کو مجموعی نمبرات (Aggregate) میں شامل کرنے کی آسان شکل یہ ہے کہ میٹرک کے نصاب تعلیم میں ہندی زبان کے لئے 100 نمبرات ہیں۔ یہ ہندی اور اردو دونوں زبانوں کے پڑھنے والے طلبا کو رکھنا پڑتا ہے۔ جب کہ اردو پڑھنے والے طلبا کو بھاشا پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ انہیں راشٹریہ بھاشا پڑھنے کی ضرورت ہے۔ اگر ہندی زبان کے 100 نمبر کو 50+50 کر کے 50 نمبر ہندی راشٹریہ

بھاشا کے لئے اور 50 نمبر فارسی/عربی کے لئے کر دیا جائے، تو دونوں زبانوں کا مسئلہ حل ہو جائیگا۔ اس طرح اردو پڑھنے والے طلبا کو ہندی راشٹریہ بھاشا کے ساتھ فارسی/عربی کو بھی پڑھنے کا موقع حاصل ہو جائے گا۔ اور مجموعی نمبرات 500 میں اضافہ کرنے کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اس لئے عزت مآب وزیر تعلیم اور عزت مآب وزیر اعلیٰ حکومت بہار سے خصوصی اپیل ہے کہ وہ ان دونوں زبانوں کو میٹرک کے نصاب تعلیم میں مجموعی نمبرات (Aggregate) میں شامل کرنے کے لئے مداخلت کریں۔ بالخصوص عزت مآب وزیر اعلیٰ حکومت بہار کا یہ کارنامہ نہایت ہی اہم ہے کہ انہوں نے ہر اسکول میں اردو کی تعلیم کے لئے مواقع فراہم کرا کر مسلم اقلیت کے طلبا کو نوازا ہے۔ اسی طرح فارسی/عربی زبان کو میٹرک کے نصاب تعلیم میں مجموعی نمبرات (Aggregate) میں شامل کرانا بھی مسلم اقلیت کے لئے بڑا کارنامہ ہوگا۔ اور وہ ان کارناموں کی وجہ سے ہمیشہ یاد کئے جائیں گے۔ قائدین ملک وملت اور مسلم تنظیم کے اراکین سے اپیل ہے کہ وہ اپنی سطح سے بھی اس کے لئے مزید کوشش کرنے کی زحمت کریں۔ تاکہ فارسی/عربی میٹرک کے نصاب تعلیم میں مجموعی نمبرات (Aggregate) میں شامل ہو سکے۔ اس موقع پر جناب عبدالباری صدیقی، اخترالایمان اور دیگر ممبران اسمبلی وکانسل بھی قابل مبارک باد ہیں کہ عربی/فارسی کے مسئلہ کو اسمبلی اور کانسل میں پیش کرکے اس پر بحث کیا۔ اور ثقافتی زبان کو اس کا حق دلانے کے لئے کوشش کی۔ ان حضرات سے بھی اپیل ہے کہ فارسی/عربی کو مجموعی نمبرات (Aggregate) میں شامل کرانے کے لئے مزید کوشش کرنے کی زحمت کریں۔

(۸)

## مولانا مظہر الحق عربی وفارسی یونیورسیٹی کے مسئلہ میں وزیر اعلیٰ سے مداخلت کی اپیل

پٹنہ (پریس ریلیز) مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی چیرمین سوشل ایسوسی ایشن فار ایجوکیشنل اینڈ ڈیولپمنٹ نے پریس ریلیز میں کہا ہے کہ مولانا مظہر الحق عربی وفارسی یونیورسیٹی ایک ایسی یونیورسیٹی ہے جس کے پاس نہ زمین ہے اور نہ عمارت، مستقل زمین اور عمارت نہیں ہونے کی وجہ سے یہ یونیورسیٹی دربدر ٹھوکر کھاتی رہتی ہے۔ یہ ایک بڑا المیہ ہے۔ اس یونیورسیٹی کا قیام ۱۹۹۲ء میں عمل میں آیا۔ بہت دنوں کے بعد اس کو حج بھون کے قریب ایک ایم۔ایل۔اے کوارٹر میں جگہ دی گئی۔ پھر وہاں سے اس کو منتقل کرکے چتکوہرہ پل کے قریب ایم۔ایل۔اے کوارٹر میں منتقل کیا گیا۔ پھر اس کے بعد بیلی روڈ پر ایم۔ایل۔اے کوارٹر میں اس کو جگہ دی گئی۔ ابھی پھر بیلی روڈ سے منتقل کرکے حج بھون کے قریب غلام سرور میموریل بھون میں اس یونیورسیٹی کو جگہ دی گئی ہے۔ جبکہ اس یونیورسیٹی کے ساتھ حکومت نے ویر کنور سنگھ یونیورسیٹی آرہ، بی۔این منڈل یونیورسیٹی مدھے پورہ اور جئے پرکاش یونیورسیٹی چھپرہ کو بھی قائم کیا۔ ان تینوں یونیورسیٹیوں نے اپنے اپنے مقام پر کام کرنا شروع کردیا۔ ان یونیورسیٹیوں کو حکومت نے زمین بھی فراہم کرایا۔ اور ان کے لئے عمارت بھی بنائی۔ لیکن مولانا مظہر الحق عربی وفارسی یونیورسیٹی ایسی یونیورسیٹی

ہے جس کو حکومت نے اب تک نہ تو زمین فراہم کرایا اور نہ اس کے لئے عمارت بنائی۔ اس طرح یہ یونیورسیٹی بغیر زمین اور عمارت کے چل رہی ہے۔ جو حد درجہ افسوس کی بات ہے۔ یہ یونیورسیٹی ۵ بیلی روڈ میں کام کر رہی تھی۔ اسے خالی کرانے کا فیصلہ دو سال قبل ہی ہو گیا تھا۔ لیکن دو سال کی مدت میں بھی اس کے لئے کوئی متبادل جگہ کا انتظام نہیں کیا گیا۔ جس کی وجہ سے ایک بار پھر یہ یونیورسیٹی بحرانی دور میں داخل ہو گئی ہے۔ مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی نے عزت مآب وزیر اعلیٰ نتیش کمار سے مداخلت کی اپیل کی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی درخواست کیا ہے کہ جس طرح وہ ریاست میں معیاری تعلیم کے فروغ کے لئے کوشش کر رہے ہیں۔ اس یونیورسیٹی کو بھی مستقل زمین اور عمارت فراہم کر کے مستحکم اور مضبوط کرنے پر خصوصی توجہ دیں۔ تاکہ مسلم اقلیت سے تعلق رکھنے والی یہ یونیورسیٹی بہتر کام کر سکے۔ اس کے لئے اس کی ضرورت ہے کہ وہیں پر اس یونیورسیٹی کو ضرورت کے مطابق مزید کمرے دئے جائیں۔ تاکہ کلاس کا انتظام کیا جا سکے۔ یا پھر اس یونیورسیٹی کے لئے سر سلطان پیلیس کو الاٹ کیا جائے، جس میں ضرورت کے مطابق زمین بھی ہے اور کمرے بھی۔ اس کے لئے مدارس سے تعلق رکھنے والی تمام تنظیموں نے ہمیشہ وزیر اعلیٰ سے درخواست بھی کی ہے۔

(۹)

## پلوامہ میں خودکش حملہ قابل مذمت، شہید جوانوں کو خراج عقیدت

پٹنہ (پریس ریلیز) جموں وکشمیر کے پلوامہ میں سی آر پی ایف کے قافلہ پر دہشت گردانہ حملہ قابل مذمت اور بزدلانہ عمل ہے۔ دہشت گردانہ حملہ میں ملوث قصورواروں کے خلاف سخت کارروائی کی جائے اور شناخت کر کے سخت سزا دی جائے۔ مصیبت کی گھڑی میں امن وامان، اتحاد ویکجہتی اور بھائی چارہ کو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔ مذکورہ بالا خیالات کا اظہار بہار اسٹیٹ مومن کانفرنس کے صدر مولانا ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی شمسی نے ایک پریس ریلیز میں کیا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ دہشت گردوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ہے۔ سچے انسان کا انسانیت ہی مذہب ہوتا ہے۔ انسانیت کو عزیز رکھنے والا کبھی شدت پسند نہیں ہو سکتا۔ دہشت گردی سے مذہب کا کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے۔ ہر مذہب میں انسانیت کی تعلیم ہے اور آپسی میل ومحبت پر زور دیا گیا ہے۔ کوئی مذہب آپس میں بیر اور دشمنی نہیں سکھاتا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ پلوامہ سانحہ دل کو دہلانے والا ہے۔ ہم سبھی شہید جوانوں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں اور ان کے اہل خانہ اور پسماندگان کے ساتھ ہمدردی اور تعزیت کا اظہار کرتے ہیں۔ ان جوانوں نے ملک کی حفاظت کے لئے اپنی جان دی ہے، یہ اپنی خدمات کی وجہ سے ہمیشہ یاد کئے جائیں گے۔

(۱۰)

## سیکولر طاقتوں کو مضبوط کرنا وقت کی اہم ضرورت

پٹنہ (پریس ریلیز): ووٹ کا حق ایک بڑا حق ہے۔ اس کے ذریعہ اپنے پسند کا امیدوار منتخب کر کے پارلیمنٹ میں بھیج سکتے ہیں۔ اس لئے ووٹ کے حق کا استعمال ضرور کیجئے۔ مذکورہ خیالات کا اظہار بہار اسٹیٹ مومن کانفرنس کے

صدر مولانا ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی شمسی نے کیا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ ایم پی ملک کو چلانے کے لئے ملک کے دستور کی حفاظت کرتے ہیں۔ ملک کو امن وشانتی کے لئے قانون بناتے ہیں۔ اس لئے ایم پی کا انتخاب سوچ سمجھ کر کیجئے۔ سیکولر پارٹیوں کے امیدوار کو ووٹ دے کر کامیاب بنایئے یا سیکولر امیدوار جو الیکشن جیتنے کی پوزیشن میں ہو اس کو کامیاب بنایئے۔ ووٹ کو کاٹنے کے لئے بہت سے امیدوار ذاتی فائدہ کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں، ان کو ووٹ دے کر اپنے ووٹ کو برباد نہ کیجئے، خواہ وہ اپنا قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ مسلمانوں کے ووٹ کو تقسیم کرنے کے لئے بہت سی پارٹیاں مسلمان ہی کو لالچ دے کر کھڑا کر دیتی ہیں، اس سازش سے بچیئے۔ انہوں نے مزید کہا کہ ہمارے آباء واجداد نے اس ملک کو سینچا ہے، آج ملک فرقہ پرستوں کے نشانے پر ہے، ملک میں عدم رواداری، ماب لنچنگ اور نفرت کا ماحول گرم ہے اور ملک کا آئین خطرے میں ہے۔ اس سے ملک کو بچانا ہماری ذمہ داری ہے۔ آپ خود بھی ووٹ دیجئے اور اپنے اہل وعیال جو ووٹ دینے کی عمر کو پہنچ گئے ہیں، نیز دوست احباب کو بھی تلقین کیجئے کہ وہ ووٹ ضرور دیں۔

(۱۱)

## ملک کی تاریخ میں مدارس کا اہم کردار

پٹنہ، (پریس ریلیز) مدارس نے تحریک آزادی میں اہم رول ادا کیا۔ مخلص اور سچے محبت وطن پیدا کئے جنہوں نے وطن کیلئے ہر طرح کی قربانیاں پیش کیں۔ ملک کی حفاظت کیلئے پھانسی کے پھندے خوشی سے چوم لئے، جلاوطنی کی زندگی کی بسر کی، کالا پانی کی سزائیں جھیلیں، ملک کی آزادی میں سرفروشی کے جذبہ سے حصہ لیا اور ملک کو غلامی سے نجات دلانے میں پیش پیش رہے۔ اور ملک کی گنگا جمنی تہذیب کو آگے بڑھانے میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس طرح مدارس نے تحریک آزادی سے لیکر ملک میں قومی یکجہتی اور مثالی سماج کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ مذکورہ خیالات کا اظہار مولانا ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی شمسی چیئرمین سوشل ایسوسی ایشن فار ایجوکیشنل اینڈ ڈیویلپمنٹ نے پریس ریلیز میں کیا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ مدارس میں حب الوطنی، انسانیت اور پیار ومحبت کی تعلیم دی جاتی ہے، اور مثالی شہری بنایا جاتا ہے، مدارس میں ہر طرح کی تعلیم دی جاتی ہے، یہی وجہ ہے مدارس کے طلباء وفارغین ہر میدان میں نظر آتے ہیں۔ مسلم اقلیتی سماج میں تعلیم کو آگے بڑھانے میں مدارس کا اہم رول ہے۔ ان کی وجہ سے مسلمانوں میں شرح خواندگی میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ اس طرح مدارس تعلیم کے سلسلے میں حکومت کے بے حد مددگار ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ وسیم رضوی نے وزیر اعظم اور یوپی کے وزیر اعلیٰ کو خط لکھ کر مدارس کو دہشت گرد پیدا کرنے والا ادارہ قرار دیتے ہوئے مدرسہ بورڈ کو بند کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ وسیم رضوی کا یہ خط چاپلوسی، خوشامد پر مبنی اور بے بنیاد ہے اور ان کا یہ عمل افسوسناک اور قابل مذمت ہے۔ مدارس کا دہشت گردی سے کوئی تعلق نہیں، ان کو دہشت گردی سے جوڑنا ذہنی دیوالیہ پن کا ثبوت ہے۔ یہ ذاتی مفاد اور سستی شہرت حاصل کرنے کیلئے ہے۔ نیز آپسی میل محبت کو ختم کر کے خود مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈالنا چاہتے ہیں، ان کی نیت خراب ہے، مسلمانون کے صف میں رہ کر مسلمانوں کے خلاف سازش

کرر ہے ہیں۔انہوں نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ وسیم رضوی کو انکے عہدے سے الگ کیا جائے اور مسلمانوں کو بھی چاہئے کہ وہ ایسے لوگوں کو پہچانیں جو مسلمانوں کے درمیان رہ کر ان کے خلاف سازشیں کرتے ہیں۔

(۱۲)

## آزادی بڑی نعمت اس کی حفاظت ہماری ذمہ داری

پٹنہ(پریس ریلیز) ملک کی تاریخ میں 15 اگست اور 26 جنوری کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ 15 اگست کو ملک آزاد ہوا جب کہ 26 جنوری کو جمہوریت کا نفاذ عمل میں آیا۔جمہوریت آزادی کو مضبوطی عطا کرتی ہے اور اس سے آئین کی بالادستی قائم ہوتی ہے۔اور آئین کی وجہ سے حقوق کی حفاظت ہوتی ہے۔یہ دونوں آزادی بڑی نعمت ہے،اس کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہے۔مذکورہ خیالات کا اظہار مولانا ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی شمسی صدر بہار اسٹیٹ مومن کانفرنس نے نیوعظیم آباد کالونی پٹنہ میں جھنڈا پھہرانے کے بعد اپنے خطاب میں کیا،انہوں نے مزید کہا کہ آزادی بہت سی قربانیوں سے حاصل ہوئی ہے،آزادی میں ہر طبقے کے لوگوں نے حصہ لیا۔ہمارے اکابر بھی اس میں پیش پیش رہے۔جس کی وجہ سے انہیں طرح طرح کی تکلیفوں سے دو چار ہونا پڑا،جلاوطنی کی زندگی گذارنی پڑی،پھانسی کی سزا دی گئی۔انہوں نے ہر مصیبت کو خوشی سے برداشت کیا،یہی نہیں بلکہ پھانسی کے پھندوں کو خوشی سے چوم لیا اور ملک کے لئے قربان ہو گئے۔اور انہوں نے مزید کہا کہ ملک میں آئین کو بالادستی حاصل ہے۔اس نے ہمیں حق دیا ہے کہ آئین کے مطابق آزادی کے ساتھ ملک میں زندگی گذاریں۔اور اپنے حقوق کی حفاظت کریں۔انہوں نے مزید کہا کہ مجاہدین آزادی نے اس ملک کو آزاد کرانے کے لئے بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں۔ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم آزادی کی حفاظت کریں۔اس لئے ضروری ہے کہ ہم سب مل کر آئین اور جمہوریت کی حفاظت کریں،قومی یکجہتی کو فروغ دیں،مجاہدین آزادی کے لئے سچا خراج عقیدت یہی ہے۔انہوں نے مزید کہا کہ آزادی کا لطف اسی وقت حاصل ہوگا جب ملک میں امن وسکون ہو،اس لئے ہمیں چاہئے کہ ہم سب مل کر پیار و محبت کی فضا قائم کریں،فرقہ پرستی کا مل جل کر مقابلہ کریں،قومی یکجہتی کو فروغ دیں،ملک میں امن وسکوں کا ماحول قائم کریں اور ایک مثالی شہری بن کر آزادی کی حفاظت کریں۔

(۱۳)

## تین طلاق بل دستور ہند اور شریعت کے خلاف

پٹنہ(پریس ریلیز) تین طلاق بل دستور ہند،شریعت نیز مسلم خواتین کے حقوق کے خلاف ہے۔یہ بل غیر آئینی،غیر جمہوری اور مذہبی آزادی سلب کرنے کے مترادف ہے۔مرکزی حکومت کا اس بل سے مقصد سیاسی فائدہ حاصل کرنا ہے۔مذکورہ خیالات کا اظہار مولانا ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی شمسی نے پریس ریلیز میں کیا ہے۔انہوں نے مزید

کہا کہ یہ بل دستور ہند میں دی گئی مذہبی آزادی کے متصادم ہے۔ نیز تین طلاق سے متعلق سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے کے خلاف بھی ہے، جس میں سپریم کورٹ کے ذریعہ تین طلاق کو بے اثر قرار دیا گیا ہے۔ اس بل کے ذریعہ مسلم سماج میں انتشار، برادران وطن اور مسلمانوں کے درمیان بدگمانیاں پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ صرف تین طلاق کا مسئلہ نہیں یہ تو پہلی کوشش ہے، بلکہ یہ یونیفارم سیول کوڈ کی جانب پہلا قدم ہے۔ اس بل کے ذریعہ مسلمانوں کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے۔ اس بل کے لانے کا مقصد مطلقہ خواتین کے حقوق کا تحفظ بتایا گیا ہے، لیکن جب طلاق واقع ہی نہیں ہوئی تو پھر سزا دینے کا کیا مطلب ہے۔ نیز اس بل میں یہ بھی کہا گیا ہے طلاق دینے والا مرد اپنے بیوی اور بچوں کیلئے کفالت کا ذمہ دار ہوگا۔ تو جب طلاق دینے والا جیل چلا جائے گا تو وہ کس طرح اپنے بیوی بچوں کی کفالت کر سکے گا۔ اس بل میں تین طلاق کو کریمنل ایکٹ کے دفعہ میں رکھا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے بہت سی مسائل پیدا ہوں گے۔ انھوں نے مزید کہا کہ مسلمانوں سے بڑھ کر ہندو سماج کی خواتین اپنے شوہروں کے ظلم وستم کی شکار ہیں، اس سے توجہ ہٹانے کیلئے تین طلاق کے مسئلے کو اچھالا گیا ہے۔ اس طرح یہ مسئلہ صرف تین طلاق کا نہیں بلکہ یہ بہت مسائل کا پیش خیمہ ہے۔ آئندہ پیش آنے والے مسائل کو روکنے کیلئے آپسی اتحاد بنانے کی ضرورت ہے۔

(۱۴)

## اردو بیداری مہم چلانے والے سرکاری اداروں کو خود احتسابی سے کام لینے کی ضرورت

پٹنہ (پریس ریلیز) مولانا ابوالکلام قاسمی شمسی صدر بہار اسٹیٹ مومن کانفرنس نے پریس ریلیز میں کہا ہے کہ اردو کی ترویج واشاعت اور ترقی کے لئے دو طرح کے کام ہیں۔ ایک کا تعلق عام لوگوں سے ہے۔ اور دوسرے کا تعلق سرکاری اداروں سے ہے۔ عام لوگوں کا تعلق اردو سے براہ راست ہے۔ اور اس کے لئے بہت سے عوامی ادارے کام کر رہے ہیں۔ یہ ادارے اپنے اپنے حلقوں میں ہر وقت کام کر سکتے ہیں۔ ٹیم بنا کر اردو کے لئے تحریک چلا سکتے ہیں۔ گارجین سے مل کر بچے اور بچیوں کو اسکول، مدارس اور مکاتب میں بھیجنے کی ترغیب دلا سکتے ہیں۔ اس طرح اس کام کے لئے عوام سے تعلق رکھنے والے اداروں کو آگے لانے کی ضرورت ہے۔ مدارس، مکاتب اور تعلیمی اداروں کا تعلق عوام سے زیادہ ہے۔ ان اداروں میں اردو کی تعلیم ہوتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اردو میڈیم میں ہی تعلیم دی جاتی ہے۔ دانشوروں کا خیال ہے کہ اردو زبان مدارس اور مکاتب کی وجہ سے زندہ ہے۔ اس لئے اس کی بھی ضرورت ہے کہ بنیادی طور پر یہ ادارے جو اردو کے لئے کام کر رہے ہیں ان پر زور دیا جائے اور اردو بیداری تحریک سے ان کو مزید جوڑا جائے۔ اساتذہ کو نوازا جائے، طلباء وطالبات کے پروگرام کرائے جائیں اور انعامات کے انتظامات کئے جائیں اور ان کی ہر سطح پر پذیرائی کی جائے۔ اس طرح اردو کی ترقی اور اس کے فروغ کے لئے جو ادارے موجود ہیں ان کو جوڑا جائے اور جو موجود نہیں ہیں ان کو وجود میں لانے کے لئے کام کیا جائے۔ جہاں تک سرکاری اداروں کی بات ہے تو سرکاری اداروں کا کام اس کے علاوہ اردو کو روزگار سے جوڑنا بھی ہے۔ اردو کے متعلق فلاحی اسکیموں پر غور

کرنا، اس کو آگے بڑھانے کے لئے اقدامات کرنا، اسکالرشپ کا انتظام کرنا، اردو اسکولوں کے قیام کی تجویز کو منظور کرانا، اردو کے اساتذہ اور مدارس کے اساتذہ کو آگے بڑھانا، اس طرح کے اور دوسرے کام ہیں۔ اردو کے سرکاری اداروں کو خود احتسابی سے کام لینے کی ضرورت ہے کہ انہوں نے اردو پڑھنے والے طلباء وطالبات میں سے کتنے کو روزگار سے جوڑا، کتنے کے لئے روزگار کے دروازے کھولے۔ آج اردو ٹی ای ٹی امیدوار سڑکوں پر ہیں۔ جب کہ ہزاروں اردو کے عہدے خالی ہیں، اسکولوں میں کتابیں وقت پر نہیں بھیجی جارہی ہیں، مدارس کے نصاب میں اردو کی وہی کتابیں شامل ہیں جو اسکول میں پڑھائی جاتی ہیں، لیکن اب تک مدارس میں اردو کتابوں کی فراہمی کے لئے کوئی انتظام نہیں ہوسکا، اسکولوں میں فارسی کے عہدے تھے جن پر فارسی پڑھنے والے طلباء وطالبات کو روزگار حاصل ہوتے تھے، وہ عہدے ختم کردیئے گئے۔ تقریباً 1700 اردو ملازمین کے عہدے وضع کرنے کے لئے حکومت سے سفارش کی گئی جو برسوں سے التواء میں ہیں۔ اردو ملازمین کے عہدے خالی پڑے ہیں۔ اردو کے ان سرکاری اداروں کو اس کا بھی جائزہ لینا چاہئے کہ انہوں نے اپنے اپنے محکمہ میں اردو کے کتنے نوجوانوں کی ملازمت کے لئے کام کیا اور اپنے ملازمین میں سے کتنے کو سرکاری مراعات سے جوڑنے کی کوشش کی۔ اردو کے علاوہ جہاں تک دیگر اداروں کی بات ہے تو مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں اساتذہ کے کئی عہدے خالی ہیں، ادارہ تحقیقات عربی وفارسی میں بھی بہت سے عہدے خالی ہیں، مولانا مظہرالحق عربی وفارسی یونیورسٹی جس کو عربی وفارسی زبان وادب اور مدارس کی تعلیم کے فروغ کے لئے قائم کیا گیا تھا، اس میں اب تک ایک بھی مدرسہ کو ملحق نہیں کیا گیا۔ جن سے بہت سے لوگوں کو روزگار حاصل ہوتے۔ اور معیاری تعلیم کا بھی انتظام ہوتا۔ اس طرح مسلم سرکاری اقلیتی ادارے، نیم سرکاری ادارے پریشان ہیں۔ جب کہ سرکار کی طرف سے اس کے لئے باضابطہ محکمہ بھی ہے۔ مذکورہ بالا اداروں پر کام کرنے سے صاحب صلاحیت مسلم نوجوانوں کو روزگار کے مواقع حاصل ہوتے لیکن جو اس پر کام کرنے کے ادارے ہیں اور جو حضرات اس پر کام کرسکتے ہیں وہ خاموش ہیں۔ یہ مسلم دانشوروں اور سرکاری اداروں کے لئے لمحۂ فکریہ ہے۔

(۱۵)

## این پی آر، این آرسی کیلئے پہلا زینہ
## وزیراعلیٰ سے بہار میں اس کو نہ نافذ کرنے کی اپیل

پٹنہ (پریس ریلیز) مرکزی حکومت نے ملک میں پہلے سی اے اے کو، پھر این آرسی کو پورے ملک میں نافذ کرنے کا اعلان کیا۔ چونکہ یہ دونوں ہندوستان کے آئین کی روح کے خلاف ہیں۔ ان کی بنیاد نفرتوں پر ہے اور یہ قوانین ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی سب کے لئے نقصان دہ ہیں۔ اس لئے ان کے خلاف احتجاج کا سلسلہ شروع ہوا جس میں ہر طبقہ کے لوگ شامل ہیں اور یہ ہندوستان سمیت پوری دنیا میں جاری ہے۔ اسی بیچ مرکزی حکومت نے این پی آر کے نفاذ کا بھی اعلان کردیا، اس کے خلاف بھی احتجاج شروع ہوا، چونکہ یہ این آرسی کے لئے پہلا زینہ

ہے اور اس میں این آر سی کی بہت سی باتیں شامل کردی گئی ہیں۔ مذکورہ بالا خیالات کا اظہار مولانا ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی شمسی صدر بہار اسٹیٹ مومن کانفرنس نے کیا۔ انہوں نے مزید کہا کہ این آر سی کے سلسلے میں بہار کے وزیر اعلیٰ نے اعلان کیا کہ یہ بہار میں نافذ نہیں ہوگا۔ اس اعلان سے لوگوں کو اطمینان ہوا اور ہر سطح پر اس کی ستائش کی گئی لیکن جب مرکزی حکومت نے این پی آر کا اعلان کیا تو اس میں این آر سی کی بہت سی باتیں داخل کردیں۔ اس کے خلاف بھی احتجاج جاری ہے۔ اسی درمیان نائب وزیر اعلیٰ حکومت بہار نے اس این پی آر کو نافذ کرنے کا اعلان کردیا اور یہ بھی کہا کہ یہ 15 رمئی 2020 سے بہار میں شروع ہوگا۔ اس کی وجہ سے لوگوں میں بیحد تشویش ہے۔ بہار کے وزیر اعلیٰ سیکولر شبیہ رکھتے ہیں اور وہ اس کی وجہ سے مقبول بھی ہیں، ان کی نظر میں سب برابر ہیں، خواہ ہندو ہوں یا مسلمان، سکھ ہوں یا عیسائی، یہی وجہ ہے کہ وہ سبھی مذاہب کے تہواروں میں شرکت کرتے ہیں، ایسے وقت میں ضرورت ہے کہ ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی کے ملی قائدین سیکولر پارٹیوں کے لیڈران اور دانشوروں پر مشتمل ایک وفد وزیر اعلیٰ حکومت بہار سے ملاقات کرے اور این پی آر کے نقصانات سے واقف کرائے اور ان سے اپیل کی جائے کہ بہار میں این پی آر بھی نافذ نہیں کرنے کا اعلان کیا جائے، جس طرح این آر سی کو بہار میں نہیں نافذ کرنے کا اعلان کیا گیا ہے۔ خاص طور پر وزیر اعلیٰ کے قریبی حلقہ کو اس میں آگے بڑھ کر حصہ لینے کی ضرورت ہے۔

## (۱۶)
## آپسی اتحاد ہی سیکولر پارٹیوں کے لئے بقاء کی ضمانت

**سیکولر پارٹیوں کا اتحاد صرف صدارتی انتخاب کے لئے نہیں بلکہ ہمیشہ کے لئے ضروری**

پٹنہ، (پریس ریلیز) سیکولر پارٹیوں نے صدارتی انتخاب کے معاملہ میں یکجہتی کا مظاہرہ کیا۔ خبر کے مطابق سونیا گاندھی کی ضیافت میں 17 غیر این ڈی اے پارٹیوں کے لیڈروں نے شرکت کی۔ اس ضیافت میں اپوزیشن میں اتحاد نظر آیا۔ یہ کوشش قابل ستائش ہے۔ دیر سے ہی سہی، لیکن یہ خوش آئند ہے۔ مذکورہ باتیں بہار اسٹیٹ مومن کانفرنس کے صدر مولانا ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی شمسی نے پریس ریلیز میں کہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ موجودہ وقت میں ملک میں امن وچین کا ماحول ختم ہوتا نظر آرہا ہے، ہر طرف افراتفری ہے، خاص طور پر اقلیتوں کے ساتھ جو ہو رہا ہے وہ نہایت ہی افسوسناک ہے۔ اس کا احساس سبھوں کو ہے۔ یوپی الیکشن سے پہلے ہی مومن کانفرنس نے فرقہ پرست طاقتوں سے مقابلہ کے لئے سیکولر پارٹیوں کو آپس میں اتحاد کو مضبوط کرکے الیکشن میں حصہ لینے پر زور دیا تھا۔ سیکولر پارٹیوں کے کچھ قائدین بھی اس پر زور دیتے رہے، لیکن مفاد پرستی کی سیاست کی وجہ سے یہ ممکن نہیں ہوسکا، اور پھر انجام سامنے آگیا۔ یہ انجام تازیانہ عبرت ہے۔ ابھی بھی وقت نہیں گیا ہے، سیکولر پارٹیوں کو اپنے وجود کی بقا کے لئے کوشش کی ضرورت ہے اور یہ بقا صرف آپسی اتحاد میں ہے۔ آپسی اتحاد نہ صرف ان کے لئے اور ان کی پارٹیوں کے لئے مفید ہے بلکہ ملک کی ترقی، امن وسکون اور پرامن زندگی کے لئے بھی ضروری ہے۔ انہوں نے مزید

کہا کہ جب سے مرکز میں این ڈی اے کی حکومت بنی ہے ملک میں امن وچین نہیں ہے۔ ہر طرف افراتفری اور بے اطمینانی کا ماحول ہے۔ جب کہ ملک کی ترقی اور خوشحالی کے لئے امن وسکون کا ماحول ضروری ہے۔ مرکزی حکومت کا یہ دعویٰ کہ ملک میں ترقی کی گنگا بہہ رہی ہے یہ ایک دھوکہ ہے۔ ترقی بے اطمینانی کی حالت میں ممکن ہی نہیں ہے۔ انہوں نے زور دے کر کہا کہ ملک میں زیادہ لوگ سیکولر ہیں، سیکولر طاقتوں کو مضبوط کر کے ملک میں امن وسکون کا ماحول پیدا کیا جاسکتا ہے اور سیکولر پارٹیوں کا اتحاد تو اور بھی ضروری ہے۔ اس لئے سیکولر پارٹیوں کو نہ صرف صدارتی انتخاب کے لئے بلکہ ہمیشہ کے لئے آپسی اتحاد بنانے کی ضرورت ہے تاکہ سیکولر پارٹیوں کو بھی آگے بڑھنے کا موقع ملے اور ملک میں ترقی اور امن وسکون کا ماحول بھی قائم ہو۔ مومن کانفرنس امید رکھتی ہے کہ سیکولر پارٹیوں کے قائدین آپسی اتحاد کو مزید آگے بڑھانے بڑھ چڑھ کر حصہ لیں گے۔

(۱۷)

## چمپارن ستیہ گرہ صدی تقریبات کے موقع پر

### گاندھی جی کی جان بچانے والے بطخ میاں کو فراموش کر دیا گیا

پٹنہ (پریس ریلیز) بطخ میاں نے مہاتما گاندھی کی جان بچائی۔ انگریزوں نے ان سے دودھ میں زہر ملا کر گاندھی کو پلانے کے لئے کہا، لیکن بطخ میاں نے اس سازش کا پردہ فاش کر دیا اور گاندھی جی کو اطلاع دے کر ان کی جان بچالی۔ اس نافرمانی کی وجہ سے بطخ میاں کو سلاخوں کی ہوا کھانی پڑی اور انگریزوں کے ظلم وجبر کو سہنا پڑا۔ چمپارن ستیہ گرہ صدی تقریبات کے موقع پر گاندھی جی کی جان بچانے والے بطخ میاں کو فراموش کر دیا گیا جو افسوس کی بات ہے۔ مذکورہ باتیں بہار اسٹیٹ مومن کانفرنس کے صدر مولانا ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی شمسی نے کہیں۔ انہوں نے کہا کہ بطخ میاں نے دودھ دینے سے پہلے گاندھی جی کو اس کی جانکاری دے دی کہ دودھ میں زہر گھول کر آپ کو مارنے کی سازش کی جارہی ہے۔ اس اطلاع کے بعد گاندھی جی نے دودھ کو زمین پر گرادیا۔ اس طرح ان کی جان بچ گئی۔ یہ واقعہ اپریل 1917 کا ہے۔ اس موقع پر چمپارن ستیہ گرہ صدی تقریبات کو حکومت کے ذریعہ نہایت ہی دھوم دھام سے منایا جارہا ہے۔ مجاہدین آزادی کو یاد کرنے کے لئے پورے ملک خصوصاً چمپارن میں زور وشور سے پروگراموں کا انعقاد کیا جارہا ہے۔ ایسے موقع پر گاندھی جی کی جان بچانے والے چمپارن کے باشندہ بطخ میاں کو فراموش کر دیا گیا۔ انہوں نے مزید کہا کہ بطخ میاں اجگری گاؤں، تھانہ بنجریا، موتیہاری چمپارن کے باشندہ تھے، جو انگریزوں کے خانساماں تھے۔ بطخ میاں کے وارثین آج بھی موجود ہیں جو نہایت ہی غربت کی زندگی گذار رہے ہیں۔ ان کا کوئی پرسان حال نہیں ہے۔ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ چمپارن ستیہ گرہ صدی تقریبات کے موقع پر مجاہد آزادی بطخ میاں کو بھی یاد کرے اور ان کے وارثین کو وہ زمین فراہم کرائے جو ملک کے پہلے صدر جمہوریہ ڈاکٹر راجندر پرساد نے زمین فراہم کرنے کا حکم دیا تھا۔ بہار میں عظیم اتحاد کی حکومت ہے جو انصاف کے لئے مشہور ہے، امید ہے کہ حکومت بطخ میاں

کی قربانی کو یاد کرے گی اور مجاہد آزادی کی حیثیت سے ان کے اس اہم کارنامہ کو بھی ملک کے سامنے پیش کرے گی۔
اس سے بہار کا وقار مزید بلند ہوگا۔

## (۱۸)
## اسکولوں میں وقت پر اردو کتابوں کی فراہمی کو یقینی بنایا جائے

پٹنہ ر(پریس ریلیز) موجودہ حالت میں بہار کے اکثر اسکولوں میں اردو پڑھنے والے طلبا و طالبات موجود ہیں۔اردو اساتذہ بھی کام کر رہے ہیں۔حکومت کی جانب سے درجہ اول سے درجہ ہشتم تک کی درسی کتابیں مفت میں فراہم کرائی جاتی ہیں۔اکثر ایسا ہوتا ہے کہ سیشن شروع ہونے کے بعد دیگر مضامین کی کتابیں اسکولوں میں پہنچ جاتی ہیں۔مگر اردو کی کتابیں نہیں پہنچتی ہیں۔اردو کی کتابوں کو بہت دیر سے اسکولوں میں بھیجا جاتا ہے۔جس کی وجہ سے بددل ہوکر طلبا و طالبات اردو مضمون کی جگہ دوسرے مضمون کو لینے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔اس طرح اردو پڑھنے والے طلبا و طالبات اپنی مادری زبان کی تعلیم سے محروم رہ جاتے ہیں۔یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے۔یہ باتیں بہار اسٹیٹ مومن کانفرنس کے صدر مولانا ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی شمسی نے کہیں۔انہوں نے مزید کہا کہ افسران کی ذمہ داری بنتی ہے کہ جب دیگر مضامین کی کتابیں اسکولوں میں بھیجی جاتی ہیں اور اس کے لئے بنڈل بنایا جاتا ہے تو اسی بنڈل میں اردو کی کتابوں کو بھی ڈالنے کا اہتمام کرایا جائے۔اکثر دیگر مضامین کی کتابیں پہلے بھیج دی جاتی ہیں، بعد میں اردو کی کتابیں بھیجی جاتی ہیں۔اردو کتابوں کو بھیجتے بھیجتے مہینوں گذر جاتے ہیں اور کتابیں اسکول میں نہیں پہنچ پاتی ہیں۔حکومت سے مطالبہ ہے کہ سیشن شروع ہوتے ہی اردو کتابوں کی فراہمی کو یقینی بنایا جائے۔تاکہ اردو پڑھنے والے طلبا و طالبات کو اردو کی تعلیم میں دشواری نہ پیش آئے۔ساتھ ہی اردو اساتذہ سے بھی اپیل ہے کہ اگر اردو کتابیں وقت پر اسکول میں نہیں پہنچ سکیں تو کتابوں کو منگوانے کے لئے کارروائی کریں۔اردو اداروں اور دانشوروں کی بھی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ سیشن شروع ہوتے ہی اسکولوں کا جائزہ لیں کہ اسکولوں میں اردو کی کتابیں پہنچیں یا نہیں۔اگر نہیں پہنچی ہیں تو کتابوں کو بھجوانے کے لئے کوشش کی جائے۔انہوں نے مزید کہا کہ مدارس کے نصاب میں بھی وہی اردو کی کتابیں شامل ہیں جو اسکول کے نصاب میں ہیں۔اسکول کے ساتھ مدارس میں بھی اردو کی کتابیں فراہم کرائی جائیں تاکہ ان کتابوں سے مدارس کے طلبا و طالبات بھی فائدہ حاصل کر سکیں۔اسی طرح پہلے تمام مضامین کی کتابیں اردو میں بھی شائع کرائی جاتی تھیں۔یہ سلسلہ بند ہوگیا ہے۔حکومت سے یہ بھی مطالبہ ہے کہ دیگر مضامین کی کتابوں کا بھی اردو میں ترجمہ کرایا جائے اور اسکول اور مدارس میں اردو کے علاوہ دیگر مضامین کی کتابیں بھی اردو زبان میں دستیاب کرائی جائیں۔تاکہ ثانوی زبان اردو کا زیادہ سے زیادہ فروغ ہوسکے۔

(۱۹)

## اردو پرائمری اور مڈل اسکولوں کو ختم کرنے کی منظم سازش

پٹنہ (پریس ریلیز) اردو پرائمری اور مڈل اسکولوں کو ہندی مڈل اسکولوں کے ساتھ ملانے کا نوٹیفکیشن جاری کردیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے پٹنہ شہر کے 9/اردو اسکولوں کو ہندی اسکولوں میں شامل کردیا جائے گا۔ یہ توصرف پٹنہ شہر کی بات ہے، پورے بہار میں ان کی تعداد تو اور کہیں زیادہ ہوگی۔ ان اردو اسکولوں کو ہندی اسکولوں میں شامل کردیئے جانے سے جہاں اردو یونٹ ختم ہوجائے گا وہیں اردو زبان کا بھی خسارہ ہوگا۔ مسلم طلباو طالبات اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے سے محروم ہوجائیں گے، جبکہ ابتدائی کلاسوں میں مادری زبان میں تعلیم کی اہمیت مسلّم ہے۔ مذکورہ باتیں بہار اسٹیٹ مومن کانفرنس کے صدر مولانا ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی شمسی نے پریس ریلیز میں کہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ اردو مسلمانوں کی مادری زبان ہے اور ریاست بہار کی دوسری سرکاری زبان ہے۔ سرکار کی طرف سے ہمیشہ اس کی حفاظت اور ترویج واشاعت کے لئے کوشش کی جاتی ہے، مگر اکثر ایسا دیکھنے میں آتا ہے کہ متعصب افسران اس کے ساتھ سوتیلا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ اب یہ بات کھل کر سامنے آگئی ہے۔ انہوں نے اردو اسکولوں کی شناخت کو ہی ختم کرنے کا فیصلہ لے لیا ہے۔ جہاں تک دوسرے اسکولوں کی بات ہے تو ان کو ایک دوسرے میں ملا دینے سے کوئی نقصان نہیں ہوگا، لیکن اردو اسکولوں کو ہندی اسکولوں میں ضم کردینے کی وجہ سے جہاں اردو کی شناخت ختم ہوجائے گی وہیں اردو اسکولوں کو دیئے گئے مراعات بھی ختم ہوجائیں گے۔ اور ابتدا ہی سے مسلم طلباو طالبات اپنی تہذیب وثقافت سے بھی دور ہوتے چلے جائیں گے۔ جو مسلمانوں کے لئے بے حد تشویش کی بات ہے۔ اس طرح کا اقدام آزادی کے بعد سے آج تک کسی سرکار نے نہیں کیا، لیکن موجودہ سیکولر سرکار کے دور حکومت میں اس طرح کی بات کی گئی ہے تو حد درجہ افسوسناک ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کی جائے۔ اس کی زبان اور تہذیب وثقافت کی پاسداری کی جائے۔ اردو اسکولوں کو ہندی اسکولوں میں شامل کرنے کا جو فیصلہ لیا گیا ہے اس کو فوراً واپس لیا جائے۔ ساتھ ہی دانشوروں، مسلم اداروں اور ممبران قانون سازیہ سے بھی اپیل ہے کہ وہ اس میں مداخلت کریں اور اردو اسکولوں کو ہندی اسکولوں میں شامل کرنے کے فیصلہ کو رد کرانے کے لئے آگے آئیں۔ تاکہ اردو اسکولوں کا وجود برقرار رہ سکے۔

(۲۰)

## اساتذہ تقرری میں اردو، فارسی اور عربی کو نظر انداز کرنا افسوسناک

پٹنہ (پریس ریلیز): معیاری تعلیم کے لئے تعلیمی اداروں میں اساتذہ کی تقرری ضروری ہے۔ بہار اسکول ایکزامنیشن بورڈ کی جانب سے سیکنڈری اور 2+ اسکولوں میں اساتذہ تقرری کے لئے شیڈول جاری کیا گیا ہے، یہ اقدام قابل ستائش ہے، اس سے جہاں معیاری تعلیم کا خواب پورا ہوگا، وہیں بے روزگار تعلیم یافتہ لوگوں کو روزگار بھی

فراہم ہوگا۔ مذکورہ باتیں بہار اسٹیٹ مومن کانفرنس کے صدر مولانا ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی شمسی نے پریس ریلیز میں کہی ہیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ اردو مادری زبان ہے تو فارسی وعربی ثقافتی زبانیں ہیں، فارسی اور عربی سے اردو زبان وادب میں پختگی پیدا ہوتی ہے۔ تقریباً ہر ایک اسکول میں بڑی تعداد میں طلبہ وطالبات ایسے ہیں جن کی مادری زبان اردو ہے۔ وہ مادری زبان کی حیثیت سے اردو زبان پڑھتے ہیں اور اختیاری مضمون میں فارسی یا عربی رکھتے ہیں۔ اسکولوں کے نصاب تعلیم میں بھی یہ دونوں زبانیں شامل ہیں، ان کی تعلیم کے لئے فارسی اور عربی کی کتابیں بھی طبع ہوتی ہیں، بورڈ امتحانات میں امیدوار اختیاری مضمون کی حیثیت سے فارسی رعربی کو رکھتے بھی ہیں۔ ان کے نمبرات بھی مارکشیٹ میں درج کئے جاتے ہیں۔ ماضی میں فارسی اور عربی کے اساتذہ کی تقرری بھی ہوتی رہی ہے۔ بہت سے اسکولوں میں فارسی وعربی کے اساتذہ کے عہدے منظور بھی ہیں اور فارسی اور عربی کی تعلیم بھی ہوتی ہے۔ ابھی بھی اسکولوں میں فارسی رعربی کے اساتذہ کام کررہے ہیں۔ ایک عرصہ سے عربی رفارسی کے اساتذہ کی تقرری نہیں ہوئی، جس کی وجہ سے فارسی رعربی کے درس وتدریس میں دشواری پیش آرہی ہے۔ اردو مادری زبان کے طلبہ وطالبات فارسی وعربی ثقافتی زبان کی تعلیم سے محروم ہیں، جبکہ ان دونوں زبانوں کے ساتھ حکومت نے ہمیشہ سنسکرت کی طرح معاملہ کیا ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ حکومت نے عربی وفارسی زبان کے فروغ کے لئے باضابطہ مولانا مظہر الحق عربی وفارسی یونیورسٹی قائم کیا ہے۔ بہت سی یونیورسٹیوں میں فارسی اور عربی کے شعبے ہیں، بہت سے کالج میں ان دونوں زبانوں کی تعلیم ہوتی ہے۔ جب سیکنڈری اور +2 اسکولوں میں ان زبانوں کی تعلیم نہیں ہوگی تو فارسی وعربی کے شعبوں میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ وطالبات نہیں ملیں گے اور یہ دونوں شعبے بند ہوجائیں گے۔ یہ ایک بڑا المیہ ہوگا۔ اس لئے ان دونوں زبانوں کی تعلیم اسکولوں میں ضروری ہے اور تعلیم کے لئے اساتذہ کی تقرری بھی ضروری ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ اس بات کی امید کی جارہی تھی کہ اسکولوں میں تقرری کا کام شروع ہوگا تو فارسی وعربی کے اساتذہ بھی بحال کئے جائیں گے لیکن اسکولوں میں اساتذہ تقرری کا جو شیڈول شائع ہوا ہے، اس میں عربی وفارسی کے اساتذہ کو کوئی جگہ نہیں دی گئی ہے۔ یہی نہیں بلکہ +2 اسکولوں میں اردو اساتذہ کا بھی شیڈول میں ذکر نہیں ہے۔ اس طرح اسکولوں میں تقرری کے موقع پر اردو، فارسی اور عربی کو نظرانداز کیا جانا افسوسناک ہے۔ نیز ان کے فارغین میں مایوسی پائی جارہی ہے۔ انہوں نے حکومت سے اور خاص طور سے وزیر اعلیٰ سے اپیل کیا ہے کہ اس جانب خصوصی توجہ دی جائے اور سیکنڈری اور +2 اسکولوں میں فارسی، عربی اور اردو کے اساتذہ کی تقرری کو یقینی بنایا جائے۔

# سوانحی خاکہ

شمیم اختر ندوی

| نام | ابوالکلام |
|---|---|
| مقام پیدائش | دوگھرا، وایا جالے، ضلع دربھنگہ، بہار |
| تاریخ پیدائش | ۲۵/اکتوبر ۱۹۵۱ء |
| پتہ | نیو عظیم آباد کالونی، ویسٹ، سیکٹر ڈی، پوسٹ مہندرو، پٹنہ، بہار |
| رابطہ: | 6200300845, 9835059987 |

## تعلیمی لیاقت

| نمبر شمار | بورڈ/یونیورسیٹی | امتحان کا نام | سال |
|---|---|---|---|
| ۱ | بہار مدرسہ ایگزامینشن/ایجوکیشن بورڈ، پٹنہ | وسطانیہ | ۱۹۶۳ء |
| ۲ | بہار مدرسہ ایگزامینشن/ایجوکیشن بورڈ، پٹنہ | فوقانیہ | ۱۹۶۵ء |
| ۳ | بہار مدرسہ ایگزامینشن/ایجوکیشن بورڈ، پٹنہ | مولوی | ۱۹۶۷ء |
| ۴ | بہار مدرسہ ایگزامینشن/ایجوکیشن بورڈ، پٹنہ | عالم | ۱۹۶۹ء |
| ۵ | بہار مدرسہ ایگزامینشن/ایجوکیشن بورڈ، پٹنہ | فاضل (فارسی) | ۱۹۷۱ء |
| ۶ | بہار مدرسہ ایگزامینشن/ایجوکیشن بورڈ، پٹنہ | فاضل (اردو) | ۱۹۷۲ء |
| ۷ | بہار مدرسہ ایگزامینشن/ایجوکیشن بورڈ، پٹنہ | فاضل (حدیث) | ۱۹۷۶ء |
| ۸ | بہار مدرسہ ایگزامینشن/ایجوکیشن بورڈ، پٹنہ | فاضل (عربی ادب) | ۱۹۸۲ء |
| ۹ | بہار سکنڈری ایگزامینشن بورڈ، پٹنہ | میٹرک (پرائیویٹ) | ۱۹۷۰ء |
| ۱۰ | مگدھ یونیورسیٹی بودھ گیا، پٹنہ | انٹرمیڈیٹ (پرائیویٹ) | ۱۹۷۷ء |
| ۱۱ | بہار یونیورسیٹی مظفر پور | بی۔اے اردو (پرائیویٹ) | ۱۹۸۱ء |

| ۱۲ | بہار یونیورسیٹی مظفر پور | ایم۔اے اردو (پرائیویٹ) | ۱۹۸۸ء |
|---|---|---|---|
| ۱۳ | علی گڑھ مسلم یونیورسیٹی، علی گڑھ | ایم۔اے عربی (پرائیویٹ) | ۱۹۹۴ء |
| ۱۴ | بہار اسکول اگزامینشن بورڈ، پٹنہ | ٹیچر ٹریننگ | ۱۹۷۴ء |
| ۱۵ | نالندہ اوپن یونیورسٹی، پٹنہ | پی ایچ ڈی | ۲۰۱۵ء |

## تدریسی خدمات

| ۱ | مدرسہ اسلامیہ رامپور، سیتامڑھی | ۱۹۷۱ء-۱۹۷۲ء |
|---|---|---|
| ۲ | مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ (جونیئر سیکشن) | ۱۹۷۶ء-۱۹۸۱ء |
| ۳ | مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ (سینئر سیکشن) | ۱۹۸۱-۱۹۹۶ |
| ۴ | مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ (پرنسپل) | ۱۹۹۷ء |
| ۵ | مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ (پرنسپل) | ۱۹۹۹ء-۲۰۱۱ء |
| ۵ | مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ (پرنسپل، سبکدوش) | اکتوبر ۲۰۱۱ء |

## تصانیف (عربی)

۱ الترجمۃ العربیۃ ۱۹۸۹ء

۲ تسہیل النحو ۱۹۸۹ء

۳ القرأۃ الجدیدۃ (المبادی) ۱۹۹۰ء

۴ القرأۃ الجدیدۃ (الجزء الاول) //

۵ القرأۃ الجدیدۃ (الجزء الثانی) //

۶ القرأۃ الجدیدۃ (الجزء الثالث) //

۷ القرأۃ الجدیدۃ (الجزء الرابع) //

## تصانیف (اردو)

۱ مکالمہ سنت وبدعت ۱۹۷۴ء

| | | |
|---|---|---|
| ۲ | تفسیر سورۂ فاتحہ | ۱۹۷۴ء |
| ۳ | حضرت اویس قرنیؓ | ۱۹۷۵ء |
| ۴ | ہماری نمازیں | ۱۹۷۵ء |
| ۵ | جدید اردو قواعد (حصہ دوم) | ۱۹۸۵ء |
| ۶ | جدید اردو قواعد (حصہ سوم) | ۱۹۸۶ء |
| ۷ | ہمارا دین | ۱۹۸۶ء |
| ۸ | تذکرہ علمائے بہار (جلد اول) | ۱۹۹۴ء |
| ۹ | تین ہفتے امریکہ میں | ۲۰۰۴ء |
| ۱۰ | تذکرہ علمائے بہار (جلد دوم) | ۲۰۰۶ء |
| ۱۱ | قدیم اردو زبان کی تاریخ (نالندہ اوپن یونیورسٹی کے نصاب میں شامل) | ۲۰۱۰ء |
| ۱۲ | اسلامک اسٹڈیز (ہندی) (نالندہ اوپن یونیورسٹی، پٹنہ کے نصاب میں شامل) | ۲۰۱۰ء |
| ۱۳ | مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ سے مولانا مظہر الحق عربی وفارسی یونیورسٹی تک | ۲۰۱۱ء |
| ۱۴ | تحریک آزادی میں علمائے کرام کا حصہ | ۲۰۱۳ء |
| ۱۵ | مشاہیر بہار کے خطوط (زیر طبع) | |
| ۱۶ | تذکرہ علمائے بہار (جلد سوم زیر طبع) | |
| ۱۷ | بہار کی اردو شاعری میں علماء کا حصہ (زیر طبع) | |
| ۱۸ | مقالات قاسمی (جلد اول زیر طبع) | |

## اعزازات

| | | |
|---|---|---|
| ۱ | بہار ریاستی کانگریس کمیٹی، پٹنہ کی جانب سے (تعلیمی خدمات) | ۱۹۹۵ء |
| ۲ | بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ پٹنہ (تعلیمی خدمات) | ۱۹۹۷ء |
| ۳ | نیشنل ایوارڈ آف ٹیچرس (حکومت ہند) | ۱۹۹۹ء |
| ۴ | بہار اردو اکادمی، پٹنہ (تذکرہ علمائے بہار کی تصنیف پر) | ۲۰۰۶ء |
| ۵ | حسن عسکری ایوارڈ بہار اردو اکادمی، پٹنہ | ۲۰۱۴ء |

# عہدہ اور مناصب

۱ چیئرمین: سوشل ایسوسی ایجوکیشنل اینڈ ڈیولپمنٹ، پٹنہ
۲ چیئرمین: اسلامک پیس فاؤنڈیشن آف انڈیا
۳ ممبر بہار اسٹیٹ مدرسہ ایجوکیشن بورڈ پٹنہ ۱۹۹۷ تا ۲۰۱۱ء
۴ ممبر بہار اردو مشاورتی کمیٹی پٹنہ (سابق)
۵ ممبر گورنمنٹ اردو لائبریری، پٹنہ (سابق)
۶ رکن مجلس شوریٰ امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ
۷ مدعو خصوصی آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ

# اسفار

۱ امریکہ
۲ ایران
۳ سعودی عربیہ (زیارت حرمین شریفین)

# افراد خانہ

(۱) والد : عبدالستار
(۲) والدہ : قریشہ خاتون
(۳) اہلیہ : سروری خاتون

**لڑکے**

(۱) مولانا محمد کلیم اختر (سینئر استاد مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ
(۲) انجینئر محمد جسیم اختر (پرائیویٹ کمپنی بنگلور)

**لڑکیاں**

(۱) ڈاکٹر طلعت ناہید (گورنمنٹ ٹیچر)
(۲) فرحت ناہید (گورنمنٹ ٹیچر)
(۳) نصرت ناہید (گورنمنٹ ٹیچر)

☆سب ایڈیٹر روزنامہ انقلاب پٹنہ

# Maulana Dr. Abul Kalam Qasmi Shamsi
## Nuqoosh -o- Taassurat
**By: Md Sadr-e- Alam Nadvi**

مولانا ابوالکلام قاسمی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ وہ قاسمی اور شمسی دونوں ہیں، اس کا مطلب ہے کہ وہ قدیم صالح اور جدید نافع کے جامع ہیں۔ سیر و تواریخ ان کا پسندیدہ موضوع اور مدارس کے احوال و کوائف، اس کے عروج و زوال کی داستان، نصاب تعلیم اور نظام مدارس ان کے فکر کا محور رہا ہے۔ سرکاری بندشوں کے باوجود ان کا قلم حق کی ترویج میں لگا رہا ہے۔ یہ اپنے میں بڑی بات ہے۔

مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی

مولانا قاسمی نے تذکرہ علمائے بہار کے ذریعہ بہار کے علماء کی خدمات کو متعارف کرانے کی ایک طرح ڈالی ہے اور اس انداز سے مختلف شعبۂ ہائے حیات سے تعلق رکھنے والی شخصیات پر مواد فراہم کرنے کی نئی راہ ہموار ہوئی ہے۔

مولانا صغیر احمد رحمانی

"تسہیل القرآن" نامی آسان ترجمۂ قرآن میرے سامنے ہے، یہ مولانا ابوالکلام شمسی صاحب کا شاہ کار ہے، قرآن پاک کی خدمت کسی شکل میں بھی ہو، دربار نبوی ﷺ سے اس کی افضلیت اور عظمت کی سند پہلے ہی سے ملی ہوئی ہے، "خیرکم من تعلم القرآن وعلمه"۔
لاکھوں کروڑوں عوام کی تعلیم کا اس سے بہتر ذریعہ کیا ہوگا کہ قرآن پاک کے حقائق سے فضاؤں کو معطر اور دلوں کو منور کر دیا جائے۔

مولانا سلمان الحسینی الندوی

تذکرہ علمائے بہار کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں کچھ ایسے علمائے دین ہیں جو باضابطہ شاعر و ادیب بھی رہے ہیں، ان میں بعض تو صاحب دیوان شاعر ہیں۔ خصوصاً پھلواری شریف کے علماء اور بزرگوں میں اچھی خاصی تعداد شعرائے کرام کی ہے جن کے مسودات آج بھی وہاں کی لائبریریوں میں محفوظ ہیں۔

پروفیسر وہاب اشرفی

حضرت مولانا شمسی صاحب بہار کے ان علماء میں سے ہیں جن کی طویل ترین خدمات ہیں اور اپنی طویل جدوجہد سے بڑے مفید امور سر انجام دیئے ہیں۔ تدریسی میدان میں جہاں ان کی لمبی خدمات ہیں وہیں علمی تالیفات بھی ناقابل فراموش ہیں۔ اپنی عالمانہ، فاضلانہ و علمی لیاقتوں کی بنیاد پر اگر کسی شخص کو "ابوالکلام" کہا جا سکتا ہے تو مولانا محترم کا نام بھی اس سانچے میں فٹ ہوتا ہے۔ مولانا نے بہار میں متعدد علمی و ادبی پروگراموں کو از خود آرگنائز بھی کیا اور دیگر اداروں کے پروگراموں میں بھی اپنے وجود سے روشنی عطا کی۔ تاریخ، لسانیات و درسیات نیز مذہبی، معاشرتی اور دیگر امور و مسائل پر بہت کچھ لکھا اور جہاں جہاں ضرورت آن پڑی اپنی جرأتمندانہ آراء سے کبھی پیچھے نہیں ہٹے۔ ان کی اصابت رائے کا کئی حضرات تذکرہ فرما چکے ہیں۔

صفی اختر، نئی دہلی